کیمبرج او کیمبرج

سفرنامہ

سائرہ ہاشمی

میری زندگی کے سفر کی ابتداء یقیناً ماں کی گود سے جھولے تک ہوئی ہوگی جہاں میری امی نے مجھے لٹا کر لوریاں سنائی ہوں گی۔ پھر میں نے قدم قدم چلنا سیکھا۔ میرے قدم سکول، کالج اور یونیورسٹی کو طے کرتے ایک دروازے پر آرکے، دروازہ میرے رفیق زندگی نے کھولا۔ گھر اکیلا تھا۔ میں اور وہ اکیلے تھے۔ ہماری آوازوں کے سوائے دوسری کوئی آواز نہ تھی۔ ہمیں اتنی ہی آوازیں اچھی لگتی تھیں۔ لیکن میرے کان کسی تیسرے آواز کے منتظر رہنے لگے اور پھر میرا گھر آوازوں سے بھر گیا۔ اماں۔ امی۔ ماں۔ میرے کئی نام تھے۔ جو سب کے سب مجھے اچھے لگتے تھے۔ سارا جہان میرے گھر میں سمٹ آیا اور میرے تنے کندھوں نے زندگی اور خوشیوں کے سارے بوجھ خوشی خوشی اٹھا لئے۔ زندگی ذمہ داریوں کا نام ہے۔ یہاں کچھ حاصل کرنے کیلئے کچھ کھونا پڑتا ہے تو کیا ہے۔ میرے دن رات ان سب کے نام معنون تھے۔ میں نے زندگی کے کڑوے میٹھے گھونٹ تحمل کے کٹورے میں ڈال کر آہستہ آہستہ اپنے اندر اتار لئے۔ کتنی شیرینی ہے۔ کتنی تلخی ہے۔ زندگی کا بہاؤ کبھی تیز کبھی دھیما مجھے اپنے ساتھ بہائے لئے جا رہا تھا۔ وقت کی باگیں میرے شوہر کے ہاتھ میں تھیں۔

زندگی گزارنا اور آگے بڑھنا کتنا جان جوکھوں کا کام ہے، میں اپنے شوہر کو زندگی گزارنے کے لئے دن رات محنت کرتے دیکھکر سوچنے لگتی۔ لیکن ہم سب ساتھ ہی تو ہیں۔ میں نے ان کا بوجھ کم کرنے کیلیئے کچھ بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھانا چاہا۔ وہ ناراض ہونے لگے۔ ''میں موجود ہوں''۔ میری بات ان کی مردانگی کے خلاف تھی۔

''مجھے بازار گوشت لینے جانا ہے''۔ میں اطلاع دیتی۔ ''نہیں میں دفتر سے آتے ہوئے لے آؤں گا''۔ میں بچوں کو سکول سے لے آؤں گی''۔ ''میں دفتر سے آتے ہوئے لے آؤں گا۔ تمہیں وقت ہوگی''۔...... آپ مجھے کیا سمجھتے ہیں۔ میں بہت کچھ کرسکتی ہوں اور میں نے اپنے آپ کو بہت کچھ ثابت کرنے کے لئے بہت سی چھوٹی چھوٹی ذمہ داریاں زبردستی اپنے ذمہ لے لیں۔ آخر مجھے بھی تو کچھ کرنا چاہیے۔ ان ذمہ داریوں کو نبھاتے، ایک دوسرے کا بوجھ ہٹاتے بہت سے برس بیت گئے۔

میں وقت کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چلتی رہی........... اپنے آپ کو ثابت کرنے کیلیئے افسانے لکھتی رہی۔ سوسائٹی میں حصہ بنانے کیلیئے دعوتوں میں شریک ہوتی رہی...... لوگوں سے ملتی رہی۔

میرے بچے بڑے ہوگئے...... انہیں میں تھکی ہوئی نظر آنے لگی۔ انہیں میرے دکھوں، سکھوں کا خیال رہنے لگا۔۔۔۔

امی آپ کو گھر کی ذمہ داریوں سے چند دن کی چھٹی چاہیے۔ آپ برسوں سے کسی لمبی تفریح پر نہیں گئیں۔ میری بڑی بیٹی سعدیہ کو میرے چہرے پر نہ جانے کیسی تھکاوٹ نظر آتی رہتی تھی کہ وہ اکثر اس بات کا قصہ لے بیٹھتی۔ وہ ڈاکٹر ہونے کی وجہ سے ہر چہرے کو صحت کے پیمانے میں ماپتی ہے۔

میرے شوہر نے کہا...... ہاں لندن جانا چاہتی ہو تو بندوبست کو دیتا ہوں۔ میرا بڑا بیٹا ہمایوں خان امتحان سے فارغ ہوا تھا۔

پاسپورٹ کی تجدید کے لیے میڈ نے پہلا پاسپورٹ نکال کر انہیں دیا...... لیکن اس سے پہلے کہ ہمارے جانے کا بندوبست ہوتا، ہمایوں خان کو ٹائی فائیڈ نے آدبوچا اور ہم دونوں جانے سے رہ گئے۔

کیا یورپ میرے خوابوں میں تھا۔ میں نے سوچا...... یورپ کی سیاحت تو زندگی کا سب سے بڑا سپنا ہے، لیکن سپنے دیکھنے کی عمر تو کب کی بیت گئی....... اور پھر میری ہتھیلی پر باہر کے سفر کی لکیر ہی نہیں۔ بہت برس پہلے بھی ایسا ہوا تھا کہ ہم اپنے دو بچوں کے ساتھ لندن کے لیے روانہ ہونے والے تھے۔ ٹکٹ آچکے تھے۔ لیکن ہماری بیٹی سعدیہ بیمار ہوگئی اور ہمیں ٹکٹیں کینسل کروانا پڑیں.........

اور ای کے بھی ایسا ہی ہوا..........

آپ کو باہر ضرور جانا چاہئے۔ مہینوں میرے گھر میں بچے اسی بات پر اصرار کرتے رہے۔ آخر میں کیونکر جا سکتی ہوں۔ اور وہ بھی اکیلی.......... امی، میں آپ کے ساتھ چلوں گا.......... میرا چھوٹا بیٹا فیصل فیصلہ کن انداز میں بولا .... نہیں بھئی۔ تم بہت چھوٹے ہو.......... میں بالکل چھوٹا نہیں۔ آپ کو کس نے کہہ دیا۔ اور اس نے وہ سارے نقشے میرے سامنے کھول دیئے جس میں دنیا کے ایک حصہ میں لندن کا شہر بھی تھا.........

اس کی معلومات مجھ سے زیادہ تھیں۔ اور اس نے نقشے کی لائنوں پر انگلی رکھتے ہوئے مجھے بہت کچھ سمجھا دیا.........

میرا بیٹا فیصل اپنی منوانے کے لیے ضد کا حربہ استعمال کرتا ہے۔ آپ اس سے ایک بات کہہ کر مکر

نہیں سکتے۔ وہ آپ کو اپنا کیا ہوا وعدہ بھولنے نہیں دے گا.......... اور پھر آپ زچ ہو کر وہ سب کچھ کریں گے جس سے آپ اس کی تکرار ختم کر سکیں۔

اس نے لندن جا کر وہاں سے خریدنے کے لیے اپنی پسندیدہ چیزوں کی ایک لمبی فہرست مرتب کر ڈالی۔ پاسپورٹ کے لیے باپ سے کہہ کر فارم منگوا لئے۔ اور انہیں خود ہی پُر کر کے ان کے منشی کے ہاتھ تھما دیئے.......... اور پھر انتظار کے کرب میں مبتلا ہو گیا.......... وہ میری ایک بھی سننے کو تیار نہیں تھا۔ میرے پاس نہ جانے کے ہزاروں جواز تھے۔ گھر داری۔ دوسرے بچوں کی دیکھ بھال۔ نوکروں کی غیر ذمہ داری.......... نہیں میں کسی صورت نہیں جا سکتی تھی .... گرمیوں کی چھٹیاں گزر گئیں.......... اور اس کا سکول کھل گیا.......... میرے گھر میں ایک بار لندن جانے کا تذکرہ پھر ہونے لگا۔ میری بڑی بہن جمیلہ ہاشمی کی اکلوتی بیٹی عائشہ لندن جا کر اس مکان کو جو آپی کے نام تھا اپنے نام منتقل کروانا چاہتی تھی.......... اس کا جانا ضروری تھا.......... چلو میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ ہاں.......... ہاں.......... میں آپ کی بہترین گائیڈ بنوں گی.......... مجھ سے زیادہ وہاں کے راستوں کو کوئی نہیں جانتا۔

ایک بار پھر پاسپورٹ بنوانے کا چکر چلا.......... ٹریولنگ ایجنسی سے ٹکٹ خریدے گئے۔ اوہ.......... ابھی تو ویزا لگوانے کے لیے اسلام آباد جانا ہو گا.......... سفر سے پہلے سفر .... کتنے ہی دن تو ہو گئے ہیں مختلف جگہوں پر چکر لگاتے۔ کبھی یہاں.......... کبھی وہاں.......... پورا دن امریکن ایکسپریس کے دفتر لائن میں کھڑے گزارنا پڑا۔ روپوں کو ڈالرز میں بدلوانے کے لیے۔ ہمارے روپے کی قیمت اتنی کم تھی.......... انیس ہزار پانچ سو روپے کے ایک ہزار پچاس ڈالر.......... میں حیران کھڑی ان ڈالرز کو گن رہی تھی.......... اور پھر لندن جا کر ان کو پونڈز میں بدلوانا ہو گا.......... سو ڈالر کے پچیس پونڈ.......... یعنی کل

پانچ سو پچاس کے قریب پونڈ.........آخر کیوں.........میں نے اس سے پہلے کبھی اپنے روپے کو اتنا کم قیمت نہیں سمجھا تھا۔

ہماری تجارت۔ ہماری امپورٹ ایکسپورٹ پالیسی۔ ہمارے خزانے میں رکھا سونا۔ اور پھر ہماری تجارتی مصنوعات کی بیرون ملک ضرورت.........آپ کا سارا بھرم تو دوسروں کے لیے فائدہ مند ہونے میں ہے۔ لوگ آپ کی کتنی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ اور ہمارے روپے کی قیمت کی کمی اس بات کی غماز ہے کہ ہمارے پاس دوسروں کو دینے کے لیے وہ مصنوعات وافر مقدار میں نہیں جن کے بغیر ان کا دم گھٹنے لگے اور وہ اپاہج ہو کر رہ جائیں.........ان کی بقا کے لیے اس بات کا خریدنا ضروری ہو.........ہمیں اسلحہ خریدنے کے لے اپنے بے شما روپے خرچ کرنے پڑتے ہیں.........اس کے بغیر ہماری بقا خطرے میں پڑ جائے گی.........ہمیں تیار مصنوعات منگوانی پڑتی ہیں کیونکہ ہمارے پاس خام مال کی کمی ہے۔ ہمیں موٹریں، گاڑیاں خریدنی پڑتی ہیں اس لیے کہ ہم بھی عیش بھری زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ ہماری خواتین کو خوبصورت نظر آنے کے لے میک اپ کی مصنوعات کی اشد ضرورت ہے اور گھریلو بجٹ کا ایک خاصا حصہ فیشن کی بھینٹ چڑھانا پڑتا ہے۔ اور پھر وطن سے محبت کی کمی کا بھی حصہ ہے۔ اپنے وطن کو مضبوط بنانے کے لیے زندگی کی خواہشات کو محدود کرنا پڑتا ہے۔ اور ہماری سب کی خواہشات لامحدود ہیں۔

دولت کے اظہار کے اور بھی کئی طریقے ہیں جو ہمارے خزانے پر بوجھ ہیں۔

روپے کی کم قیمت کے اور بھی کئی اسباب ہیں جو میرے ذہن میں آ نہیں رہے۔ سنا ہے لندن مہنگا ہے۔ تو.........میں باہر آتے ہوئے فکر مند ہو رہی ہوں۔

امی آپ کتنی خوش قسمت ہیں۔ میرا بیٹا فیصل بار بار افسوس زدہ لہجے میں کہتا۔ میں کہتی۔ واقعی

بیٹے میں خوش قسمت ہوں۔ میرا ایک تمہارے جیسا پیارا پیارا بیٹا ہے......... لیکن وہ اس بات کو میری خوش قسمتی گردانے کو تیار نہیں تھا۔ اس کے نزدیک لندن جانے والے تمام لوگ خوش نصیب ہوتے ہیں اور میں بھی ان میں سے ایک تھی۔ لیکن میرے نزدیک یہ صرف میری خوش نصیبیوں میں سے ایک خوش نصیبی ہو سکی تھی۔ میں کسی خواب زدہ دوشیزہ یا کسی رومانی فلم دیکھ کر ہیروئن کی محبت میں مبتلا نوجوانوں کی طرح لندن کے خواب دیکھ دیکھ کر دن نہیں گزار رہی تھی ۔ میرے لیے لاہور پاکستان کا سب سے خوبصورت شہر ہے اور میرا اپنا گھر دنیا کا سب سے بہترین سکھ کا گہوارہ......... لیکن یہ سب کچھ جاننے کے لیے ایک عمر کا سفر طے کرنا پڑتا ہے اور وہ میں طے کر چکی تھی......... میرے پاس سوچ اور تجربوں کی کسوٹی تھی جس پر اپنے وطن کے سوائے کوئی زمین بھی پوری نہیں اترتی......... اور پھر میں ماڈرن کہلوانے کے لیے اپنی ذات یا اپنے وطن کو تج کر دنیا کے دوسرے ملکوں اور ازموں کی تعریف میں رطب اللسان ہو کر جدید کہلوانے میں کبھی فخر محسوس نہیں کر سکتی تھی......... میں نے اکثر دیکھا تھا کہ غیر ملکی ادیب جب بھی پاکستان آتے، کچھ مشہور اور غیر مشہور ادیب ان کے سامنے بیٹھ کر پاکستان کی برائیوں کی ایک لمبی فہرست سنانے لگتے ہیں......... وہ سارے گلے شکوے جو ہمیں اپنوں سے تھے، گنوا کر اپنے بین الاقوامی ہونے کا ثبوت مہیا کرتے ہیں......... وہ لامحدود وسعتوں کو اپنا کر اپنا امیج وسیع کرنے کی تگ و دو میں یہ بھول جاتے ہیں کہ ان کا اپنا کردار ان تمام برائیوں کی عکاسی کرتا ہے جن کے وہ شاکی ہیں......... آئینہ دکھاتے ہوئے اپنے رخِ مبارک پر ایک نظر ڈالنے میں آخر کیا قباحت ہے۔ لیکن صاحب فیشن کے مطابق نہ چلا جائے تو لوگ آپ کو جدید زمانے کا انسان نہیں مانیں گے......... اخلاقیات پر عمل کرنے سے آپ کی جدیدیت پر بڑی کاری ضرب پڑتی ہے۔ اور اسلام کا نام لیتے پر تو آپ کہیں کے بھی نہیں رہتے.........

یہ دنیا تو آپ کے ہاتھوں سے گئی ہی گئی۔ اور دوسری دنیا کی آپ کو کیا خبر......... قیامت آئے گی بھی یا نہیں۔ آپ اپنی آنکھوں دیکھی تو بیان کرنے سے رہے......... بس زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کے لیے ضروری ہے کہ کبھی لوگوں کی موجودگی میں نماز نہ پڑھیں۔ اور پھر نماز آپ کا اور خدا کا ذاتی معاملہ ہے اور ذاتی باتوں کی تشہیر سے لوگ آپ کو میاں مٹھو کا خطاب بھی دے سکتے ہیں......... ظاہر ہے آپ ایسا کہلوانا پسند نہیں کریں گے۔ اور لندن پلٹ کہلوانا آپ کے تعلیم یافتہ ہونے کے لیے سند کے طور پر ہمیشہ کام آئے گا۔ اور اس سند کے لیے اگر خدا مجھے لندن بھیجنے کو تیار ہے تو میں کیونکر انکاری ہو سکتی ہوں۔

''میں بڑی خوش نصیب ہوں''......... میرا بیٹا دن میں ایک بار ضرور یہ جملہ دہراتا تھا۔ اب میں خاموش تھی......... مجھے اس کے نہ جانے کا افسوس تھا۔ لیکن وہ میرے جاتے پر ہر روز اصرار کرتا۔

اسلام آباد ہم جمیل جالبی صاحب کے گھر رہے......... میری خوش نصیبی کی مہر لگنی باقی تھی۔

.........O.........

اسلام آباد میرے خوابوں کا شہر ہے۔ خوبصورت اور پرسکون، سرسبز و شاداب......... ہنگامہ اور شور و شغب سے پاک......... اور پھر میں وہاں پر اہل قلم کانفرنس پر جا کر اپنی اور اس کی باہمی دوستی اور پسندیدگی کی تجدید کرتی آئی تھی......... اگر میں وہاں رہنے لگتی تو عذرا اصغر کی طرح اس کے سرد مہر رویہ اور غیر دوستانہ طرز کی شکایت کرتے لگتی۔ اپنے دل نہ لگنے کا شکوہ کرتی اور لاہور، لاہور کرتی اور اکثر لاہور آنے کے لیے بہاتے تراشتی......... میری اور اسلام کی دوستی شائد اس لیے نبھتی آ رہی ہے کہ ہم اکثر دیر بعد ملتے ہیں اور مسلسل موجودگی سے ایک دوسرے کو بور نہیں کرتے......... دوستی نبھانے کا یہی بہترین نسخہ ہے جو میں نے

اپنے سب دوستوں کے ساتھ اختیار کر رکھا ہے۔

زیادہ پاس رہنے سے بولنا پڑتا ہے اور زیادہ بولنے سے فضول باتیں کرنی پڑتی ہیں اور ان فضول باتوں کی زد میں آپ کا دوست بھی آجاتا ہے.......... اور پھر.......... اس لیے میں کبھی کسی کے گلے کا ہار نہیں ہوتی۔ اور نہ کسی کو ہونے دیتی ہوں..........

اسلام آباد کم خنک رہے.......... اور اس جملے کے ساتھ میں نے اپنے آپ کو صیغہ واحد حاضر اور زمانہ حال میں داخل کرتی ہوں.......... وہ ساری باتیں جو میں اپنے حوالے سے کروں.......... میرے لیے بے حد زندہ ہو جاتی ہیں۔ میں واقعات اور کردار کے بطون میں اتر کر ان کی شخصیت کو اپنے اور طاری کر لیتی ہوں۔ ان کی ساری کربناکیاں میری آنکھوں میں آنسو بن جاتی ہیں اور ان کی مسافرت میرے تلووں میں چھالے ڈال دیتی ہے.......... اور پھر وہ مجھ میں اور میں ان میں بسنے لگتے ہیں.......... میں اپنی حساسیت کو ان کی کردار نگاری میں میگنی فائنگ گلاس کے طور پر استعمال کرتی ہوں۔ یہ وہ سفر ہے جو میں پچھلے پندرہ برسوں سے کر رہی ہوں۔ یہ سفر میرے بطون کا سفر ہے.......... میں نے کرداروں کی زندگی میں جھانکا .... ان کی سوئی کی چبھن نے مجھے تلوار کے گھاؤ کے شدت کو سمجھنے کا شعور دیا.......... اور پھر زندگی کا سفر .... جو کبھی نا مختتم تشنگی بن جاتا ہے اور کبھی مسرت کا ایک گھونٹ.......... اس مسرت کے گھونٹ کے لیے کرب کے ہزاروں جانگسل صحراؤں اور بیابانوں کو پار کرنا پڑتا ہے۔ اور صحرا صرف ویرانوں ہی میں نہیں ہوتے۔ صحرا تو انسان کے اندر بھی پھیلتے بڑھتے اور اس کی شخصیت کو نگل جاتے ہیں اور ادیب کہانیاں لکھتے شاعر مرثیہ کہتے ہیں.......... اور ادب کا دائرہ ہر عہد میں پھیلتا.......... اور سکڑتا رہتا ہے۔

اور آج کا عہد سفرنامہ کے حوالہ سے بھی پہچانا جاتا ہے.......... سفرنامہ جو نئی نئی زمینوں کی

خوشبو نئے پانیوں کی نمی اور نئے انسانوں کے چہروں کی عکاسی کرتا ہے۔

میں ہرگز سفرنامہ نہیں لکھوں گی ۔ کیونکہ بھلا میں سفرنامہ کی ایک پوری روایت میں کیا اضافہ کر پاؤں گی.......... عورت اور مرد کی نسبت سے سفرنامہ کی جہتوں میں بھی فرق آ جاتا ہے .... اور جبکہ آپ کے خوابوں میں ٹھہراؤ آ چکا ہو اور پھر نئے آنے والے دنوں کی بجائے بیتے ہوئے کل کے خواب آپ کی نس نس میں جاگ رہے ہوں ۔ آرزو اور شکستِ آرزو۔ آوازیں ہی آوازیں جو آپ کو اور کچھ بھی سمجھنے نہ دیں۔ اور کچھ کرنے نہ دیں.......... آپ کی ذات دیواروں میں مقید ہو اور یہ دیواریں آپ کو عافیت گاہ لگیں۔ بازو ہوں جو کئی رشتوں کے ناتے جکڑے ہوئے ہوں۔ نظریں ہوں، جن کی زد میں آئے کسمسا بھی نہ سکیں۔ اور سب سے بڑھ کر آپ کا اپنا آپ ہو، جو کسی طور آپ کا پیچھا نہ چھوڑے.......... اور آئینہ ہو جو غلط فہمی کے کسی عکس کو آپ سے چھپا نہ پائے۔

صبح پانچ بجے اسلام آباد کی سڑکیں سوئی ہوئی ہیں، درخت ملگجے اندھیرے میں ساکت کھڑے ہیں اور ستمبر کا صبح کا چاند اکیلے تارے کے ساتھ بڑا ہی اداس لگ رہا ہے.......... اور دن کے لمبے سفر پر نکلنے والے مسافر کی طرح پیچھے الوداعی نظریں ڈال رہا ہے اور میں چھوٹے سے گیٹ کے پاس میز پوش کو فرش پر بچھا کر بیٹھی ہوئی ہوں۔ پانچ اور میں چھوٹے سے گیٹ کے پاس میز پوش کو فرش پر بچھا کر بیٹھی ہوئی ہوں۔ پانچ اور سات کے درمیان پورے دو گھنٹوں کا وقفہ ہے۔ سامنے کا کھلا حصہ درختوں اور خود رو جڑی بوٹیوں سے پٹا پڑا ہے ہم چند لوگ ہیں...... خاموش اور چپ چاپ...... لیکن پھر بریف کیس پکڑے سفید ریش بزرگ۔ عوامی سوٹ پہنے تاجر...... سفید برقعے پہنے عورتیں نئے سوٹ پہنے بچے...... اور شرمائی شرمائی سی ماں باپ کے ساتھ کچی کمر کی لڑکیاں ہیں۔

کیا یہ سارے موجود لوگ ایک ہی سحر کے ساتھ اسلام آباد کی برٹش ایمبیسی کی طرف کھچے چلے آ رہے ہیں۔ کیا یہ سب سیاحت کا شوق رکھتے اور نئی زمینوں کی دید کے مشتاق ہیں۔ یہ لوگ جو بظاہر غیر تعلیم یافتہ لگ رہے ہیں۔

ایمبیسی روزانہ ایک سو پچیس ویزے جاری کرتی ہے۔ کوئی کسی دوسرے کو معلومات فراہم کر رہا ہے۔ ایک سو پچیس...... یعنی ایک سو پچیس لوگ وطن کی سرزمین سے اپنے آپ کو جزوی یا کلی طور پر علیحدہ کر کے پردیس کو سدھارتے ہیں۔

کیا یہ سب سرزمینوں کا ایک ہی خدا نہیں...... کیا سب انسانوں کا روزی رساں اسے نہیں کہتے...... میں نہیں جانتی ہوں بچھڑنے والے پیچھے انتظار کا کرب، آنکھوں کے آنسو چھوڑ جاتے ہیں۔ بے شک وہ آنسو دولت کے رومال میں جذب ہو جاتے ہیں...... لیکن بہائے تو جاتے ہیں۔ اور بچہ پریشان سے ہیں...... وہ کسی دوسرے شہر سے آئے ہوئے ہیں اور اس قدر جلد تو کوئی تنور نہیں جلتا...... کوئی چائے خانہ بھی نہیں کھلتا...... میں اپنے ساتھ لائے ہوئے بسکٹوں کے ڈبے کو کھول کر چند بسکٹ بچے کے ہاتھ میں تھما دیتی ہوں اور پھر خود کھانے لگتی ہوں...... لیکن بھوک تو بزرگوں کو بھی لگتی ہے...... ہاں کبھی کبھار چھوٹی سی چیز بانٹ کر کھانے میں بڑی لذت ہے...... اور میں اس لذت سے محروم نہیں رہوں گی...... میں نے سوچ لیا ہے۔ اور یہ لوگ جو انتظار کے طویل وقفے میں ایک دوسرے سے باتیں کر رہے ہیں، ان خوشیوں کو اپنے خاندان سے بانٹنے کا تہیہ کر کے یہاں تک پہنچے ہیں، جو ان کے بازوؤں کی طاقت میں پوشیدہ ہیں...... ان کی ہتھیلی پر دھری ہوئی ہیں۔

اپنی طاقتوں کا ادراک انسان کو اپنے آپ پر یقین میں پختہ کرتا ہے اور یہ پختہ عزم لاثانی اور لافانی تخلیقات کا باعث بنتا ہے...... اور ان میں نہ جانے کون کون کیا کچھ کرنے والا ہے۔

نیلی یونیفارم میں ملبوس مقامی ملازم زنجیر کو کھول کر چھوٹے دروازے کو اندر دھکیل کر راہ بنا دیتے ہیں اور پھر اس راہ سے انسانی دھارے اندر بہنے لگتے ہیں۔

باہر صرف چھت تھی، لوہے کی پائپس تھیں۔ راہ روکنے کے لئے لیکن بیٹھنے کیلئے کوئی بیچ نہیں تھا۔ لیکن اندر بنچ ہی بنچ ہیں...... دلوں میں جلتی امیدوں اور آرزوؤں کی لو ہے۔ چہروں پر تھکاوٹ ہے اور شاید چائے کی گرم پیالی کی طلب بھی...... جو میرے دل میں شدت سے پیدا ہو رہی ہے تو میں ویزا لینے آئی ہوں...... اور میں دو گھنٹہ زمین پر بیٹھی رہی...... اگر گاڑی میں میز پوش نہ ہوتا تو، تو میری ٹانگیں ضرور کھڑے کھڑے اکڑ جاتیں۔

دو انٹری کے ویزا کیلئے شاید بارہ سو روپیہ ہر شخص کیلئے فیس تھی...... اور سا طرح ایمبیسی روزانہ لاکھوں پاکستانی روپیہ کماتی ہے...... ہمارے خوابوں کی قیمت وصول کرنے کا وقت شروع ہو چکا...... اور گورا صاحب آج بھی ہمیں خواب دکھاتا ہے اور ہم پاکستانی اس کے بتائے خوابوں کے جزیرے کی طرف بگٹٹ بھاگنا چاہتے ہیں۔ اور نہ جانے کب تک بھاگتے رہیں گے...... کیا میں خدا کا شکر ادا نہ کروں کہ میں ان خواب دیکھنے والوں میں سے نہیں ہوں...... لیکن میرا بھی ایک خواب ہے۔ کسی دوسرے ملک کی سیر کرنے کا ننھا سا بے ضرر خواب۔

ضروری نہیں کہ آپ کو ویزا ملے...... پھر کوئی کسی اور کو امید کی تنی رسی سے دھکا دے کر نیچے گرانے کی کوشش کر رہا ہے...... شاید میں ہی گر جاؤں تو...... خدا نہ کرے۔ میرا خواب ٹوٹنا نہیں چاہئے۔ کیونکہ میرے پاس خواب دیکھتے رہنے کا وقت نہیں۔ لیکن انہوں نے مجھے دھکا نہیں دیا...... پاسپورٹ پر ویزا کی مہر لگوا کر میں خوش خوش باہر آ گئی ہوں......

میرے پاس معقول جواز تھا، میں اور میری بھانجی نجی کام کے سلسلہ میں لندن جا رہے ہیں اور یہ کہ میرے چار عدد بچے اور شوہر میرے ساتھ نہیں۔ اور کوئی عورت اتنے سارے بندھنوں کو توڑ

کر کیونکر رہ سکے گی...... وہ یقیناً مشرقی عورت کی فطرت سے آگاہ ہیں......لیکن آج کی مشرقی عورت بھی بدل رہی ہے......وقت اس پر اثر انداز ہو رہا ہے وہ بھی احتجاج کے طریقے سیکھ رہی ہے۔

واہ......!انہوں نے مجھ بہت ہی بے ضرر اور سیدھی عورت جانا۔ انہیں کیا معلوم کہ میں کیا سوچتی ہوں......شاید میں وہیں رہ جاؤں۔ میں مسکرا کر کہہ رہی ہوں......ان عقل مند لوگوں کو دھوکا بھی دیا جاسکتا ہے......شاید میں وہیں رہ جاؤں۔ میں مسکرا کر کہہ رہی ہوں......ان عقل مند لوگوں کو دھوکا بھی دیا جا سکتا ہے......ارے میری تو ریٹرن ٹکٹ ہے۔ خیر میں اتنی بیوقوف نہیں کہ ان کی عقل مندی کو چیلنج کرنے کیلئے اپنا نقصان کر بیٹھتی......میں نے ویزا کی مہر کو غور سے دیکھا ہے۔ انگریز کے ملک کا اجازت نامہ......ہزاروں انسانوں کے لیے پر آسائش زندگی کے خواب دیکھنے کا اجازت نامہ......اپنوں سے بچھڑنے اور انہیں تسلیاں دینے کا اجازت نامہ۔

لیکن فرانس کی ایمبیسی نے روپے لینے کے باوجود دھوکہ کیا۔ انہیں میرے فرانس جانے پر بھلا کیا اعتراض ہے۔ حالانکہ وہاں ہم ملگجے اندھیرے میں دیوار کے ساتھ لگے بنچ پر چپ چاپ بیٹھے رہے ہیں......لیکن وہ شکستِ خواب کا کاروبار کرتے ہیں......پیرس۔ فن اور فنکاروں کا گہوارہ ...... زر اور زن کی زمین ...... ہوس اور محبت کی کسوٹی ......اور بقول کسی کے سرافہ اور حرافہ کا کاروباری مرکز ...... عورت کے جسم کی تجارت۔ تعریف ہی تعریف ...... لیکن فرانس والے خاصے خود پسند لگتے ہیں۔ انہیں پرکاہ جتنی پرواہ نہیں کہ لوگ ان کے ملک کو سراہیں۔ حالانکہ میں دیوار کے ساتھ بنچ پر بیٹھی ان کی فیاضی اور فراخدلی کو سراہ رہی تھی ......یہ کہ انہوں نے آنے والوں کے لیے بنچ بچھا رکھے ہیں ......اور یہ کہ خاصے کلچرڈ لگتے ہیں۔ لیکن افسوس انہوں نے میری تعریف کی رتی

بھیر پرواہ نہ کی ....

اور یہ برٹش پیپل .... فراخ دل........ حالانکہ ہم پاکستانی تو کومن ویلتھ کے ممبر بھی نہیں رہے تھے۔ ہم نے ممبر شپ کا کارڈ ان کے منہ پر دے مارا تھا۔ لیکن انہی کا حوصلہ ہے کہ تب بھی روزانہ ایک سو پچیس لوگوں کو اپنے ملک کی خوبصورتیوں کو سراہنے کے لیے روانہ کرتے ہیں۔ دراصل یہ اپنے ملک سے بے حد محبت کرتے ہیں .... وغیرہ وغیرہ ....

.... O...........

ہزاروں جواز........ سینکڑوں تاویلیں........ اور پھر چودہ ستمبر کا دن........ وہ کل آنے والا ہے........ اور آج تیرہ تاریخ ہے اور میرے جانے میں صرف ایک دن باقی ہے "بھئی میں نے کب چاہا تھا کہ اکیلی غیر زمینوں پر ماری ماری پھروں" .... "تمہاری مرضی"۔ یعقوب بولے........ ٹکٹ واپس ہو سکتے ہیں۔ ارے نہیں........ اتنی تو مصیبت سے ویزا ملا ہے۔ لیکن مجھے احساس ہوا کہ میرے شوہر ایک ماہ کے لیے گھر کی ذمہ داری کو اپنے سر لینے سے گھبرا رہے ہیں۔ "ابو جانیں دیں امی کو۔ اگر یہ اب نہ جا سکیں تو پھر شاید موقعہ ہی نہ ملے۔"

میری بڑی بیٹی پھر حالات اور میرے درمیان کھڑی ہو گئی۔ "امی آپ بے فکر ہو کر جائیں۔ میں اپنی نائٹ ڈیوٹی کر ڈے ڈیوٹی میں بدلوا لوں گی........ اور باقی بھی سب کچھ ہو جائے گا........ بس آپ جائیں۔"

اور ہمایوں کالج سے آیا اس کا چہرہ مضمحل ہے۔ اسے ہلکا سا بخار ہے........ میرا تو جانا کسی صورت نہیں ہو سکتا۔ میں اپنے بچے کو بخار میں نہیں چھوڑ سکتی........ چلو ڈاکٹر صاحب کے گھر .... ہم ڈاکٹر صاحب کے گھر ہیں۔ ڈاکٹر رشید اور جہاں آراء........ دو ڈاکٹر۔ دو انسان .... دو بہترین ڈاکٹر۔ "ارے مسز یعقوب فکر کی کوئی بات نہیں۔ معمولی حرارت ہے اور اگر

کوئی فکر کی بات ہوئی تو ہم اسے اپنے گھر لے آئیں گے۔ آپ ضرور جائیں....... خوب سیر کریں۔ گھومیں پھریں۔" .... میرا اپنا بھی تو گلا خراب ہے....... میں غیر شعوری طور پر جانے سے خائف ہوں....... دوری سے خائف ہوں.......

"آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔ دوائیاں ساتھ لے جائیں۔ کھاتی رہیں۔ اگر ٹانگیں تھک جائیں تو کوئی مرہم لگا کر مساج کرلیں اور ویسے بھی آپ رات کو ٹانگوں پر ضرور مساج کر لیا کیجیے گا۔۔۔ وہاں بہت چلنا پڑے گا۔"

جہاں آراء مسکرا رہی ہیں۔ وہی ہمدردی اور اعلیٰ ظرفی کی مسکراہٹ....... وہ ہمارے دوست ہیں۔ وہ میرے دوست ہیں۔ وہ یعقوب کے دوست ہیں.......

نہ جانے وقت کے کتنے چشموں کو کھنگالنے کے بعد دوستی کا ایسا سوتا میں نے اور یعقوب نے پایا ہے۔ بے ضرر اور بے غرض....... دینے میں کسی عار سے مبّرا....... لینے کی خواہش سے بالا.......

یہ سب جو میرے گرد ہیں....... خلوص محبت اور چاہت سے پُر دل ہیں۔ میری خوشی کے لیے ہر اعانت کے لیے تیار....... اور فیصل کا جملہ۔ امی آپ کتنی خوش قسمت ہیں، حالانکہ اس جملے میں اس کی اپنی محرومی کا سایہ بھی ہے۔ وہ ننھا سا دل میرے جانے سے خوش ہے۔ آپ ضرور جائیں....... بس امی.......

اور آج چودہ تاریخ کو عذرا اصغر کا اسلام آباد سے فون آیا ہے....... "اچھا بھئی خیر سے جاؤ اور خیر سے آؤ....... سچا تمہیں خدا حافظ کہہ لوں....... خوب سیر کرنا"....... بس دعا کرو، میں کہتی ہوں۔

آغا سہیل بھائی نے فون پر ہنستے ہوئے کہا....... "تو آپ جا رہی ہیں نا لندن....... جایئے

جایئے اور پھر آ کر سفرنامہ لکھئے گا"........

لندن....... سفر....... سفرنامہ....... دوری....... میں لندن جا رہی ہوں....... لیکن میرے ذہن کے اندھیرے میں ایک سوال اٹھ رہا ہے....... کیوں....... مجھے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے میں نے اس شہر کی ساری گلیاں بازار دیکھ رکھے ہیں۔ مجھے کہیں بھی تعجب آمیز خوشی نہیں ہوگی۔ پھر....... لیکن قسمت کی طرح اٹل حقیقت ہے کہ میں لندن جا رہی ہوں۔

ڈاکٹر میمونہ انصاری نے دوبارہ فون کیا۔ وہ مجھے خدا حافظ کہنا چاہتی تھیں۔ لیکن میں نہ ملی۔ حالانکہ ابھی کل ہم دونوں نے ایک دوسرے سے بہت سی باتیں کی تھیں۔ بزمِ ہم نفساں کا ستمبر کا اجلاس سلمیٰ اعوان کے گھر ہونے والا ہے۔ آغا سہیل بھائی کہتے ہیں کہ وہ اس بار یہ ذمہ داری اٹھالیں گے....... اجلاس میں ناغہ اس کی روایت کو توڑ دے گا۔ اور پھر ہم سب اس کے ممبرز ہیں، اس کی روایت کے ذمہ دار ہیں۔

"ہاں ہو جائے گا تم فکر نہ کرو....... کچھ کر ہی لیں گے"....... میمونہ کا دوستانہ لہجہ پر امید تھا .... اور آج اس نے مجھے خدا حافظ کہنے کے لے دوبارہ فون کیا.......

میرے گرد سب باتیں خوبصورت اور خوشگوار لگ رہی ہیں۔ ایک ننھا سا دوستی اور محبت کا دائرہ۔ اور مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ آج کے دن میں ہی اس کا مرکز ہوں۔

میں اپنے بکس میں چند سوتی کپڑے رکھ رہی ہوں....... وہاں لباس کا اچھا ہونا یا نہ ہونا کچھ فرق نہیں ڈالتا....... اور موسم قدرے ٹھنڈا ہوگا۔ ریشمی کپڑے سردی کو روک نہ سکیں گے .... ایک سویٹر کافی ہے۔ وہاں سے جا کر خرید لیں گے.......

وقت رینگ رہا ہے۔ کیا مجھے جانے کی جلدی ہے....... ارے بھئی یہ گھر اس قدر کیوں بکھرا ہوا ہے۔ صبح سے مجھے فرصت نہیں اور تم لوگ۔ آخر چیزیں کیوں بکھراتے ہو....... میں سرزش کر

رہی ہوں....... امی آپ پریشان نہ ہوں....... بس خوشی خوشی جائیں....... میری چھوٹی بیٹی مونا مجھے تسلی دیتے ہوئے کہہ رہی ہے۔

ارے یہ سائیڈ ٹیبل کا دراز ہی بند نہیں ہوتا....... میں اسے زور سے اندر دھکیل رہی ہوں۔ اف میری شہادت کی انگلی س خون نکل آیا....... اچھا شگون نہیں....... میرے بیٹے ہمایوں نے جلدی سے سلون پلاسٹر لگا دیا ہے۔ اسے ڈاکٹری میں اتنا تو آ گیا ہے....... اور میں کسی شگون اور بدشگونی میں یقین نہیں رکھتی....... سب اس کی رضا سے ہے....... اور میرے ہاتھ میں پکڑے ٹکٹ....... میرے بٹوے میں پڑے ڈالر....... اور....... آنے والا سفر....... گھر سے دوری....... میں تو کسی چیز پر قادر نہیں تھی....... اس خدا نے چاہا اور ہو گیا۔

.......O.......

پی آئی اے کا جہاز پرواز کر رہا ہے۔ میرے بچے ابھی ابھی میرے گلے لگ کر مجھے رخصت کر رہے تھے۔ وہ ایئر پورٹ کے باہر ارتے جہاز کو دیکھ کر یقیناً کہہ رہے ہوں گے....... وہ دیکھو امی کا جہاز....... اور پھر وہ مڑ کر گاڑی میں بیٹھ کر لندن کے بارے میں باتیں کریں گے....... اور ان سارے مزوں کی باتیں جو ان کے ابوان کو کروانے کا وعدہ کر چکے ہیں۔ اور ان پکچرز کی باتیں جو وہ ایک ماہ کے دوران دیکھیں گے....... اور سیریں جن سے وہ جی بہلائیں گے....... اور فیصل نے ضرور کہا ہوگا....... ''امی کتنی خوش قسمت ہیں۔''

چودہ تاریخ کا دن افق پر ڈوب رہا ہے۔ افق کی گلابی گہری نیلی لائن کے اوپر ہاتھ دیئے کھلکھلاتے ہوئے دوڑ رہی ہے اور نیچے سندھ کا ریگستان لہریں لیتا آگے پیچھے جھول رہا ہے....... اور اس وسعت میں تھر پار کر کی ریت میں کوئی اونٹوں کا کارواں رواں دواں ہوگا۔ اور تصویر مکمل ہے....... اور سہاگنیں گرم چولہوں کے پاس بیٹھی آنے والے کے لیے خالص گھی

سے روٹی پکار ہی ہوگی....... اور ہماری سرحدوں پر محافظ چوکس ہیں....... اور زندگی ارزاں ہے....... اور خون نے گلیوں کو رنگین بنا ڈالا ہے۔اور میں نہ جانے کہاں جا رہی ہوں....... وہ سرزمین میرا سواگت نہ جانے کیسے کرے گی....... اور واپس آنا بھی خدا کے ہاتھ میں ہی ہے....... اور پھر سورج کا سرخ گولا زمین کے دامن میں چھپ گیا....... پناہ....... وصال کا لمحہ....... گردشِ رنگِ چمن....... ٹھنڈی چائے پی کر میں نے آنکھیں بند کرلی ہیں۔ایئر ہوسٹس ٹرے اٹھا کر لے گئی ہے۔میز کو سمیٹ دیا گیا ہے.......

رقت کے سیلِ رواں میں یہ لمحہ نہ جانے دائرے کی کس زنجیر میں قید ہوگا۔لمحہ جس میں میں سوچوں کے گرداب میں ڈوب رہی ہوں....... وسوسے....... ساری محبتوں کے باوجود۔ وسوسے جو عورت کی فطرت میں شامل ہیں۔

''کراچی پر ہم لینڈ کرنے والے ہیں۔امید ہے آپ کا سفر بخیر گزرا ہوگا....... '' آواز....... ہمیشہ کی طرح وہی الفاظ....... رٹے رٹائے۔جذبوں اور محبتوں کی آنچ سے خالی....... کاروباری....... لیکن پھر بھی اچھا تاثر چھوڑتے ہوئے۔

ایئرپورٹ پر جمیل جالبی صاحب کی بہن آپی کی بیٹی کو دو گھنٹوں کے لیے لینے کے لیے کھڑی ہیں۔اور میں چار برسوں کے بعد اس شہر میں آئی ہوں، مجھے یقیناً بھائی اور بھابھی کے ساتھ جانا ہے۔وہ ہم دونوں کے منتظر ہیں....... بہر حال....... میں ان کے ساتھ جا رہی ہوں۔

خنک رات کراچی کے زخموں پر مسکرا رہی ہے۔اور دہشت کا چہرہ سیاہی کا نقاب اوڑھے نہ جانے کون سی ویرانیوں میں بھٹک رہا ہے۔لیکن اچھے مستقبل کے لیے امید رکھی جاسکتی ہے۔ کوئی ہوگا جو امن کا صور پھونکے گا اور میرے وطن کے زخم مندمل ہوں گے۔

دو گھنٹے....... چھوٹی باتوں کو پوچھتے بیت گئے۔مجھے دس بجے ایئرپورٹ پر پہنچنا ہے اور دس ہی

تو بجے ہیں اور ایئر پورٹ پر دوریوں اور نزدیکیوں کا ڈرامہ ہر روز دہرایا جاتا ہے۔ اور میں بار بار گھڑی کو دیکھ رہی ہوں....... دس....... ساڑھے دس....... عاشی آ گئی ہم سامان کو دھکیلتے پسینجر لاؤنج میں چلے گئے....... لیکن کے۔ ایل ایم کا کاؤنٹر بند ہو چکا ہے۔ ''کلوز'' کا گہرا سبز لفظ بار بار جھلملا رہا ہے۔ آخری مسافر....... ہم نہیں جا سکتے....... لیکن یہ مسافر....... اسلام آباد کا کوئی بڑا اہم مسافر....... فرسٹ کلاس کی ٹکٹ....... کوئی ہماری بات نہیں سنتا۔ ہم اکانمی کلاس کی نیلے کور کی ٹکٹ ہاتھ میں تھامے بے بس کھڑے ہیں اور بیورو کریٹ بندہ....... درجہ بندی۔ ایک ہی جہاز.......

بات سنیئے....... جو دروازہ اس انسان کے لیے کھلے گا اسی سے ہم بھی گھس سکتے ہیں....... میں غصہ سے کہتی ہوں....... لیکن وہ ہماری طرف دیکھ ہی نہیں رہے....... ہاں وہ ہم پر ایک مہربانی کر سکتے ہیں....... وہ ہمیں کسی دوسری ایئر لائن سے بھیج سکتے ہیں۔

چلو مقصد سو پہنچنا ٹھہرا....... ترک ایئر لائن....... ذہن میں گھنٹیاں سے بجنے لگی ہیں۔ عبادت بریلوی صاحب استنبول سے واپس آئے تھے۔ وہ ترکوں کی محبت میں سرتا پا ڈوبے ہوئے تھے۔

''صاحب وہاں کی عورتوں کی خوبصورتی کا کیا کہنا۔ اس قدر خوبصورت اور باحیا''....... وہ بے اختیار ہو کر کہہ رہے تھے....... اور مسز فہمیدہ عبادت نے شرارت سے مسکراتے ہوئے ان کو مخاطب کر لیا تھا۔ ''وہاں کے مرد بھی کم نہیں''....... اور پھر ہمارے درمیان محبت کا ایک رشتہ انگنت برسوں سے استوار ہے۔ جسے دوری نے ہی قائم کیا ہوا ہے....... دوری ہی دراصل محبوبہ کو محبوبہ بناتی ہے اور ترکوں کے نزدیک ہماری محبت بھی ان کی محبوبہ ہے....... اور چاہت کا رشتہ استوار ہے.......

میں بنچ پر بیٹھی مختلف ایئر لائنز کی گڑیوں جیسی سجی سجائی ایئر ہوسٹسوں کو اپنے اپنے کیریئر پر جاتے دیکھ رہی ہوں۔۔۔۔۔۔۔ جوانی بھی ایک جادو ہے اور نہ جانے یہ جادو کس کس کے سر چڑھ کر بول رہا ہوگا۔ جاپان کا جادو۔ یورپ کا جادو۔ اور ابھی ابھی جو خوبصورت لڑکیاں گزری ہیں وہ ترک بھی ہوسکتی ہیں۔۔۔۔۔۔۔ اور پاکستانی خوبصورتی کا جادو۔۔۔۔۔۔ اور مجھے سب کے چہرے اس قدر پرکشش لگ رہے ہیں۔ اور دنیا انہی چہروں کی وجہ سے ہی تو جنت ہے۔ اللہ کسی کی جوانی کو جاودانی نہیں بناتا۔ لیکن وہ جوانی کو جاودانی بنائے رکھتا ہے اور دائرہ مکمل ہوتا ہے' فضا کی کھائیوں میں اترتا ہے' دوبارہ طلوع کی خوبصورتی سے انسانی ذہن مسحور ہوتا ہے اور یونہی وقت کی رفتار اپنا سفر جاری رکھے گی۔۔۔۔۔۔۔ اور میری طرح آنے والوں کو کوئی نہ کوئی ہمیشہ سراہتا رہے گا۔

طاقتِ پرواز مگر رکھتے ہیں

.......O.......

الوداع اے میری سرزمین الوداع۔

گھڑی نے دو بجے شب کا گھنٹہ بجایا ہے۔ اور ترکش ایئر لائن کا طیارہ فضا میں پرواز کرنے کے لیے اپنے پہیوں کو سمیٹ رہا ہے۔ اور رات کی تاروں بھری روشنیاں سیاہی کا لبادہ اوڑھے مجھے خدا حافظ کہہ رہی ہیں۔ اور شہر سویا ہوا ہے اور انسانوں کی خودغرضیوں کی دھند میں راہیں گم ہو جاتی ہیں، سرگرداں متلاشی انہیں کھوج نہیں پاتے اور بھٹکنے لگتے ہیں۔ اے خدائے رحیم و کریم ۔۔۔۔۔۔۔ اے خدائے کائنات۔۔۔۔۔۔۔ میں دعا کے لیے دل کے ہاتھ اٹھا کر سر کو اس کے سامنے جھکا دیتی ہوں۔۔۔۔۔۔۔

.......O.......

رات کے اسرار کائنات کی رگ و پے میں دوڑ رہے ہیں۔ کیا یہ اسرار نہیں کہ جہاز پرواز کرتا ہے، یہ اسرار ہی تو ہے کہ صحرا بے آباد اور وادیاں آباد ہیں۔ میں کھڑکی سے ناک کو چپکائے زمین کو اپنی آنکھوں میں اتار کر اس کے اسرار جاننا چاہتی ہوں۔ بادلوں کی دبیز تہہ کے نیچے زمین نہ جانے کتنے چولے بدل رہی ہوگی...... مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا...... صرف روئی کے گالوں کی طرح کے بادل ہیں...... اور جہاز کے اوپر بھی بادل ہیں...... اور ہو سکتا ہے کہ سارا کرہ عرض بادلوں کے گھیرے میں ہو...... اور خدا کا تخت بادلوں کے دوش پر دھرا ہوا اور وہ اس سارے تماشے کو دیکھ رہا ہو جو انسان انسان سے کر رہا ہے۔ جو اسرائیل فلسطین کے انسانوں سے کر رہا ہے۔ جو چلی کا صدر اپنی رعایا سے کر رہا ہے۔ جو ظالم مظلوم سے کر رہا ہے۔ جو ہمسایہ ہمسائے سے کر رہا ہے۔

جہاز ایران کے صحرا پر اڑ رہا ہے۔ ساکت ٹھہرا ہوا ریت کا سمندر...... لہریں ساکت ہیں ...... صرف کبھی کبھی گول دائرے سے نظر آتے ہیں۔ شائد وہ تیل کی تنصیبات ہوں۔ تیل جو تیسری دنیا کی معیشیت میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ جس نے ایران کے شاہ کو ایک سپر پاور بننے پر اکسایا اور اس نے ہتھیاروں کے انبار لگا دیئے اور اسے انسانوں اور انسانیت سے دور کر دیا۔ اس کی رعایا کے لوگ اس کی تعریف کرنے سے بھی خوفزدہ تھے اور بد تعریفی کرنے سے بھی...... انہوں نے زبانوں کو اپنے دھانوں کے اندر پوشیدہ کر لیا۔ شاہ کے نام پر رعایا کا خون بہایا جاتا اور پھر خون کی بو کو اونچی گودنوں والے گھوڑوں اور تنی پیشانیوں والے سرکاری عمال صفائی کی گرد میں چھپا دیتے۔ لیکن زبانِ خنجر چپ رہی اور آستین کے لہو نے ذہنی اور جسمانی قید سے رہائی دلوائی اور پھر پہاڑ آہوں سے گونجنے لگے۔ زمینیں ظلم کے ہاتھوں پامال آئیں اور پہاڑوں کی پیشانیاں دہکنے لگیں۔ اور زرخیز وادیوں پر مائیں ماتم کناں راہوں پر

بھٹکنے لگیں.......

شاید نیچے نظر آتیں پہاڑیاں سرسبز ہوں لیکن سبزہ کہیں نظر نہیں آتا۔ صرف چوکور خانے کہیں کہیں بنے ہوئے ہیں۔ جیسے کسی بچے نے کاپی کے خالی صفحے پر گھر بنایا ہو....... اور فطرت بھی تو نقاش ہے نہ جانے کیسی کیسی لائنوں سے کیا کیا ثابت ہو رہا ہے۔ اور جان جوکھوں میں ڈال کر جغرافیہ دان زمین کی حد بندی کرتے ہیں۔ اور ان سرحدوں پر خون بہایا جاتا ہے۔ جوان دل خوبصورتیوں کے جہانوں کو آنکھوں میں سجائے خود پسندیوں اور انا کی بھینٹ اتر جاتے ہیں، ایران کی سرحدیں۔ عراق کی سرحدیں....... جسموں کی حد بندی۔ سوچوں کی حد بندی۔

خواتین و حضرات ہمارا جہاز اب ترکی کی سرحد میں داخل ہو چکا ہے۔ ہم آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کر رہے ہیں۔ لیکن نیچے زمینوں پر ویسے ہی سرخی مائل خاکستری پہاڑ ہیں....... لیکن پہاڑوں کی بلندیوں کے طویل سائے زمین کو سیاہ دھبوں میں تبدیل کر رہے ہیں۔ سورج سرخ طویل پٹی میں ساتھ ساتھ بھاگا جا رہا ہے۔۔۔۔

یہ سیاہی کے بڑے بڑے قطعے مجھے سمجھ نہیں آ رہا اور پھر سیدھی طویل لائنیں جو بنجر زمینوں میں سفر کرتیں دور غائب ہو جاتی ہیں۔ آبادی کہاں ہے۔ یہ طویل شاہراہیں کون سی بستیوں کو جا رہی ہیں۔

جہاز پرواز کر رہا ہے اور اس کے ساکت پر فضا کی وسعتوں اور وقت کے لمحوں کو چیرتے مجھے اجنبی سرزمینوں کے طرف اڑائے لئے جا رہے ہیں۔ جیتے جاگتے انسان آبادیوں کو مفہوم کر دیتے ہیں اور میں بھی ایک سرزمین سے تعلق کے حوالے سے پہچانی جاتی ہوں۔ میرے پاسپورٹ پر میری تصویر کے ساتھ میرے وطن کا نام لکھا ہوا ہے اور لوگ کہتے ہیں دوسرے ملکوں کے ایئرپورٹ ہمیں مشکوک نظروں سے دیکھتے ہیں....... مافیا کے رکن ملکوں میں ہمارا شمار بھی

کیا جاتا ہے۔ یہاں کے سوداگر بھی انسانی حیات کا سودا کر کے روپوں کے مینار تعمیر کرتے ہیں۔ کیا سوداگروں نے آبِ حیات پیا ہوا ہے، کیا موت کے جابر ہاتھ ان کی گردنوں تک نہیں پہنچ سکتے؟ خیال رائیگاں....... عبث خوش فہمیاں۔ اٹلی کے گاڈ فادر....... کولمبیا کے کارٹل خاندان کے رکن، روتے ہوئے معصوم لوگ....... کٹتی ہوئی گردنیں....... پامال عصمتیں....... نشہ سے چور بدن....... خوابوں کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے ذہن....... بے بس حکومتیں، قانون کے لاچار ہاتھ۔ گذشتہ سال ایک سو اکیاسی اعلیٰ افسران کو مختلف اذیت ناک طریقوں سے قتل کر دیا گیا۔ پچاس ججوں، پچیس صحافیوں، سینکڑوں پولیس والوں، انصاف کے ایک وزیر، ایک اٹارنی جنرل اور شعبہ منشیات کے ایک ذہین اور انتہائی مشہور سراغ رساں کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا....... اور خدا تماش بین بنا آسمانوں کی وسعتوں میں اپنے تخت کے اڑن کھٹولے پر بیٹھا سزا اور جزا کا حساب کرتا رہتا ہے اور نیچے انسان ایک دوسرے کا گلا کاٹتے ہیں اور مائیں سینہ کوبی کرتی ہیں۔

لیکن ایسا میرے ملک کے کسی ذی نفس کو نہیں کرنا چاہیئے۔ لیکن میرے سوا میرے خیالات و تصورات کا کوئی احترام کرے....... سوچ جایئے افسوس کیجیئے۔ شرم سے گردن جھکا لیجیئے یا کٹوا لیجیئے....... میں بھری تجوریوں کے احساسات کے راز نہیں جانتی۔ میں اس ساری کائنات میں ایک موہوم نقطے جتنی وقعت بھی نہیں رکھتی ہوں۔

زمین گردش میں ہے۔ پہاڑوں کا سبزہ ڈھلوانوں کو ڈھانپے، گہرے مونگیا سایوں میں بدل گیا ہے۔ عمودی چٹانیں....... پہاڑوں کے حصاروں میں قید جھیلیں....... کراس روڈ پر بستیوں کے نشان۔ نہ جانے کون کون سے شہر جہاز کے سائے کی زد میں آتے ہیں اور پیچھے چھوٹ جاتے ہیں۔ نام ہی نام۔ انسان ہی انسان۔ اپنے ہونے کا ثبوت مہیا کرنے کی تگ و دو میں مصروف

۔ بلیک سی کا پانی بے کنارہ وسعتوں کو سمیٹے جھاگ اڑاتی لہروں کے سنگ بہہ رہا ہوگا۔ سفید جھاگ۔ آگے پیچھے جھولتی۔ جہاز کے مستول نظر آنے لگے ہیں....... ایک نقطہ لیکن پھر بھی موجود....... سرخ چھتیں قطار در قطار....... ساحلوں پر آباد مکانوں کے مکیں....... خوبصورت چہروں والی ایئر ہوسٹسیں تمام رات مسافروں کی خاطر داری میں مصروف رہی ہیں اور چار بجے .... سات بجے اور پھر صبح آٹھ بجے کھانے کے ٹرے....... مصروف مسافر....... تیز قدم حسینائیں....... زندگی گذارنا کتنا دشوار ہے۔ آپ مستعد ہیں اور یہی آپ کی نوکری کی ضمانت ہے....... ورنہ....... ورنہ.......

''خواتین وحضرات، ہم استنبول ایئر پورٹ پر اترنے والے ہیں۔ اپنے حفاظتی بند باندھ لیجیے''۔ آواز گونج رہی ہے اور میرے سامنے سے گزرتی ہوئی ایئر ہوسٹس کا چہرہ خون کی تمازت سے روشن ہے۔ ایک لمبے سفر کے بعد ٹھہراؤ کا وقفہ۔ اپنوں سے ملنے کی آس۔ ایک گھر....... گھر میں منتظر آنکھیں۔ چاہے وہ کسی کی بھی ہوں۔

اور پھر جہاز سمندر کی نیلی سطح پر پرواز کرتا سمندر کے کنارے آباد استنبول کے شہر کے اوپر سے ہوتا ایئر پورٹ پر اتر گیا ہے....... استنبول....... کیا یہ کسی کے خوابوں کا شہر بنا ہے....... شاید ہو....... لیکن میں نہیں جانتی....... ساری زندگی اقتصادیات کی اکائی کے گرد گھومتی ہے۔ کسی ملک کی صنعت وحرفت کی منڈی، محنتی ہاتھوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ کارخانوں میں مال بنتا ہے۔ مال بنانے کے لے انسانوں کی ضرورت ہے۔ اور ترقی کی شاہراہوں پر تیز تر دوڑنے والے کسی کا انتظار نہیں کرتے....... ہم ایک لمبی راہ داری سے ہوتے ہوئے ٹرانزٹ لاؤنج میں آر کے ہیں۔

سیاہی مائل میرون رنگوں کے امتزاج سے بنی آئینوں سے مزین ایک وسیع عمارت جس کے بلند

ستوں لوہے کے مضبوط گارڈر ہیں....... اور چکنے فرش....... رنگین کرسیاں....... چھوٹی چھوٹی دکانوں کی جگمگاتی مصنوعات اور روشنیوں سے سجی دکانیں۔

میں پہلی بار ترکی کے لوگوں کو اتنے نزدیک سے دیکھ رہی ہوں۔ خوبصورت دمکتے گالوں والے بچے....... بلند قامت مرد....... نازک ادا دوشیزائیں جنہوں نے اپنے ماتھوں کو لٹکتے پٹی دار زاویوں سے سجایا ہوا ہے....... دراز سائے....... فربہ جسموں والی ادھیڑ عمر عورتیں....... اور ہم ایشیائی....... میں سب کچھ دیکھ لینا چاہتی ہوں۔ ایک گھنٹہ بعد ہمارا جہاز لندن کے لیے روانہ ہوگا....... ہم ایئرپورٹ سے باہر نہیں جا سکتے۔ شیشوں کے دروازے ہی دروازے....... کدھر جانا ہے آگے دیوار سرِ راہ ہے۔ لیکن آپ کو معلوم نہیں ہو پاتا۔ کرسیاں کم اور مسافر زیادہ ہیں۔ یہاں بھی مائیں اپنی خوبصورت بیٹیوں کو پیار سے نہارتی ہیں اور نہال ہوتی ہیں۔ ماں کا جذبہ آفاقی ہے۔ ننھی بچیاں خوبصورت ترین چہروں کے ساتھ بے صبری میں دوڑ بھاگ رہی ہیں۔

لیکن جب آگہی کا عذاب نازل ہوگا تو پھر اپنے جسم کی ہر حرکت سے آگاہ یہ بھی میرے پاس سٹول پر بیٹھی چودہ پندرہ برس کی لڑکی کی طرح اپنے بہن بھائیوں سے بے خبر ماں کی آواز سے لاپرواہ ان نظروں کو تلاش کریں گی جو ان کی طرف دیکھتی ہوں گی....... مجھے اسے دیکھنے میں لطف آ رہا ہے۔ وہ جانتی ہے اس کی خوبصورتی نگاہوں کو گرفت میں لے رہی ہے....... نہ جانے آنے والے وقت میں اس کی قسمت میں کیسی خوشیاں لکھی ہیں۔ کیسے دکھوں سے اسے واسطہ پڑے گا۔ لیکن خواب دیکھنے کے لیے اس کے پاس بہت لمبا وقت ہے۔ اس نے تو حقیقتوں کی سیڑھی پر قدم بھی نہیں دھرا۔

زندگی یونہی خواب دیکھتی ہے۔ چہرے یونہی جگمگاتے ہیں اور سادہ دنیا یونہی جنت بنتی ہے۔

لیکن زندگی کا یہ بھی تو ایک رخ ہے۔ کاؤنٹر پر کھڑی خوبرو ایئر ہوسٹس خوف کے مارے کاغذوں کو الٹ پلٹ رہی ہے۔ ایک کاغذ گم ہے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں اور سب کی نظریں اس کی اضطراری حرکتوں کو دیکھ رہی ہیں۔ لیکن وہ ایک خوف میں جکڑی ان گھورتی نظروں سے بے خبر ہے۔ اس نے کاغذوں کا پلندہ پھینک دیا ہے۔ اس کا ساتھی اس کی مدد کر رہا ہے۔ دیکھا جائے گا...... وہ کاغذوں کو اٹھا کر کہہ رہی ہے...... دیکھا جائے گا...... میرا دل خود آنے والے لمحوں کی گرفت میں ہے۔ خوشیاں اور دکھ ایک دوسرے کے تعاقب میں ہمیشہ رواں رواں رہتے ہیں۔ ہم وقت کی کھائی پر حالات کا رسہ پکڑے لٹکنے پر مجبور اسے عبور کرتے ہیں...... دیکھا جائے گا...... اور کھائیاں پیچھے چھوٹ جاتی ہیں، ہمارے قدم مضبوط زمین پر جم جاتے ہیں اور پھر دل کہتا ہے دیکھا جائے گا۔

جہاز اڑ رہا ہے۔ وہی بادلوں کی دبیز سفید سرمئی تہیں...... اور پھر خلا اور پھر بادل...... اور پھر اور تارے اور چاند اپنے وقت کا انتظار کر رہے ہیں اور چاند اپنے وجود کے ثبات کے لیے سورج کا مرہونِ منت ہوگا۔ اور شاعر اپنی محبوبہ کی یاد کی کسک لیے اسے اس کے چہرے سے تشبیہ دیں گے اور دل وصال کی تمنا میں دھڑکیں گے اور ملک مستعار مانگی گئی رقوم سے اپنی حیات کے ڈگمگاتے ساحلوں پر لنگر انداز ہونے کی کوشش کرتے ہیں اور لٹیرے اپنی جیبیں بھرتے ہیں اور سڑکیں انسانی جسموں کو ہچکولے دیتی ہیں اور تجوریوں میں نوٹوں کی گڈیاں دلوں کو بھرماتی اور پھر انسان سے انسان کا رشتہ منقطع ہو جاتا ہے۔

میں سر کو بیکار کی سوچوں سے جھٹکتی ہوں۔ میرا ملک...... میرا تشخص۔ اس کی برائیاں، میری برائیاں اور اس کا نام میری امانت ہے۔ شائد لندن ایئر پورٹ پر ہمیں پاکستانی سمجھ کر ایک طرف کھڑا کر دیا جائے۔ لیکن میں نے صرف اتنا تن رکھا ہے کہ ہیروئین، کوکین اور دوسرے نشہ

آور پوڈر سفید ہوتے ہیں اس سے زیادہ میرا ان کا کوئی واسطہ نہیں۔ میں اپنی جیبوں کو ٹٹولتی ہوں، مبادا کسی نے چلتے چلتے اپنے خوف کو میری جیب میں منتقل کر دیا ہو۔

لیکن میری جیبوں میں وہی چند چیزیں ہیں بے ضرر صرف میرے مصرف کی۔ میں پھر بیضوی کھڑکی سے ناک کو چپکا لیتی ہوں۔ ہریالی ہی ہریالی۔ وسیع سبزہ زار۔ درمیان میں گھر...... پانی کی جھیلوں میں پانی چمک رہا ہے۔ دریائے ٹیمز بل کھاتا زمین کی کمر کے گرد حائل دور زمین کے سرے میں کہیں غائب ہو رہا ہے۔ سفید بکھنگھم پیلس گھرے سبز لان۔ خوبصورت وسیع ائیر پورٹ۔

ایک خواہش کے مکمل ہونے کی ساعت...... ایک دنیا کا ٹکڑا جو مقناطیسی طاقت سے انسانوں کے دلوں کو اپنی چاہت میں، ڈبو دیتا ہے۔ اور اب میں اس کی اور اپنی کشش کا امتحان لینے آئی ہوں...... دیکھیں کس کو فتح نصیب ہوتی ہے۔ سرخ چھتیں۔ چھتیں ہی چھتیں۔ اور میں ان کی چاہت کا اقرار کرنے کے لیے ان کی طرف کھچی چلی آئی ہوں۔ ارے نہیں...... میں اپنے دل میں شرمندہ ہی ہو رہی ہوں۔ بھلا اس عمر میں میں کسی بھی دوسری چاہت کی متحمل نہیں ہو سکتی ...... اور پھر بے جان اینٹوں کی...... میں دل ہی دل میں مسکراتی ہوں۔ مجھے اپنی فتح کا یقین ہے۔ اس لئے کہ دھوکہ کھانے کے لیے لالچی حرص والی فطرت کی ضرورت ہوتی ہے اور میں زندگی کے کٹورے سے اپنے حصہ کا ایک جرعہ ہی پی کر حال مست ہو چکی ہوں۔

.......O.......

لندن ہائے لندن

''لندن کا ایئر پورٹ آ گیا ہے...... خواتین و حضرات'' اعلان کیا جا رہا ہے۔ میں پھر کھڑکی سے ناک چپکا کر دیکھنے لگی ہوں۔

جہازوں کی قطاریں وسیع میدان جن میں گھاس ہے۔کوئی جھاڑی یا درخت نہیں۔حفاظتی نقطۂ نظر...... چاروں طرف پھیلی ہوئی عمارتیں۔ڈیپارچر لاؤنج...... پیسنجر لاؤنج...... اور نہ جانے کیا کیا۔نرم قالینوں والی راہداری سے سامان کو لگج ٹرالی پر گھسیٹتے ہوئے میں پاسپورٹ چیک پوسٹ کے سامنے رک گئی ہوں...... کیا یہ مجھے روک لیں گے۔کیا یہ میرے ساتھ بد سلوکی کریں گے۔وسوسے پھر سر ابھار رہے ہیں...... میں اتنے توہین آمیز رویئے کو کیونکر برداشت کرسکوں گی...... میں نے تو ہمیشہ ہی اپنے کردار کی حفاظت کی ہے...... کیونکہ میں اپنی نظروں میں سرخرو رہنا چاہتی ہوں...... اپنے ضمیر کی عدالت سے بے گناہی کی مہر ثبت کروانا چاہتی ہوں اور میں ہمیشہ کامیاب رہی اور آج......

کچھ بھی تو نہیں ہوا...... کوئی شک کی نظر...... ایک بے اعتمادی کا جملہ...... کوئی تشویش بھرا سوال......

چلو انہوں نے بھی مجھے قابل اعتماد سمجھا...... پاکستان کا بے ضرر شہری......

اور اب میں لندن کی زندگی میں داخل ہوگئی ہوں۔پیسنجر لاؤنج۔وسیع۔جگمگاتا ہوا۔مختلف ایئر لائینوں کے دفتر ٹرالیوں پر سامان لادنے مسافر...... انگریز میمیں...... گورے صاحب...... ننگی سفید ٹانگیں۔اونچی ایڑی کے جوتے...... لہراتے بال۔

اور ساڑھی پہنے ادھیڑ عمر عورتیں جو دستانے ڈرموں سے بیکار چیزوں کو نکال کر سیاہ بڑے سے پلاسٹک کے تھیلوں میں اکٹھا کر رہی ہیں۔فرش کو گیلے دھاگوں والے برش سے چمکا رہی ہیں...... پگڑیاں پہنے سکھ...... ان کی بیویاں بچے...... انتظار...... اور ابھی...... اور ابھی...... اور اے ایشیائی غمزہ ادھیڑ عمر عورت۔تیری عافیت کے دروازے کس نے تجھ پر بند کر کے تجھے اجنبی سرزمین پر دھکیل دیا۔ان کی آنکھوں میں بے بسی اور دکھ سا ہے،وہ مسکرا نہیں

رہیں۔انہیں میری طرح مسکرانا چاہیئے، میں کتنی چوکسی سے سب چیزوں کو دیکھ رہی ہوں۔ ہر لمحہ میرے لیے ایک نیا انکشاف بن رہا ہے واہ...... واہ کیا کہنے ہیں...... واہ۔ واہ...... لیکن مجھے ان چیزوں پر چھایا تاثر بے چین کر رہا ہے شائد اس لئے کہ پیسہ کمانا مشکل ہے۔ اور وہ اس مشکل کو حل کر رہی ہیں...... اور میں...... میں پیسہ خرچ کرنے آئی ہوں۔ وہ پیسہ جس کو میں نے کمایا...... پھر بھی میرا اس پر حق ہے اور میں اپنے حقوق کی جنگ بھی لڑنا جانتی ہوں...... مجھے روٹی میسر ہے اور مجھے بہت سی باتیں کرتی آتی ہیں، اور انکے لبوں اور ان کی آنکھوں پر چپ کے تالے ہیں اور آنے والے اچھے وقت کی آس انہیں سوچوں میں مبتلا کیئے ہوئے ہے۔

ایک پاکستانی لڑکی اپنے بھائی کے انتظار میں سامان کو میرے پاس رکھ کر بے چینی سے ادھر اُدھر آ جا رہی ہے، مجھے بھی تو کسی جگہ کی تلاش ہے۔ مجھے کسی بھائی نے نہیں لینے آنا اور میں ابنِ بطوطہ بھی نہیں بن سکتی...... کچھ نا کچھ بندوبست ہو جائے گا، یہاں ٹورسٹ کی مدد کرنے کے لیے لوگ ہمیشہ مستعد رہتے ہیں۔

اور پھر ہالینڈ پارک میں بیڈ اینڈ بریک فاسٹ ہوم میں ہمارا بندوبست ہو گیا ہے۔ ''مجھے سارے راستے آتے ہیں۔ آپ فکر نہ کریں۔'' عاشی نے اعتماد بھری تسلی دی ہے اور میں نے لندن کی پہلی جائے پیتے ہوئے اپنے اندر انوکھا سا احساس محسوس کیا ہے...... میں نے زندگی کے ایک لمبے سفر میں سے چند دن چرا کر اپنے ذہن اور جسم کو آرام دینے آئی ہوں...... لیکن ایک تھکا دینے والے سفر نے مجھے نڈھال سا کر دیا ہے...... میرا جسم جو آرام و سکون کا عادی ہو چکا ہے۔ اس ساری تگ و دو کو آسانی سے قبول نہیں کر رہا...... اور پھر یہ بڑا سا ہینڈ بیگ اور اٹیچی۔ ویل کیریئر کی قیمت دس پونڈ ہے۔ یعنی تین سو بیس روپیہ...... لیکن خریدنا تو پڑے گا۔ دو ویل

کیریئر۔ بلا دھچکا۔ ابھی تو میرے پاس اسنے روپے ہیں کہ میں آسانی سے اپنی سہولت کے لیے کچھ بھی خرید سکوں۔ اور یہ چاکلیٹ....... اصلی اور مزیدار....... میں ویل کیریئر کو دھکیلتے چاکلیٹ کھاتے ہوئے سیڑھیاں اتر کر انڈر گراؤنڈ پلیٹ فارم کی طرف بڑھ رہی ہوں....... میرے ذہن میں ہمیشہ فلموں میں اس پلیٹ فارم پر آتی جاتی گاڑیوں کو دیکھ کر خوف کا احساس پیدا ہوتا تھا....... سیاہ سرنگ اور اچانک گاڑی کی روشنی۔ لیکن ان مسلسل چلتی ایکسکلیٹر پر پاؤں دھرنا پلِ صراط پر چلنے سے کم خوفزدہ کرنے والا نہیں....... لیکن بھلا ہو لاہور کے پینوراما سنٹر کا جس میں موجود ایکسکلیٹر نے جس پر میں کبھی کبھار نیچے اترتی تھی مجھے ان سے بالکل غیر مانوس نہیں رہنے دیا تھا....... اوہ....... کم از کم سوفٹ گہرائی تو ہو گی۔ میں سامان کو کیونکر رکھوں....... میں خاموش کھڑی ہوں....... مسافر بے فکری سے نیچے گہرائی میں اتر رہے ہیں....... میں اپنے آپ کو بڑی بے وقوف اور بزدل لگ رہی ہوں....... سامان اور میں۔ بیک وقت۔ ناممکن....... اور پھر ایک انگریز نے میرے سامان کو ہاتھوں میں پکڑ لیا ہے اور میں نے حوصلہ سے چلتی سیڑھی پر قدم رکھ دیا ہے۔

یقیناً اگر ایک خواب زدہ لڑکا ہوتی تو کہانی میں ایک عدم خوابوں کی شہزادی جیسی خوبصورت ہیروئین کی انٹری کا سنہرا موقعہ تھا....... لیکن قدرت نے مجھے عورت بنا کر اور وہ بھی مشرقی عورت بنا کر جو اپنے چار عدد جوان بچے پیچھے چھوڑ کر آئی تھی، اس نادر موقعہ کو میرے ہاتھ سے گنوا دیا اور پھر ایک گہرائی میں اترتی سیڑھیاں اور خوبصورت پلیٹ فارم۔ جس کے دونوں طرف اندھیرے کی غاریں منہ کھولے ہمیں جھانک رہی ہیں۔ اتنا گہرا اندھیرا....... جس میں جھانکنا بھی مشکل لگ رہا ہے اور میں وقت کے اس شٹل میں داخل ہونے والی ہوں اور پھر تیز گھومتا دائرہ دس میں میرا وجود لامکاں میں داخل ہو جائے گا اور نئی نئی دنیا میرے استقبال کو آگے

بڑھیں گی.......اور.......اور.......میں دھڑ ادھڑاتی گاڑی کی آواز سن کر ادھر جھانک رہی

ہوں۔ گاڑی رک گئی ہے۔ خودکار دروازے....... تیز اور تیز....... بھاگو نہیں تو وقت چال

چل جائے گا اور میں بند دروازے کے اندر کھڑی اور ہیتھرو ایئر پلیٹ فارم نمبر چار بالکل سنسان

ہے۔

پیکاڈلی لائن....... ارل کورٹ کا پلیٹ فارم....... بہتر تر....... خودکار دروازہ اوپر جاتی

سیڑھیاں....... میں نے اپنی چند کتابوں کو آتے وقت بیگ میں ڈال لیا تھا....... آخر میں

ادیبہ ہوں.......اور خود کو بھولنا آسان نہیں ہوتا.......اور میمونہ انصاری کی چند کتابیں.......

لیکن ان چند کتابوں کا بوجھ....... ناقابل برداشت ہے۔ اور پھر سیڑھیوں سے اتارنا

چڑھنا....... کیا مصیبت ہے۔ کیا بے وقوفی ہے۔ میں اپنی کتابیں تو لائی تھی ۔

لیکن....... چھی....... چھی....... اتنا کم حوصلہ....... میں اپنے آپ کو سرزنش کر رہی

ہوں۔ ارل کورٹ سے ڈسٹرکٹ لائن....... دوسرا پلیٹ فارم....... سامان....... میں اپنے

تاثر کو خراب ہرگز نہیں کروں گی۔ نوٹنگ ہل گیٹ....... سنٹرل لائن....... طویل راہداری

کے دونوں طرف چسپاں اشتہارات .... فلم کے بورڈ....... کیو گارڈن....... فیملی

پلاننگ پلز....... تھیٹر....... شراب....... برگر....... اور میں ٹائل والے فرش پر جلدی

جلدی چل رہی ہوں۔ اور پھر سنٹرل لائن پر گاڑی میں سوار ہم دوسرے سٹیشن پر اتر گئے

ہیں ہالینڈ پارک .... تیز سیٹی .... لفٹ لوگوں کو پکار رہی

ہے۔ سامان....... ٹریول....... لائٹ....... بیوقوف خود پسند ذہن....... لفٹ اوپر اٹھ

رہی ہے....... اور پھر لندن کی ٹھنڈی ہوا نے میرا سواگت کھلے بازوؤں سے کیا....... اف

.... اوہ لاہور میں کتنی گرمی تھی....... جی اور جان کو جلانے والی....... خدا کا شکر ہے یہاں

موسم قدرے خوشگوار ہے۔۔۔۔۔۔ لیکن اتنا سرد تو نہیں کہ صرف سوتی بدصورت کپڑوں میں اپنے آپ کو قید کر لی جائے۔ ارے میرے پاس اتنے اچھے اچھے کپڑے تھے۔ راہ کیسی لگوں گی سوتی کپڑوں میں۔۔۔۔۔۔ میں ذہن میں اپنا جائزہ لے رہی ہوں۔ خاک لگوں گی۔۔۔۔۔۔ بھلا اس عمر میں سوتی کپڑوں میں کیسا لگا جا سکتا ہے۔ حالانکہ مجھے سوتی کپڑے بے حد پسند تھے۔ لیکن پھر بدلتے ذہنوں نے سٹیٹس سمبل بھی بدل ڈالا اور میری پسند کو بھی اور ریشمی کپڑے جسم کو زیادہ سمارٹ بنا دیتے ہیں۔۔۔۔۔۔ بالکل۔۔۔۔۔۔ بالکل۔۔۔۔۔۔ میں اسی بات کو مانتی ہوں۔۔۔۔۔۔ لیکن یہاں تو واقعی سردی ہے۔۔۔۔۔۔ ریشمی شلوار میں میری ٹانگیں ٹھنڈی ہو رہی ہیں۔

خدا کا شکر ہے ہالینڈ پارک انڈر گراؤنڈ ریلوے سٹیشن سے دوسرا گھر ہی ہمارا ٹھکانا ہے۔۔۔۔۔۔ سامان گھسیٹنا کتنا جان جوکھوں کا کام ہے۔

اور انسان صدیوں سے یہ کام کرتا آ رہا ہے۔ وہ محنت کش جو روزی رساں کے حضور اپنی محنت کی کامیابی پر شکر گزار رہتے ہیں۔۔۔۔۔۔ اور نان جویں کے لیے تاروں کی چھاؤں میں ہل چلاتے۔ ٹھنڈے موسموں میں کھیتوں کی رکھوالی کرتے اور پھر اپنے مقدر پر شاکر رہتے ہیں۔ لیکن پھر گزرتے وقت نے ناشکری کے جرثومے کو انسان کے خون میں داخل کر دیا۔۔۔۔۔۔ ہتھیار ایٹم بم۔ راکٹ۔ کلاشن کوف۔ گولیاں۔ بندوق۔ نشہ۔ ہتھیار کی سمگلنگ۔ بے گناہوں کا خون۔ باقی رہے نام اللہ کا۔

اور میں کمرے میں آ کر کمپلیمنٹری رکھی ہوئی چائے اور دودھ کے پیکٹ کھول کر ککنگ رینج پر چائے بنا کر پینے لگی ہوں۔ چوبیس پونڈ ہر رات کا کرایہ۔ میرے خدا۔۔۔۔۔۔ چائے میرے حلق کے اٹکنے لگی ہے اور یہ چائے جو میں پی رہی ہوں۔ بتیس روپے کی کم از کم پڑتی ہے، میں نے کپ کو میز پر رکھ دیا ہے لیکن مجھے آگے نہ جانے کیا کیا برداشت کرنا پڑے گا۔۔۔۔۔۔ میں سے

بس ہوں....... ٹائم ٹیبل کا ابھی تو سرا ہی ہے۔

شہر میرے سامنے اپنے چہرے کو بے نقاب کئے مجھے اشارے کر رہا ہے....... میں مبہوت بچوں جیسے تجسّس سے دیکھ رہی ہوں....... کمرے کی کھڑکی سے جھانک کر نیچے سڑک پر گاڑیاں تیزی سے آ جا رہی ہیں لندن کی گاڑیاں۔ انگریز لوگ....... تاریخ کا بڑھاپا سڑک کی عمارتوں کو ایک سنجیدگی عطا کر رہا ہے....... اور میں انہی کی دید کے لیے تو حاضر ہوئی ہوں۔

حاضر ہوں میرے آپقا....... ہشت نہیں ہم نے آقاؤں کی قباؤں کو تار تار کر دیا۔ ہم نے ان کے قدموں تلے سے اپنی زمینوں کو اپنی فگار انگلیوں سے انچ انچ کھینچ لیا....... ان کی راہیں ماؤں کے آنسوؤں سے پٹ گئیں۔ اور ان کی راتیں ہماری پہچان کی چیخوں سے بے خواب ہو گئیں....... اور ہم نے آزادی کی پوری پوری قیمت چکائی۔ اور ہمارے آبلہ پا وجود خون کی ندیوں میں تیرتے رہے لیکن ہم اپنی منزل کی طرف بڑھتے رہے یہاں تک کہ فتح کے بگل ہمارے اعصاب اور احساسات کو پر سکون کرنے لگے اور ہمیں اپنے ہونے کا مکمل یقین ہو گیا۔

اور ابھی ابھی جس مرد نے میرا سامان اٹھا کر تیسری منزل کے کمرے میں رکھا ہے وہ انگریز ہے اور ان کی بیوی جو صبح کو ہمارا ناشتہ تیار کرے گی بالکل میموں جیسی تھی....... اور اس کا بچہ جس کا چہرہ پوپائے واسیلر سے ملتا جلتا ہے ہمیں بڑی توجہ سے دیکھ رہا تھا....... ہاہا....... ہاہا....... اور میں کتنی تسکین محسوس کر رہی ہوں کہ میری جیب بھاری ہے اور اس پیسے کو حاصل کرنے کے لیے انہیں ہمارے بستر بچھانے ہوں گے۔ ہمارا کمرہ صاف رکھنا پڑے گا اور میں لیکن میں انہیں ٹھوکر نہیں مار سکتی....... اور آج کا انسان اتنا باشعور ہو چکا ہے کہ وہ اپنے حقوق کو پہچانتا ہے....... میرے گھر کا خانساماں اپنے پیٹ کا ملازم ہے اور بوڑھی جمعدارنی کو معلوم ہے کہ امیر لوگ دو ماؤں کے بطن سے جنم لیتے اور یہ کہ سب انسان عزت میں برابر ہیں....... اور

انسان کی تحقیر کرنے والے خدا کی تحقیر کرتے ہیں۔ اور میں تو خدا کی ایک ادنٰی سی بندہ ہوں....... فاصلوں کی اتنی دوری کو حفاظت سے پاٹنے والا رہی تو ہے....... اور میں صرف اس کی ہی عبادت کرتی ہوں اور وہی مجھے اس اجنبی ملک کی اجنبی راہوں پہ اپنی حفاظت کی روا میں بہت وسوسوں اور مصیبتوں سے بچا کر چھپالے گا۔

میں ہالینڈ پارک کے انڈر گراؤنڈ سے پھر ریل پر سوار ہو رہی ہوں۔ سب خوبصورت عورتیں کس قدر ملتی جلتی سی لگ رہی ہیں۔ سنہرے بال، میک اپ سے بنا ہوا خوبصورت چہرہ، تنا ہوا جسم۔ لگتا ہے ایک ہی سانچے میں ان سب ڈھال کر نکالا گیا ہے....... وہ خاموش اپنی کتابیں اور اخباریں رسالے کھرلے پڑھنے میں لگے ہوئے ہیں....... باشعور قوم....... وہ کیوں ایک دوسرے کی موجودگی سے آگاہ نہیں ہو رہے....... شاید انہیں کسی دوسرے کی ضرورت ہی نہ ہو۔ اور ہم لوگ۔ جب تک ایک دوسرے کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ نہ جائیں سکون ہی نہیں پاتے....... لیکن ذہنی بالیدگی کے لیے پڑھنا ضروری ہے۔ تعلیم نئے افق طلوع کرتی ہے، ہم جانتے ہیں، اوے ہمیں بتانے کی ضروری تو نہیں....... لیکن ہمارے ہاں کتاب بکتی نہیں....... آخر کیوں....... ش شائد ہمارے ہاں فاصلے کم، راستے مختصر اور لوگ متواضع ہیں....... میرا ذہن نہ جانے کیوں ہر سات کو اپنی ہی کسوٹی پر رکھتا جا رہا ہے۔ کبھی ہم کم عیار ثابت ہوتے ہیں، کبھی پورے اترتے ہیں۔

میں نے سامنے بیٹھے لڑکے کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی اخبار کی سرخی کو پڑھا ہے....... بیکار....... اخبار میں کچھ بھی نہیں ہوتا....... لیکن وہ پڑھ تو رہے ہیں....... میں اپنی آنکھیں کھلی رکھوں گی۔ میں سوچ رہی ہوں اور جو میں دیکھ رہی ہوں وہ بہت دلچسپ تو نہیں۔ چند لڑکوں نے کانوں میں بالیاں پہن رکھی ہیں....... ایک پیاری سی لڑکی کی جبین بہت ہی

نامناسب جگہ سے پھٹی ہوئی ہے ہائے بے چاری...... میں نے سوچا تھا انگریز قوم خاصی خوش حال زندگی بسر کرتی ہے...... میرا دل اس کی حالت زار پر پسیج رہا ہے لیکن ان سب کے چہروں پر اپنی تمام صباحتوں کے ساتھ رقصاں لگ رہی ہے، وہ زندہ لگ رہے ہیں۔ اور زندگی کا یہ انداز بھی تو ہے، جسمانی آگہی کی لذتوں کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹنا...... اور خدا نے جسم بنایا اور انسان کو اس کا مالک بنا دیا اور اب وہ خدا کی دخل اندازی کو بھی کیوں برداشت کریں...... شخصی آزادی ہر معاشرتی اور اخلاقی بندھنوں سے آزاد...... میں نظریں جھکا لیتی ہوں...... مانوس ہونے میں کچھ تو وقت لگے گا...... لیکن اللہ باحیا ہے اور وہ حیا کو پسند کرتا ہے۔ لیکن یہ مقولہ انورں نے نہیں پڑھا شائد...... اور پھر ٹوٹے گھر...... اور یہ بچے بکھری کرچیاں ہیں جو جذبوں کی دھار پر اپنے آپ کو بھی مجروح کر لیتے ہیں۔ خود اذیتی۔ خودلذتی کی دنیا۔ جنس کی دنیا۔ جنسی آلودگی کی دنیا...... لیکن اپنے اقرار کی دنیا۔ بابا آدم اور اماں حوا کی دنیا۔ لڑکا اور لڑکی آمنے سامنے بیٹھے تیزی سے اپنی اپنی یاترا کی باتیں ایک دوسرے کو سنا رہے ہیں اور پھر بے اختیاری کا ایک آزاد لمحہ...... روزمرہ کا کھیل اور یہ کھیل خاموش بیٹھے پڑھنے میں مصروف لوگوں نے بھی تو کھیلا ہوگا ایسا ہوتا ہی ہے اور اب...... ٹھہراؤ اور سہج کا وقفہ۔ کوئی جوان عورت کسی جوان مرد کو لبھانے کے لیے انداز کے تیز نہیں چلا رہی۔ مرد ضرورت سے زیادہ خاموش اور آنکھیں جھکائے بیٹھے ہیں اور عورتیں پر اعتماد سر اٹھائے سامنے راستوں کی نشان دہی کرنے والے نقشوں کو بغیر ضرورت پڑھ رہی ہیں، ایک دوسرے کی موجودگی سے لاتعلق۔ جسم کے قرب کی آنچ سے بے خبر۔

میں دیکھ رہی ہوں۔ خاموش بیٹھی گاڑی کے پہیوں کی تیز آواز کو سنتی۔ میں وقت کے اس لمحہ میں رک گئی ہوں جہاں ساری حرکتیں میرے لیے ساکت ہوگئی ہیں۔ مجھے کہیں نہیں جانا...... جانا

تو صرف وقت کو ہے۔ اور میں اس جوڑے پر بھی کوئی توجہ نہیں دے رہی جو بوسیدہ لبادے اوڑھے بوسیدہ جوتوں میں پھٹی جرابیں پہنے ادھڑے ہوئے سویٹروں کو اوپر نیچے چڑھائے بڑے خلوص سے مصروفِ گفتگو ہے، ان کی آنکھیں بڑی چاہت سے ایک دوسرے میں جھانک کر مسکرا رہی ہیں، ان کے کئی دنوں کے دھلے چہلے ایک دوسرے کی بدصورتی کو دیکھ نہیں پا رہے۔۔۔۔۔۔ وہ ان سب لوگوں میں جو وہاں موجود ہیں۔ انوکھے لگ رہے ہیں۔

لیکن ان کے چہروں کی مسکراہٹ ہر لمحہ نئی لگ رہی ہے۔ کوئی کسی کو نہیں دیکھتا۔ اور کوئی مجھے بھی نہیں دیکھتا۔ اپنے آپ کو اس بے وزنی کی حالت میڈ دیکھ کر مجھے خوش ہونا چاہیئے۔۔۔۔۔۔ لیکن مجھے اپنا آپ عجیب لگ رہا ہے۔ جیسے آپ کچھ نہیں۔ کوئی نہیں۔ لے حقیقت اور بے وقعت۔ گردش زمانہ کا بے مایہ ذرہ۔ میں نے ہنسنا چاہا۔ لیکن اپنے آپ پر ہنسنا میرے لیے بے حد مشکل ہو رہا ہے۔ میں میں ہوں۔ سائرہ ہاشمی۔۔۔۔۔۔ مسز یعقوب۔۔۔۔۔۔ ایک ماں۔۔۔۔۔۔ اور پھر میرے بطون کی ایک اپنی دنیا جس کی میں تنہا فرماں روا ہوں۔ اس میں کوئی دخل نہیں دے سکتا۔ لیکن یہاں تو۔۔۔۔۔۔ ڈیم ود دِس شخصی آزادی۔۔۔۔۔۔ میں میں ہوں۔۔۔۔۔۔

وکٹوریہ سٹیشن۔ مختلف شہروں کو جاتی لندن ریلوے۔۔۔۔۔۔ مختلف شہروں کو جاتی لندن ریلوے۔۔۔۔۔۔ ہنگامہ ویمپسی کا روشن ریسٹورن۔ خوبصورت دکانیں۔ پھولوں سے لدی کھڑکیوں والا شراب خانہ۔۔۔۔۔۔ یہ پہلا شراب خانہ ہے جو میں نے زندگی میں دیکھا ہے۔ نہایت ان ایمپریسو۔ بھلا شریفانہ انداز سے جھاگ اڑاتی زرد شراب پی کر اور تمیز سے باہر نکلنے میں کون سے مے خانے والی روایت باقی رہتی ہے، یہاں ساقی اور مے کشی کے مضامین کا فقدان تو ہوگا ہی۔۔۔۔ خوباں کو چھیڑنے کے بہانے تراشنے میں خاصی دشواری ہوگی۔ اور جبکہ آپ کو گاڑی پکڑنے کی بھی جلدی ہو۔ میں تو ڈکن اور ہارڈی کے زمانے کے شراب خانوں کو دیکھنے کی

خواہش کو یوں مرتا ہوا دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ ہاں ان خوبصورت میموں کی دید سے کام چلایا جا سکتا ہے جو نہ جانے کیوں تیز تیز بھاگتے قدموں سے انڈر گراؤنڈ ریلوے کی سیڑھیوں کو پھلانگتی آ جا رہی ہیں۔ ویمپسی کا برگر۔ لمبی لائن۔ پیسٹ کی طلب۔ بھئی یہاں سب کچھ اپنی گرفت سے باہر اور بے قابو ہے۔۔ شرافت سے کھڑے رہیئے۔ ہر کوئی آپ کی طرف دیکھتے ہوئے یہی کہتا لگتا ہے.......

میں ایک کونے کی میز پر بیٹھ کر پہلی بار لندن کی کرنسی کا بوجھ اٹھائے حیران ہو رہی ہوں۔ پچاس پینی کا کونے والا سکہ بیس پینی کا ننھا سا اور یہ رہی دس پینی کا بالکل ہمارے گول روپے جیسا اور یہ سرخ تانبے کا سکہ دو پینی اور ایک پینی۔ اور میرے کوٹ کی جیب بھاری ہو کر لٹکنے لگی ہے.......

اور یہ موٹا سا پیتل کا ایک پونڈ۔ میرے خدا....... ان کے پاس دھات کی کانیں یقیناً بہت ضرورت سے زیادہ ہی ہیں۔ میں ٹیلی فون کارڈ خریدنے جا رہی ہوں....... چار پونڈ۔ ارے اتنے روپے لیکن پاکستان دور ہے اور مجھے خیریت کی اطلاع ضرور دینی ہے نہیں تو وسوسوں کے انبار گھر والوں کو پریشان کریں گے جن میں سے سب سے بڑا وسوسہ تو جہاز کا کریش ہے اور دوسرا اغواء اور تیسرا میری کوئی اپنی بیوقوفی جس کا میرے نزدیک تو کوئی امکان نہیں لیکن میرے شوہر کے نزدیک سب سے بڑا امکان وہی ہے۔ میں اپنی عمر کے بوجھ کو نہ جانے کتنے برسوں سے اٹھائے زندگی کی راہ کی اونچ نیچ سے بچتی لمبی راہ طے کر چکی ہوں۔ لیکن میرے شوہر سمجھتے ہیں کہ یہ صرف ان کی موجودگی کی برکت ہے جو میں آج تک کسی حادثہ سے دوچار نہیں ہوئی....... مرد کا احساسِ تفاخر....... اور امر واقعہ تو یہ ہے ہم مشرقی عورتیں ہمیشہ اپنے شوہر کے قدموں کو نشانِ راہ بنا کر ہی تو زندگی گزارتی ہیں۔ اور تحفظ کا احساس ہمارے اندر ایک بزدلی پیدا کر دیتا ہے۔ کوئی ہے جو ہمیشہ ہمارے لیے راہ کے کانٹے چننے کو تیار رہے، ہماری خواہشوں کو

پورا کرنے کے لیے اپنے آپ کو محنت کی بھٹی میں جھونک دیتا ہے تا کہ ہم ہمیشہ مسکرا سکیں۔ اور یہ میرے سامنے جاتے قدم اس مرد کے ہیں جو میری زندگی کا محور ہے اور میں فون کارڈ کو شیلی فون کے بوتھ میں ڈال کر فون کی بجتی گھنٹی کو سن رہی ہوں۔ گھنٹی کی آواز اس گھر کے مکینوں کو اور مجھے مشترکہ سنائی دے رہی ہے اور ہم اس آواز سے بندھے فاصلوں کے باوجود بھی نزدیک ہیں۔

وہ سب میرے دل کے قریں اور میں ان کی یادوں اور باتوں کا مرکز...... ہیلو...... ہیلو...... امی ہاں فیصو کیسے ہو بیٹے...... اچھا ہوں۔ لیجیئے ابو سے بات کیجیئے...... خیر سے پہنچ گئے تم لوگ...... جی...... طبعیت کیسی ہے بالکل ٹھیک۔ اور مدھو کہاں ہے ارے مدھو یہ تم پانچ بجے ہی آج ہسپتال سے گھر کیسے آ گئیں...... خیریت تو ہے وہ زور سے ہنستی ہے امی یہاں رات کے دس بج رہے ہیں...... ارے ہاں...... اور ہمایوں اور مونا کیسے ہیں اور ٹیلی فون کا وقفہ ختم ہو جاتا ہے...... نامکمل گفتگو۔ لیکن میں خوش ہوں چودہ پندرہ تاریخ کے درمیان پوری رات اور ایک دن کا فاصلہ ہے اور مجھے عجیب لگ رہا ہے کہ میں جوان سے کبھی اتنی دور نہیں گئی تھی۔ زمین کی اتنی دوری پر کھڑی ہوں کہ چاہوں بھی تو لمبا سفر کیئے بغیر نہیں پہنچ سکتی۔ مجھے عجیب سا احساس ہو رہا ہے۔ جیسے میں ان سے بچھڑ گئی ہوں۔ اف کتنی تکلیف دہ سوچ ہے، میں سر کو جھٹکتی ہوں۔ چند دن بعد پھر بات کروں گی...... دکانیں بند ہو رہی ہیں......

لوگ ہجوم در ہجوم سٹیشن کے اندر داخل ہو رہے ہیں، وہی خوبصورتیوں، بدصورتیوں، محبتوں، ضرورتوں، بڑھاپے اور جوانی کا امتزاج...... تو یہاں زندگی یوں اپنے آپ کو بھگا رہی ہے۔ بوڑھی عورتیں بھاگ رہی ہیں، ادھیڑ عمر مرد بھاگ رہے ہیں۔ ٹورسٹ بھاگ رہے ہیں...... اور رکٹوریہ جنکشن پر بسوں پر سوار ہونے کے لیے زیادہ تر ادھیڑ عمر جوڑے لمبی قطار میں کھڑے اپنی اپنی باری کا انتظار کر رہے ہیں۔ کوئی جلدی نہیں۔ ہم سب اپنی منزلوں کی طرف

رواں ہیں۔ ہم تفریح کے لیے جا رہے ہیں۔ حیات کا سفر تھکا ڈالنے والا ہے اور فرصت کا یہ لمحہ ضائع توانائیاں کو واپس لے آتا ہے وہ اکثر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے باتوں میں مصروف ہیں...... زندگی پر یقین کئے ہوئے۔ اور میں جانتی ہوں ہم ایشیائی لوگ زندگی سے زیادہ موت کے منتظر رہتے ہیں۔ ہم زندگی سے خائف اس کی خوبصورتیوں کے ادارک سے محروم لوگ مجھے ان کا وہاں ساتھ ساتھ کھڑے ہونا اچھا لگ رہا ہے۔ مجھے اپنا کھڑا ہونا اچھا لگ رہا ہے۔ ہاں زندگی کی بخششوں کو فراخ دلی سے قبول کرنا چاہیئے۔

بازار بند ہو گیا ہے چند ریسٹورن کھلے ہیں۔ وہ بھی بند ہو جائیں گے۔ ارے میں کیا کروں گی...... ایک لمبا سفر واپسی کا...... کچھ وقت تو گزر ہی جائے گا...... انڈر گراؤنڈ ریلوے قسمت کی لکیر کی طرح ہر لندن میں رہنے والے شخص کی ہتھیلی پر کھد گیا ہے۔

روشنیاں ابھی بھی آسمان کو منور کئے ہوئے ہیں۔ بھلا یہ بھی کیا تک ہے سرِ شرم بازاروں کو ویران کر دیا جائے...... دکاندار اور کارندے انسان ہیں اور پھر وہ تمام دن ایمان داری سے ڈیوٹی کو سنبھالتے نبھاتے نڈھال ہو چکے ہیں اور پھر واپسی کا لمبا سفر۔ اور گھروں کو پلٹنے کے لیے کسی قصبے کے باہر ان کی گاڑی منتظر ہو گی۔ اور ایک گھر ان کو خوش آمدید کہے گا۔ اور وہاں کون ہو گا...... بھئی ایک گھر جو خالی بھی ہو سکتا ہے اور اس میں بیوی بچے بھی ہو سکتے ہیں۔ شوہر یا بوائے فرینڈ بھی آپ کو خوش آمدید کہہ سکتا ہے...... یا پھر وہ مہمان عزیز جو آپ کے ساتھ رات گزارنے کی تمنا رکھے...... اور آپ اکیلے بھی رہ سکتے ہیں...... اپنی آزادی کی دوسراتھ کے ساتھ۔

ٹرینوں کے ڈبے کھچا کھچ بھرے ہوئے ہیں...... ایکسکلیٹر انسانی جسموں سے اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر جاتی آبشار کی مانند بہہ رہے ہیں...... ایڑیوں کی ٹک ٹک ایک مسلسل اونچی

تال ہے جو کانوں پر بھاری گزر رہی ہے....... لیکن زندگی کا ترانہ بج رہا ہے....... ہم زندہ ہیں اور میرے گھر کے کمروں میں میے بچے بستروں پر لیٹے میٹھی نیند سو رہے ہوں گے۔ سہانے خواب ان کو سفر کے انجانے راستوں پر لے جائیں گے۔ لیکن یہاں میں ایک ہجوم کا حصہ بنے کھڑی زندگی کا تماشا دیکھ رہی ہوں۔ زمین ایک ہے۔ آسمان ایک ہے۔ لیکن اندھیروں اجالوں کا چکر مجھے اور انہیں مختلف کیفیتوں سے گزار رہا ہے اور پندرہ ستمبر کا دن اپنے اختتام کو پہنچنے والا ہے اور جب میں سو کر اٹھوں گی تو اگلے دن کا سورج آسمان کے بیچوں بیچ میرے گھر کی چھت پر روشن ہو گا اور میرے صحن کے گلاب مسکرا رہے ہوں گے اور میرے بچے اور شوہر اپنی اپنی مصروفیات میں الجھے وقتی طور پر مجھے بھول جائیں گے....... لیکن میرا بیٹا فیصل سکول کے کلاس روم میں بیٹھا ضرور سوچ رہا ہو گا۔ امی کتنی خوش نصیب ہیں۔

مجھے کہاں جانا ہے....... پورا شہر میرے بازوؤں کے اطراف میں پھیلا ہوا ہے۔ میں کہیں سے بھی اپنا سفر شروع کر سکتی ہوں۔ میں نے گاڑی کو مضافاتی قصبے کی طرف بھاگتے دیکھ کر سوچا ہے۔ مکان....... سبزہ....... چھتیں....... سڑکیں....... لوگ....... زندگی کی حدیں متعین نہیں کی جا سکتی....... پھیلاؤ....... دائرہ در دائرہ.......

تو یہ ایلپٹن کا قصبہ ہے....... اور یہاں ہندو عورتیں ساڑھی باندھے۔ ماتھے پر کم کم سجائے آ جا رہی ہیں.......۔ ہندوستان کی ساڑھیاں ہیما مالنی جیسی شکلوں والے بے جان بت۔ تمکسار کرتی ساڑھی کے اوٹ سے جھانکتی آنکھیں لیکن ہمارے پاکستانی روپے حساب قیمت بے حد زیادہ....... اور یہ معمولی بیگ جو لاہور میں پچاس روپے سے زیادہ کا نہیں....... پانچ سو کا....... اللہ اللہ....... لوٹ کے انداز۔ ہندو بنیا۔۔ کمانا اور جمع کرنا جانتا ہے۔ اگر ہمارے ملک کی سرحدیں ان کے مال کے لیے کھول دی جائیں تو ہماری معیشیت کا جنازہ نکل

جائے۔۔۔خدا کا شکر ہے ایسا نہیں ہوا۔لیکن یہ قصبہ تو ہندو معاشرت کی پوری پوری عکاسی کر رہا ہے۔ ہر طرف عورتیں....... سودا سلف خریدتی....... سر کو ساڑھی کے پلو سے ڈھانپے بوڑھی۔ادھیڑ عمر عورتیں۔دکانوں پر کھڑی مغربی طرز کا لباس پہنے گجراتی عورتیں۔اپنے شوہر کی مدد کر رہی ہے تو جوان لڑکیاں سکرٹ پہنے سکول بس سے اتر رہی ہیں....... ایلپٹن کی مسجد۔ چھوٹے سے گنبد۔لیکن اپنی موجودگی کا اظہار کرتی ہوئی....... میں رہاں جا کر اسے دیکھنا چاہتی ہوں۔ارے یہ تو بند ہے....... پھر سہی....... ہاں میں نے پڑھا تھا کہ لندن کے مسلمان اس احساس سے پریشان ہیں کہ ان کی آنے والی نسل اسلام سے بے بہرہ ہو جائے گی۔اگر انہوں نے انہیں اپنی روایات سے غافل رکھا۔لیکن کیا ہمارے یورپ کی تہذیب میں پرورش پانے والے بچے اپنے آپ کو یوں آسانی سے بے نام اور بے وجود بنانے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔کیا وہ صرف دکانوں پر کام کرنے انڈر گراؤنڈ ریلوے میں سفر کرنے اور کسی انگریز لڑکی یا لڑکے کے بازو پر جھول جانے کو ہی کل کائنات سمجھ لیں گے، ہاں تو....... وہ قصور وار نہیں۔قصور تو ان کے ماں باپ کا ہے جو خود بھی جڑوں سے اپنے آپ کو قطع کر کے زندگی کی چند آسائشوں کے ہاتھوں فروخت کر چکے ہیں اور اب....... عمل مکافات پچھتاوا....... تدارک....... بھاگو کہ وقت چال قیامت کی چل گیا۔شہ مات....... ہار ہی ہار....... صرف روٹی کے ٹکڑوں....... ٹھنڈی بے گرد فضا اور کچھ سہولتوں کے لیے....... احساسات کے بے گیاہ صحرا میں سفر کرتے کرتے اب ان کے قدم جھکنے لگے ہیں اور پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر جسم کو خم دے کر بالوں کو جھٹک کر تیزی سے انگریزوں کے لہجے میں انگریزی بولنے کی قیمت بہت زیادہ ہے میرے بھائی۔آپ اپنے مطلب کو کسی بھی زبان میں ادا کر سکتے ہیں اور پھر آپ حقیقتوں سے پردہ کیوں نہیں اٹھاتے....... اور کیا پاکستان میں انگریزی زبان

بولنے والے نہیں بستے....... ہیں بھئی ہیں....... اور ہماری اونچی سوسائٹی کے افراد بہترین انگش لہجے میں گفتگو کرتے ہیں۔ بہترین تراش خراش کے سوٹ پہنتے ہیں اور ہمارے بچے۔ صرف ان کو آزادی سے گرل یا بوائے فرینڈز بنانے کی اجازت نہیں۔ تو کیا ہے۔ زندگی میں کوئی نا کوئی تو آتا ہی ہے جو ہمیں چاہتا اور ہماری چاہت کو قبول کرتا ہے اور ہمارے بچے بھی اس چاہت سے محروم نہیں رہیں گے۔ ان کی زندگی خوشیوں کے گہوارے میں جھولے گی۔ لیکن وہ بے وطنی اور بے جڑ پودے نہیں کہلائیں گے....... میں جذباتی ہو رہی ہوں....... میں افسانہ نگار ہونے کے سبب زیادہ ہی سوچوں کی بھول بھلیوں میں الجھ گئی ہوں....... نصیحت کرنے کی عادت ہر بزرگ میں ہوتی ہے اور میں بھی نصیحت ہی تو کر رہی ہوں....... حالانکہ آج کا نوجوان ہر نصیحت سے بالا ہے۔

میں جس خوشی کی جستجو میں یہاں آئی ہوں کیا وہ مجھے ملی....... میں اپنے آپ کو سوچ کی صلیب پر لٹکا رہی ہوں....... نہ جانے میں کیسی خوشی کی تلاش کرنا چاہتی ہوں۔ میری ٹانگوں میں بل اور دل میں امنگیں مدھم پڑ چکی ہیں۔ سب کچھ اس قدر نیا اور انوکھا تو ہے لیکن میں ہی وہ نہیں جو ہر نئی چیز کی طرف لپک اٹھے۔ حالانکہ ہر نئی چیز کی طرف لپک کر بڑھنے والے زندگی کے ایک لامتناہی لطف میں ڈوبے رہتے ہیں....... نئی دنیاؤں کی دریافت، سائنس میں نئے افقوں کی تلاش، کیمسٹری میں انسانی دکھوں کا علاج، اور پھر اور آگے....... اور آگے....... لپک ایک شعلہ ہے جو مدام بڑھکتا رہتا ہے جو بھسم بھی کر سکتا ہے اور نور بھی بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

میں خوبصورت گھروں کو دیکھ کر ایک چھوٹے سے گھر کی خواہش کو اپنے دل کے اندر بڑھتے دیکھ رہی ہوں....... ایک بنگلہ بنے نیارا....... جس کی کھڑکی میں جالی کے سفید پردے ہوں گے جس کے چھوٹے سے لان میں بہار کے پھول کھلیں گے اور پھول میری کمزوری ہیں

خوبصورتیاں مجھے اپنی طرف کھینچنے لگتی ہیں۔...... میں کسی سے ایک مکان کی خریداری کے لیے
معلومات حاصل کرنا چاہتی ہوں...... جائداد کے معاملہ میں یہاں بھی فراڈ ہوتے ہیں
پراپرٹی ڈیلر حضرات یہاں بھی پاکستان سے دس گناہ زیادہ مکار اور فریبی ہیں، کوئی کسی کو کچھ نہیں
دیتا۔ الٹا خریدار قرض میں جکڑا جاتا ہے جو سود پر سود بڑھ کر آخر کار مکان کی فروخت پر ختم ہوتا
ہے اور یوں خریدار خالی جامن کو جھاڑتا بلکہ دامن سے آنسو پونچھتا اپنی راہ لیتا ہے۔

لیکن...... میری بیٹی شائد پڑھنے کے لیے آئے۔ میں ایک خواب کے ٹوٹنے کی صدا سے
پریشان ہو کر احتجاج کرنا چاہتی ہوں۔ ہوسٹل سب سے بہتر ٹھکانہ ہے طالب علم کے
لیے...... اسے وہاں بھیجئے آرام سے رہے گا...... یہ دنیا پونڈ کی دنیا ہے یہاں بھی کاروباری
بے ایمانیاں ہوتی ہیں......

شکستِ خواب...... بے ضرر خواب کی کرچیاں اعتماد کا جنازہ...... یہاں اکیلا رہا جا سکتا
ہے...... کوئی فکر نہیں...... خوبصورتیوں کا نقاب اوڑھے یہ شہر آخر کار اپنے اندر بھی ناسور
پالتا ہے۔ لیکن ہم صرف باہر کے ظاہری جلوؤں میں الجھ کر رہ جاتے ہیں اور پھر کوئی بتائے بھی
کیونکر، آپ اپنے خوابوں کے جزیرے کی بے حرمتی کرنا پسند نہیں کرتے...... اور یہ بھی تو ہے
آپ اکیلے ہی کیوں دھوکہ کھائیں۔ اوروں کو بھی زخمی ہونا چاہیئے۔ تسکینِ قلب...... یہاں
باہمی انسانی رشتوں کی بجائے پونڈ سے دوستی گہری ہے، ایک پونڈ جو آج کل بتیس پاکستانی
روپے دیکر لیا جاتا ہے اور یہاں رشتوں کو پونڈ کی چھری سے قطع بھی کیا جا سکتا ہے۔ آپ کی
محبت ایک پونڈ کے برابر بھی وزنی نہیں۔ آپ اگر اپنی محبت کو ایک پونڈ کے بدلے میں بیچنا
چاہیں گے...... رشتوں کے بندھن کا طعنہ دیں گے...... اپنی چاہتوں کو یاد دلوائیں گے تو
بھی یہ سب کچھ بے وقعت ہے جائیے صاحب جائیے۔ مجھے آپ کی ضرورت نہیں کیونکہ ایک

پونڈ میں بتیس روپے ہیں اور آپ....... ہنسی اور خود غرضی....... اور پھر یہاں آ کر پاکستانی رشتوں کی کوئی وقعت نہیں رہ جاتی۔ مجھے میری دس پینی واپس چاہیئے۔ مجھے ایک پینی آپ کے جذبات سے کہیں زیادہ عزیز ہے۔ واہ صاحب آپ حد کرتے ہیں۔

میں بھاری دل کے ساتھ اپنے اندر اٹھتے ابال کو دھیمی آنچ پر رکھنا چاہتی ہوں....... سچ بکے۔۔۔۔سو میٹھا ہو۔۔۔۔۔۔ میرا ذہن اس نئے رشتے کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن میرا سر زخمی جذبات سے سنسنا رہا ہے، میری کنپٹیاں جلنے لگی ہیں....... میں ایک دم اکیلا محسوس کر رہی ہوں....... مجھے بچے یاد آ رہے ہیں....... ہم لوگ تو قربانی دینے دوسروں کو دل کے اندر بٹھانے اور ان کے لیے جذبات کے الاؤ میں کود پڑنے والے لوگ ہیں۔ ایک پینی۔ دس پینی۔ روپیہ سب بے حقیقت۔ تعلق تو انسان کا انسان سے ہوتا ہے....... سوچ یئے خیالوں میں بھٹکیئے....... سرگرداں پھریئے۔ لیکن یہاں کی سچائی آپ کو تسلیم کرنی پڑے گی....... میں پہلی بار سو نہیں پا رہی۔ نہ جانے صبح کا اجالا کون سی منزلوں میں ہے، نماز پڑھتے ہوئے میں کعبہ کا تعین نہیں کر پا رہی، شائد سورج میرے سامنے یا میری پشت پر ڈوبا تھا اور پھر زیر زمین ریلوے میں سفر کرتے ہوئے روشنی تو مصنوعی ہوتی ہے، میں چاہتی ہوں یہاں میرے وطن اور گھر سے دور صرف ایک ہی سہارا ہے۔ خدا کا۔ مجھے اس کی ضرورت ہے، وہ ضرورت جس کے لیے میں ہمیشہ دعا مانگتی رہی ہوں۔ میں اکیلی پونڈ کی دنیا میں گھر کر گئی ہوں۔

آج ہفتہ کی عام تعطیل ہے اور وہ خوبصورت طرحدار لڑکیاں جو ہوٹلوں، ریسٹورانوں اور دفتروں میں پوری مہربانی اور نرمی سے آپ سے گفتگو کرتی ہیں ابھی تک غائب ہیں، وہ بیوٹی سلیپ لے رہی ہوں گی یا انہوں نے اپنے بالوں کو نیا رنگ کروانا ہوگا اور پھر ان کو گھر کی صفائی، گاڑی کی دھلائی بھی تو خود کرنی ہے، ان کا بیک لان گھاس کی خودسری سے جھاڑ جھنکار سے پٹا پڑا ہے،

لان کی دیکھ بھال ضروری ہے۔ کپڑوں کے انبار مشین کے منتظر ہیں۔ چہرہ بلیچ کروانے کا متعین کر رکھا ہے۔

اور اس نے بستر کی نرمی میں آنکھیں کھولتے ہوئے اور بھی نہ جانے کیا کیا سوچ رکھا ہے۔ بوائے فرینڈ کے ہاتھوں کا لمس....... اس کا ساتھ....... کوئی خوبصورت ریسٹوران....... سمندر کا کنارہ، درختوں کے جھنڈ۔ سر راہ....... آہ زندگی کتنی دھنک رنگ نظر آتی ہے۔ لیکن میرے سامنے بھاری پپوٹوں والی گھریلو عورتیں سودا سلف کے لیے ٹوکریاں لئے اپنی اپنی سیٹوں میں خاموش بیٹھی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں زندگی کی رمق پاؤرتی کم ہے یہ کمی کہاں سے شروع ہو کر کہاں ختم ہوتی ہے، کون جان پائے گا....... بوجھ اٹھائے....... جذبات کی ضربات برداشت کرتے عمر بیت گئی....... باقی گذر جائے گی....... وہ مجھے بالکل پاکستان کی گھریلو خواتین لگ رہی ہیں....... بہت کچھ جھیلی ہوئی جان.......

ارے یہ بھی تو دو عمر رسیدہ خواتین مزے سے پارک میں بیٹھی برگر کھا رہی ہیں وہ شائد دوست ہیں یا یونہی سر راہ مل کر اکیلے پن کے درد کو بانٹ رہی ہیں اپنے اپنے سامان کے ساتھ....... اپنے اپنے بوجھ کو سنبھالے لیکن گاڑی میں بیٹھی ایشیائی شکل وال خواتین کتنی خاموش تھیں اور یہ خاموشی ان کے بدن کی خاموشی کا اظہار کر رہی ہے ہمیں استعمال کیا جا رہا ہے ہمارے شوہر، ہمارے بیٹے۔۔۔۔ وہ بہت دولت کمانے کی اس دوڑ میں شامل ہیں۔۔۔۔ اور دولت کمانا آسان نہیں۔ ہم تھک چکی ہیں لیکن ہم آرام نہیں کر پاتیں۔

اور لندن کے مشہور پارک میں مائیں بچوں کی پراموں کے ساتھ بیٹھی بچوں کو دیکھ رہی ہیں....... ان کے ننھے قدم نہ جانے ترقی کے کتنے آسمان تخلیق کریں گے۔ کتنی زمینوں کو جنم دیں گے....... وابستہ رہ چمن سے امید بہار رکھ۔ بہار جو بالوں میں چمک اور آنکھوں میں

روشنی بن جاتی ہے، جو سبک گام ہو کر پاؤں کے تلوؤں سے پیوستہ ہو جاتی ہے، اللہ نے ہر چیز کا زرج بنایا۔ اور آج انسانوں کے اس تفریح کرتے ہجوم میں اس کا مطلب واضح ہو رہا ہے۔...... دو انسان...... محبت کے بندھن میں بند دو دل...... یا صرف جسمانی دو سراتھ کی خواہش میں بندھے ہوئے۔

ایشیائی لڑکوں کا ایک گروہ اپنی اپنی گرل فرینڈز کے ساتھ پھر رہا ہے۔ سانولی پاکستانی لڑکی۔ سیاہ فام بلند قامت نیگرو لڑکی۔ سنہری بالوں والی نیلی جین پہنے انگریز لڑکی۔ لبوں کا تصادم۔ بازوؤں کی گرفت۔ پھولوں کے بڑے بڑے قطعے۔ خوبصورت بتوں سے مزین فوارے۔ بلند وقامت سرو کے درخت۔ پھولوں کے جھاڑ۔ گلابوں کی اقسام۔ صاف سڑکیں۔ مست دل۔ خوشگوار ہوا۔ ساری کائنات ایک وسیع کینوس ہے جس کو دیکھنے سے احساسات کی نئی دنیائیں اجاگر ہوتی ہیں۔

ہمارے لاہور کا باغ جناح۔ جہانگیر کے مقبرے کا وسیع لان۔ جلو پارک۔ چھانگا مانگا کی تفریح گاہ...... ایک ہی ہاتھ کی صفائی کے نمونے اور ہوا میرے چاروں طرف گھیرا ڈالے ناچ رہی ہے۔ اور میں ایک معصوم بچے کو شائد اس کی پہلی چہل قدمی کرتے ہوئے دیکھ رہی ہوں۔ وہ گرتا اور اٹھتا ہنس رہا ہے۔ اور ساری فضا اس کے ساتھ ساتھ کھلکھلا رہی ہے اور میں گیٹ کے سیاہ فولادی گیٹ سے باہر جاتے اس پر الوداعی نظر ڈال رہی ہوں...... مگر اسے خدا حافظ کہنے کے لیے ہاتھ ہلا رہی ہوں...... شائد ساری کائنات خدا نے اسی کی مسکراہٹ کے لیے بنائی ہو۔

ٹرینیں دھڑ دھڑ آ جا رہی ہیں سیڑھیاں جیسے ازلی گردش میں مصروف ہیں۔ قدم ہمیشہ گونج پیدا کرتے ہیں۔۔۔ میں ایک ڈبل ڈیکر کی اوپر کی منزل پر بیٹھ کر نظاروں میں محو ہوں۔

گھر ہی گھر بازار بازاروں میں بکتی چیزیں۔ دوڑتی گاڑیاں۔ شوکیسوں میں سجی مصنوعات اور اب بڑے بڑے پلازوں کا رواج بڑھ گیا ہے خوبصورت ترین فراروں سے بجے، روشنیوں سے جگمگاتے، ضروریات زندگی سے بھرے ہوئے، اور اب ضرورت آپ کی جیب کے بھاری ہونے کی ہے۔ خالی جیب میلہ دیکھنے جانا طعنہ ہی بن سکتا ہے۔ جس سے آپ کی سبکی ہوگی۔ یہاں پاکستانی لڑکیاں بھی تیز تیز لہجے میں انگریزی بولتے ہوئے آپ کو خوش آمدید کہہ رہی ہیں۔ ہماری ترقی کا ارتقاء نہیں...... صرف جسم کی ضروریات پورا کرنے کی تنگ و دو جینز پہن کر کھلے بالوں کے ساتھ انگریزی بولتے ہوئے آپ اپنی نظروں میں خود بلند ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ آپ جس معاشرے سے آئے ہیں وہاں تو سو میں سے ایک فیصد آدمی بھی اس زبان میں بات نہیں کر سکتا...... سارا فخر تو یہی ہے ورنہ یہاں آ کر آپ کی ان ساری خوبیوں کے باوجود کچھ نہیں۔ آپ ہیں تو سیاہ فام، بے شک بلیچ کریمیں آپ کو گورا کر دیتی ہیں۔ آپ کا بوائے فرینڈ آپ کے ساتھ پھر سکتا ہے...... آپ اپنے آپ کو کچھ بھی سمجھ لیں...... مثلاً لیڈی ڈیانا یا قلوپطرہ...... یا بابرہ شریف۔۔۔ یا امیتابھ بچن یا دوسرا کوئی زبردستہ ہیرو ہیروئین۔ پاکستانی لباس پہنے چند عورتیں خریداری کر رہی ہیں۔۔۔ اور میں بھی ایک پاکستانی عورت ہوں جو اس سارے میلے سے مسحور ہو رہی ہوں۔ آرام گاہیں صوفوں اور نرم قالینوں سے سجی آپ کو آرام پہنچائیں گی...... گرم کافی اور سینڈ وچز۔ بس تھوڑی دور تو ریسٹوران ہے جائیے خریدئے۔ اور آ کر پھر بیٹھ جائیے۔

سامان کا تھیلا...... میرا تھکا جسم...... میری ساری توانائی پچھلے دو دنوں میں خرچ ہو گئی ہے...... میں سامان اٹھانے میں دقت محسوس کر رہی ہوں جی چاہتا ہے گھر جا کر لیٹ جاؤں...... آرام کروں...... لیکن گھر دور ہے اور کرائے کے کمرے کو گھر نہیں کہا جا سکتا۔

وقتی دسترس۔

لوگ کتابوں کو سامنے تانے خاموشی سے اپنی موجودگی سے بھی غافل پڑھ رہے ہیں۔ پڑھتے رہیئے۔ لیکن عقل کی جلا کے لیے مشاہدہ ضروری ہے۔۔۔ اور میں عقل سمیٹنا چاہتی ہوں، ریل گاڑی کے اندر پوسٹر آویزاں ہیں۔ مثلاً آپ بھی محبت حاصل کر سکتے ہیں جیسے ان لوگوں سے حاصل کی اور پھر تصویریں۔۔۔۔۔۔ آنکھوں میں جھانکتے لوگ۔ مطمئن چہرے۔

''فلاسفی کلاسز کا اجزاء فلاں تاریخ سے ہوگا۔ آیئے'' ہالینڈ قابلِ دید ہے'' اور یہ چند الفاظ بھی کسی کو دید کا مشتاق بنا دیتے ہیں۔''

اگر آپ جاننا چاہتے ہیں کہ بیویاں اکثر کن کمروں میں اپنے شوہروں کو قتل کرتی ہیں تو ہماری تھیریپی کلاسز ضرور جوائن کیجیئے۔ ''ازدواجی زندگی کی مشکلات حل کرنا مشکل نہیں۔ شادی شدہ زندگی کو بچانا اور اس کا چارم برقرار رکھنا ضروری ہے۔'' میاں بیری کے بدن نوٹوں سے ستر کا کام لے رہے ہیں، ایک مصروی مرد اپنی تین عدد مختلف عمروں کی بیٹیوں کے ساتھ ٹرین پر سوار ہوا ہے، اس کی دس گیارہ سالہ بچی تصویروں کو دیکھ کر منہ پر ہاتھ رکھے سرمائی ہوئی اپنی چھوٹی بہن کو ان کی طرف توجہ کر رہی ہے۔۔۔۔۔۔ ہو ہائے۔۔۔۔۔۔ دبی دبی ہنسی۔۔۔۔۔۔ باپ چپ رہتا ہے۔ یہاں زندہ تصویریں بھی تو ہیں۔ اور آپ اپنے بچوں کو ان نظاروں کی دید سے بچا نہیں سکتے۔۔۔۔۔۔ ان کے ذہنی مدوجذر کی کسی کو کیا خبر۔۔۔۔۔۔ روپیہ کمانے کے لیے کوسوں کا سفر کر کے آپ کو سچائیوں کا مقابلہ تو کرنا ہی پڑے گا۔۔۔ اور جب کوئی پاکستانی ماں یا باپ ان سچائیوں سے خائف ہوتا ہے تو پھر وہ سب آسائشوں کو چھوڑ کر پاکستان آ جاتے ہیں، میری دوست کے جیٹھ لندن میں ڈاکٹر تھے۔ ان کی بیٹی جب بارہ برس کی ہوئی اور ایک روز ایک لمبے قد والے انگریز لڑکے کو گھر میں لا کر کہنے لگی۔

''ڈیڈ میٹ مائی بوائے فرینڈ'' تو وہ اپنا پانچ چھ برس کا جما جمایا کاروبار چھوڑ کر پاکستان آ گئے اور پورا ایک برس نوکری کے لیے مارے مارے پھرتے رہے۔ لیکن وہ ایک لمحہ کے لیے نا قابلِ برداشت تھا۔ لیکن وہاں رہنے والے پاکستانی ماں باپ نہ جانے کتنے ایسے جانکسل لمحوں کے عذاب برداشت کرتے دی رہے ہونگے۔ واپس آنا مشکل ترین مرحلہ ہے۔ یہاں گرمی، مچھر، مکھی، بدانتظامی، رشوت خوری، زیادتی اور نہ جانے کیا کیا ہے جو انسا کی روزمرہ زندگی کو ایک مسلسل عذاب میں بدل دیتے ہیں۔ ذہنی دھچکہ۔۔۔۔۔ اور اب تو یہاں کے پاکستانی خوب روپیہ بنا رہے ہیں۔۔۔۔ روپیہ کمانا یہ دو مختلف نظریات ہیں۔۔۔۔۔۔ روپیہ کمانا تو مشکل تھا اور ہے۔

انگریز کے بارے میں میں کبھی بھی کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہتی۔ ہماری قربانیوں کے قصے ابھی صدیوں پرانی باتیں نہیں۔ چالیس برس پہلے میں نے اسی خوف و ہراس کی دنیا میں ایک سفر کیا تھا۔ ہزاروں لوگ زندہ ہیں جو خون کے دریا سے گزرتے۔ آگ کے دہکتے جہنموں کو عبور کیا اور ایک زمین کے ٹکڑے کو حاصل بنایا۔۔۔۔۔۔ لیکن کئی لوگ پرانی یادوں کے حوالے سے آج بھی گورے صاحب کی حکومتوں کو یاد کرتے ہیں۔ ان کی ایک پور بھی کٹتی تو وہ قربانی کا مفہوم جانتے۔

مالی طور پر انگریز بری حالت میں ہے۔ شائد اسی لیے کہ وہ آج بھی زندگی گزارنے کا ایک نظریہ رکھتا ہے۔ تفریح اور چھٹی۔۔۔۔۔۔ ایک مصروف ترین ڈاکٹر جو روزانہ ہزاروں پونڈ کماتا ہے، کسی بڑی سے بڑی رقم کے لیے بھی اپنی چھٹیوں کو نہیں چھوڑے گا۔۔۔۔۔۔ چند ہفتوں۔ یا چند دنوں کی تفریح اس کے ذہن کو اگلے برس کے لیے خوشگوار اور صحت مند بنا دے گی اور وہ مسلسل محنت کے زیر سے اپنی اخلاقی اور جسمانی صحت کو برباد نہیں کرے گا۔۔۔۔۔۔ بازار چھ بجے تک بند ہو جاتے

ہیں۔لیکن ایشیائی باشندوں کی دکانیں کھلی رہتی ہیں۔تفریح کے لیے پونڈ چاہئیں۔بینک بیلنس کے لیے پونڈ چاہئیں۔امیر بننے کے لیے پونڈ چاہئیں۔زندگی کو پر مسرت بنانے کے لیے پونڈ چاہئیں۔اور یہ اپنی اپنی ترجیحات ہیں۔

آج کی انگریز عورت بہترین فیشن کے کپڑے پہنتی اور فیشن کے جدید ترین لوازمات استعمال کرتی ہے۔...... لیکن میں نے اکثر ہندو اور مسلمان عورتوں کو سادہ ترین لباس اور میک اپ سے خالی چہروں کے ساتھ دیکھا ہے آپ بالوں پر دو پونڈ ہر ماہ خرچ نہیں کر سکتے۔کریموں کی قیمت دیکھ کر شیشی آپ کے ہاتھ سے چھٹتی ہے اور معمولی لباس کے ایک حصہ کی قیمت تیس سے چالیس پونڈ ہے۔جلا وطنی کی زندگی بسر کرتے ہوئے آپ یہ سارے روپے بچانے میں ہی مسرت پاتے ہیں۔میں نے کہا نا کہ اپنی اپنی ترجیحات ہیں۔

ساؤتھ ہال کا علاقہ۔ان ایشیائی محنت کش ہندوستانی اور پاکستانی لرگوں کا مرکز ہے، اسی لیے تو باتھ رومز میں پانی نہیں۔صابن غائب، اور کوڑے کے کھلے انبار...... یہاں پر انگریز غیر ملکی لگتے ہیں۔میں ہنس رہی ہوں۔ٹھیٹھ پنجابی زبان...... باؤجی اور بھیا...... خالہ اماں...... بے بے...... بات تو ساری دولت کی ہے اور یہاں محنت کرنے والے ہاتھ روپیہ کما سکتے ہیں کیونکہ آپ کو جینے کے لیے بھی روپیہ کمانا ہے۔.....آپ کمائیں گے نہیں تو جیئیں گے کیسے۔

میں زندگی کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔میں انسانوں کے رویئے کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

ہمارے ملک کا محنت کش طبقہ بھی خوب کما رہا ہے، ایک عام کاری گر ایک استاد سے زیادہ کماتا ہے، چھوٹے چھوٹے کام کرنے والے لڑکے بڑے مطمئن نظر آتے ہیں۔دکانیں اور بازار بڑھ رہے ہیں...... بازاروں میں رش بڑھ رہا ہے، مہنگائی بڑھ رہی ہے، پریشانی بڑھ رہی ہے اور آبادی بڑھ رہی ہے۔

میں بستر پر بیٹھی سارے دن کا جائزہ لے رہی ہوں۔ کیا یہ سب کچھ دیکھنا ضروری تھا...... شائد...... میرا ذہن چیزوں کو رد اور قبول کرر ہا ہے۔ باہر کا ہنگامہ ایک ٹھہراؤ میں لگتا ہے۔۔۔۔روشنی کو گل کرتے ہوئے قرآنی آیتیں پڑھ کر اپنے آپ کو پھونک رہی ہوں۔

......o......

17 ستمبر...... سترہ ستمبر کا سورج میڈم ٹو سارڈ کے میوزیم کے گول سبز گنبد پر چمک رہا ہے۔ بسیں ٹورسٹ سے لدی۔ اوپر کی منزل بے چھت کے بنے نظاروں میں حائل ساری رکاوٹیں ان حد بندیوں سی ہی تو ہیں...... گرادو...... ہٹادو...... بوڑھی عورتیں ہوا سے بچنے کے لیے بالوں کو رومالوں سے باندھے چپ چاپ بیٹھی ہیں...... تین چار خوبصورت دراز قد لڑکیاں مختلف طرز کے بھڑکیلے لباس پہنے اشتہاروں کو بانٹ رہی ہیں۔

میڈم ٹو سارڈ...... میں زیر زمین سیڑھیوں سے اترتی حیران کن فن کے نظاروں کا تصور کر رہی ہوں۔

ہیلو۔ رکیئے۔ اس برطانوی سپاہی کی خواہش ہے کہ وہ آپ کے ساتھ تصویر کھچوائے۔ بھئی میں تو اسے جانتی بھی نہیں۔ لیکن یہ آپ کو جانتا ہے، یہ وہ سپاہی ہے جس نے آپ کے دادا کو حراست میں لیا تھا۔ آپ کو غلام بنانے میں اس کی بندوق بھی گولیاں اگلتی رہی تھی۔ ملکہ برطانیہ کا اعلان کرنے میں ہمیشہ اسے ہی اہم جانا گیا...... اور پھر جلیانوالہ باغ کا حادثہ۔

میں آواز کی بازگشت کو سنتے ہوئے رک گئی ہوں۔۔۔۔ پلیز۔۔۔۔ آگے بڑھنے والے لوگ رکے ہوئے ہیں...... اس طرف کھڑی ہوجایئے...... تھینک یو...... یہ تصویر آپ کو جاتے ہوئے کاؤنٹر سے چار پونڈ میں ملے گی......

چلو اچھا ہوا۔ میں جو آزاد ملک کی شہری ہوں، یہاں بھی قابلِ عزت ٹھہری۔۔۔۔ بے شک یہ

ایک سپاہی ہی ہے۔ شکر یہ سنتری۔ وہ مسکرا رہا ہے....... سپاہی نے جواب ہی نہیں دیا۔ خاصا بدتہذیب لگتا ہے....... میں غصے سے دیکھ رہی ہوں۔ وہ مسکرائے جا رہا ہے۔۔۔۔

تو یہ میڈم ٹوسارڈ کے میوزیم کا پہلا بت ہے ہمیشگی کا تبسم ہونٹوں پر سجائے۔ میں اس کو دیکھتے ہوئے اندر کی طرف بڑھ رہی ہوں۔

یہ اور سب مشہور لوگ جنہوں نے زندگی کے مفہوم کو سمجھا اور سے پانے کے لیے۔ بحر و بر کو تہہ بالا کرتے زمینوں پر حکمرانی کرتے، فتوحات کے جھنڈے گاڑتے میڈم ٹوسارڈ کے بتکدے میں آن رکے ہیں۔ وقت اور موت سے آزاد....... شہرت کے آسمان کے ستارے۔

تاریخی شخصیات....... عہد شکن ڈکٹیٹر....... بادشاہ ملکہ....... شہزادے....... پادری....... قاتل....... تاریخی واقعات....... موجودہ زمانے کے کویئے۔ گلوٹین سے کٹی گردنیں۔ بہتے خون۔۔۔ اندرا گاندھی۔۔ راجیو۔۔ شاہ حسین۔۔ مردہ ہستیوں کے زندہ روپ۔ مخصوص مسکراہٹیں۔ زندہ ساکت آنکھیں۔ روشنیوں اور سایوں کی دنیا۔ لیکن۔ لیکن میں نے شائد سب جگہیں نہیں دیکھیں۔ قائداعظم محمد علی جناح یہاں نہیں ہیں۔ کیوں۔ تو میڈم ٹوسارڈ بھی لارڈ مونٹ بیٹن ہی کی ہم خیال تھیں....... میں کھوئے سے احساسات کے ساتھ کھڑی ہوں جیسے میرے ساتھ کی گئی بے انصافی کے خلاف میں آواز بھی نہیں اٹھا سکتی۔ انہوں نے میری نفی کر دی اور میں یہاں کھڑی ہوں۔ کھلاڑی۔ گانے والے۔ رائٹرز۔ جرائم پیشہ لوگوں کے چہرے۔ نیم وا نیم جاں آنکھیں۔ موت۔ بجلی کی کرسی۔ زندگی کی خواہش۔ موت کا خوف۔ یہ سب کچھ موجود ہے۔ کیا وہ لاکھوں کروڑوں انسان جو اپنے قائد کے ساتھ مل کر چلے، ایک سچائی ایک حقیقت نہ بن سکے....... منافقین انگریزوں کے دلوں میں شروع ہی سے تھیں۔ مسز ماؤنٹ بیٹن کا معاشقہ، جواہر لال نہرو کے ساتھ سچائیوں کو رد بھی کیا جا سکتا ہے۔

میڈم ٹوسارڈ ہی تو سب کچھ نہیں ہم خود ہیں....... ہر دل، ہر سوچ....... قائداعظم زندہ باد...... پاکستان زندہ باد....... میرا جی چاہتا ہے میں ماؤنٹ بیٹن کے بت کو دھکا دے کر گرادوں۔ بلکہ ساری قوم کو گرادوں۔ راستہ کدھر ہے۔ قائداعظم نے یہی تو سب کو بتایا تھا اور ہم اس پر چل کر منزلِ شاد باد تک پہنچ گئے۔ راستہ ادھر ہے۔ شاپنگ سنٹر میں سوونیئر بک رہے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں، بت، کتابیں، جرابیں، نہ جانے کیا کیا تصویر مجھے مل گئی۔ سپاہی کا وہی چہرہ۔ جو سب کی تصویروں میں مسکرا رہا ہے۔

اگر میری مرضی پوچھی جاتی تو میں ماضی کے مشہور ادباء کے گروہ کے پاس اپنی تصویر بنواتی۔ دوام کا نگار خانہ ہر ادیب اپنی کوششوں اور محنتوں کا میڈل وصول کرتا ہے۔

چند سوونیئر خریدے ہیں لیکن قیمت کا احساس ہر خوشی کو بھاری بنا دیتا ہے۔

میں ٹیلی فون کے بوتھ میں دس پینی کا سکہ ڈال کر فون کرتی ہوں اور بات کو جاری رکھنے کے لیے پھر دس پینی۔ چند لوگوں کے فون نمبر ہیں لیکن میری پہنچان اتنی تو نہیں کہ میں انہیں اپنے آنے کی اطلاع دوں۔ ہر جگہ دوستیوں کو انجوائے کرنے کے لیے پہلے پہچان ضروری ہے، پبلک ریلیشنگ سات سمندر پار۔ کوئی آپ کو کھلے بازوؤں سے خوش آمدید کہے تو کیا ہے۔ چند لوگ تو یہاں بھی ہیں جن کو افسانے کے حوالے سے ملا جا سکتا ہے اور پھر اردو مرکز کے افتخار عارف، حمیدہ معین رضوی، عاشور کاظمی، جیتندر بلو اور کون کون....... بہت سے نام....... بہت سے لوگ جو خوشیوں کی کھوج میں لندن میں شب و روز گذار رہے ہیں۔ ادیب ہونے کے ناطے میری خواہش ہے کہ جب میڈم ٹوسارڈ کی طرح کوئی صرف ادیبوں کا میوزیم بنائے تو اس میں میں ضرور موجود ہوں۔

لیکن ساری سچائیوں کو ماننا اسی طرح ناممکن ہے جس طرح میڈم ٹوسارڈ کے میوزیم میں

قائداعظم کا نہ ہونا۔

نہ جانے کیوں زمانوں سے لوگ انگریزوں کی تہذیب اوران کی بڑائی کے گن گاتے آ رہے ہیں۔ مجھے ان میں کوئی ایسی خاص خوبی نظر نہیں آئی سوائے اس کے کہ وہ زندگی گزارنے کی تگ ودو میں بھاگ رہے ہیں۔ اور ہمارے ملک کی دوسو سالہ تاریخ....... خون کی ندیاں۔ جیلوں کی سلاخوں کے پیچھے آزادی کا خواب دیکھنے والے ذہن۔ اپنے آپ کو تج کر ہماری آزادی کی جنگ 1857ء سے ہی شروع ہوگئی تھی۔ اور انگریز بھی اس بات کو جانتا تھا کہ حکومت مسلمانوں سے چھینی گئی ہے اور خطرہ بھی مسلمانوں سے ہی ہے اور پھر آنے والا دور ایک سازشی دور تھا جس میں انہوں نے ہندوؤں کے ساتھ مل کر مسلمان کو سماجی، تہذیبی اور معاشی طور پر ناکارہ اور پس ماندہ بنانے میں ساری ذہنی توانائیاں صرف کردیں اور ہر گزرتا برت انہیں اپنی بدلتی حالت سے غافل بنانا گیا....... اور آج بھی وہ اپنی زیادتیوں کو نہیں بھولے....... بدلے کا خوف ان کے ذہن کے کسی کونے میں آج بھی موجود ہے۔ وہ کہیں نہ کہیں ہمیں ضرور دھوکہ دے جاتے ہیں....... آج کی تاریخ بھی ان کے ذہن کو اجاگر کرسکتی ہے۔

شام کی سرد ہوا زرد پتوں کو سڑکوں کے کنارے اکٹھا کر رہی ہے۔ ڈھیروں کے ڈھیر۔ پچھلے تین دنوں سے میں ان ڈھیروں میں اضافہ ہی ہوتا دیکھ رہی ہوں۔ کوڑا کرکٹ ہفتہ میں صرف ایک بار اٹھایا جاتا ہے اس تیز آوارہ گھومتی ہوا کے ساتھ سڑکوں کی ساری بے ترتیبی ایک صاف ستھری صورت اختیار کر جاتی ہے خزاں نے زمستانی میدانوں میں اپنا سفر شروع کر دیا ہے اور پھر سڑکیں برف سے ڈھک جائیں گی۔ ڈھلوان چھتیں سفیدی کا لبادہ اوڑھے طویل نیند میں ڈوب جائیں گی....... لوگ موٹے لبادے پہنے اندھیروں کا نقاب اوڑھے شہر میں ہمیشہ کی طرح بکھر جائیں گے اور زندگی تنہا ہو جائے گی۔ میں کمرے کی کھڑکی سے جھانک رہی ہوں۔

اندھیرا بلند عمارتوں سے لگا نیچے اتر رہا ہے۔ اور اس شہر میں آئے مجھے تیسرا دن ہے۔

گھنٹی بجتی ہے....... قدم اوپر کی طرف آ رہے ہیں دروازے پر دستک ہوتی ہے....... کون .... شائد....... افتخار عارف جمیل جالبی صاحب کی کتابیں لینے آئے ہیں۔ انہیں میرے آنے کی خبر نہیں تھی....... کسوٹی والے افتخار عارف اور عبداللہ بیگ....... بگ فیم....... وہ اردو مرکز میں آنے والے ادیبوں کی استقبالی دعوتیں کرتے۔ لوگوں سے ملواتے ہیں....... مجھے بھی ملوانے کا وعدہ کر رہے ہیں....... جاتے ہوئے وہ میری بھی چند کتابیں لے گئے ہیں....... میرا بوجھ قدرے کم ہوا ہے۔ کتابیں لکھنا تو آسان ہے لیکن انہیں کندھوں پر لادے پھرنا ناممکن....... میں صرف تفریح کرنے آئی ہوں۔ یہاں آ کر پھر انگریز کی خدمت کرنا۔ یہ سوچ کر روح میں زنگ لگتا محسوس ہوتا ہے۔ میں یہاں نہیں رہتی....... میں خدا کا شکر ادا کر رہی ہوں۔

.......O.......

زندگی کی سہولتیں۔ تنہا راتیں۔ لمبے دن۔ خوبصورت چہروں والی عورتیں۔ خوبصورتی عمارتوں میں چہروں میں چیزوں میں لیکن ایشیائی لوگ، میرے ملک کے لوگ، مجھے لگتا ہے وہ یہاں آ کر مسکرانا بھول گئے ہیں۔ انہیں بھی بہت کچھ یاد آتا ہوگا میری طرح۔ لیکن مجھے تو واپس جانا ہے۔ لیکن کئی جو کبھی بھی واپس نہیں جاتے انہی زیر زمین راہداریوں میں بھٹکتے۔ کسی غیر ملکی عورت کے جسم کے اسیر ہو کر وطن کے لوگوں کی نظروں سے ہمیشہ کے لیے غائب ہو جاتے ہیں، وہ صرف شراب اور ہونٹوں کے لمس کے اندھیرے میں کھو جاتے ہیں۔ وہ ہونٹ جو پوری سچائی کے ساتھ ان کے نہیں ہوتے۔ آج آتے ہوئے میں نے دو جوان لڑکیوں کو دیکھا جو پلیٹ فارم پر کھڑی ایک لڑکی کی طرف اشارہ کر کے ہنستی ہوئی باتیں کر رہی تھیں، وہ لڑکا ہیلو کہہ کر نظریں جھکا

کر کھڑا تھا جیسے وہ انہیں دیکھنا ہی نہ چاہتا ہو۔ ان سے خائف اور بچنا چاہتا ہو۔ کتنا اچھا لگتا ہوگا جب کوئی لڑکا کسی لڑکی کی کمر میں بازو ڈالے قہقہے لگاتے زیرِ زمین راہداریوں کی تیز چلتی ہواؤں میں سب سے بے خبر بھاگتا ہوگا۔ زندگی یقیناً خوبصورت لگتی ہوگی۔ لیکن ایک وقت وہ بھی تو آتا ہے جب آپ کے بازو اس کمر سے علیحدہ کر دیئے جاتے ہیں اور تنہا راتیں آپ کو بے راہ کر دیتی ہیں، اور وہ کسی اور کے تعاقب میں چل پڑتی ہیں۔ چھوٹے لوگوں کا چھوٹا سا المیہ۔ لیکن دل کے لیے ایک گراں بار بوجھ جو اٹھائے نہ اٹھے۔ جو بھلائے نہ بھولے۔

.......O.......

18 ستمبر....... کنزنگٹن کا پوش علاقہ....... دو ٹرینوں پر سفر کر کے میں یہاں پہنچی ہوں۔۔۔۔ خاصے فاصلے پر جمیل جالبی اور مسز جمیل جالبی یعنی بی بی کا ہوشل ہے۔۔۔۔۔ میں چل رہی ہوں۔ اف اللہ۔۔۔۔ بلند عمارتیں۔۔۔۔ کئی کئی منزلہ بلند ہوٹل۔۔۔۔ خزاں کے زرد پتے۔ خاموشی اور سڑکوں کے دو رویہ کھڑی کاریں۔

شیشے کی طرح چکنا فرش....... جیسے نیچے پانی جھلملا رہا ہو۔ ایسا ہی فرش تو اسلام آباد میں شاہ فیصل مسجد کا ہے خوبصورت ترین اللہ کا گھر۔ اور یہ فرش بھی ویسے ہی جھلملا رہا ہے۔ لفٹ پر چڑھ کر چوتھی منزل کے ایک بڑے آرام دہ چھوٹے سے کمرے میں داخل ہو کر تھک کر کرسی پر بیٹھ گئی ہوں۔ اف اللہ۔ ذہن کا اکیلا پن دور ہو گیا ہے۔ ان لوگوں سے یہاں ملنا اچھا لگ رہا ہے....... میں نے اکثر لوگوں کو کہتے سنا تھا کہ وطن سے باہر ہم وطن زیادہ اچھے لگتے ہیں....... ہاں ایسے ہی میرے احساسات ہیں۔

انسان ایک معاشرتی جانور ہی تو کہلاتا ہے لیکن جدید زمانے نے دلوں سے انسانی پہچان اور اس کی چاہت کو نکال دیا ہے، میرے پاس آپ کو دینے کے لیے وقت نہیں۔ میرے پاس آپ کی

خاطر داری کے لیے پیسے نہیں اور پھر مجھے آپ کی ضرورت نہیں۔ آپ مجھے کیا فائدہ دے سکتے ہیں۔ کوئی نہیں۔ تو پھر آپ جایئے، ناحق میرا وقت ضائع کیا۔ فضول آدمی...... تو کیا آپ کو بھی میری ضرورت نہیں۔ کبھی تو یہی الفاظ آپ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ہم سب اپنی اپنی ذات کے زنداں میں قید ہو کر تنہائی کے عذاب میں مبتلا ہیں اور کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے میرا جی آپ کی طرف بڑھنے کو چاہتا ہے لیکن اپنی نفی کے خوف سے میں ایک لفظ بول نہیں پاتی۔ ایک قدم بڑھ کر آپ کی طرف دوستی کا ہاتھ نہیں بڑھاتی۔ مبادا۔ اور پھر ہم دونوں ہی اکیلے رہ جاتے ہیں...... خوفزدہ سے...... اور المیہ بڑھ رہا ہے، خود پسندی کے خول میں کچھوے کی طرح گھس کر ہم غیر موجود حادثوں سے بچنے پر خوش ہوتے رہتے ہیں۔

سائنس کی دنیا۔ کمپیوٹر کی دنیا۔ فضائی جنگ۔ ہوائی جنگ۔ اور انسان کے بطون کی جنگ۔ اور اکیلا انسان...... مرتا ہوا۔ جیتا ہوا۔ مسکراتا ہوا۔ روتا ہوا۔

دریائے ٹیمز۔ لندن شہر کی مانگ کا سندور...... ہم بڑے سے سٹیمر پر بیٹھ گئے ہیں دونوں طرف عمارتیں ہی عمارتیں اور دریا کی بردبار سطح ان کو اپنے اندر منعکس کر رہی ہے...... اور پانی بہت سے رنگوں کی عمارتوں کے عکس سے سبزی مائل مٹیالے رنگ میں بدل گیا ہے...... بہت سے سیاح خاموشی سے بیٹھے سفر کے منتظر ہیں چند جوان لڑکے لڑکیاں جو یقیناً کسی دوسرے ملک سے آئے ہوئے ہیں، اپنے اس ٹور کو خوشگوار یادوں میں ڈھالنے کے لیے گا رہے ہیں، میرے سامنے کی کرسی پر بیٹھی کمزور سی زردی مائل سفید چہرے والی لڑکی مسلسل گا رہی ہے...... کانوں میں رانجھے کی طرح بالی پہنے لڑکا گلے میں گٹار ڈالے ایک دوسرے پیاری سی لڑکی سے محو گفتگو ہے، دوسرا لڑکا اس پیاری لڑکی کی توجہ حاصل کرنے کے لیے بار بار اسے مخاطب کر رہا ہے۔ لیکن وہ گٹار والے کے پاس سٹیمر کے فرش پر بیٹھی کسی دھن کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہے۔

زندگی ہمیشہ ایک تکون میں کیوں ڈھل جاتی ہے۔ ایک لڑکا دو لڑکیاں۔ ایک لڑکی دو لڑکے۔ اور یہ پیاری سی زرد چہرے والی لڑکی مسلسل چہچہاتی چڑیوں کی طرح گاتی جارہی ہے۔ وہ کسی کی توجہ کی طالب نہیں لگتی....... صحت مند انداز....... سٹیمر چل پڑا ہے سب ٹکٹ لے چکے ہیں....... سٹیمر پر کیپٹن نے مائیک اٹھا کر سب کو خوش آمدید کہا ہیاور پھر دورویہ عمارتوں کی تاریخی حیثیت کے بارے میں بتایا جارہا ہے۔

یہ قلوپیٹرہ کی نیڈل ہے جو مصر کے حاکم نے تحفے کے طور پر دی تھی....... یہ پل جہاں مسافر۔ جہاں گرد۔ چاہنے والے۔ محبت کی متلاشی روحیں آکر دریائے ٹیمز کے دورویہ بنے بنچوں پر بیٹھ کر اس کا نظارہ کرتی ہیں۔ یہ جگہ ہے جہاں ہارڈی کی ناول کو فلمایا گیا تھا۔ تاریخ اپنی جاودانی کے لمحوں میں آنکھیں بند کیئے ٹھہری ہوئی ہے۔ لیکن پانی پلوں کے نیچے سے بہتا ہوا نہ جانے کہاں جارہا ہے۔ اور دل دکھوں سکھوں کے مدوجذر میں ڈوبتا ابھرتا آنسوؤں میں آہوں میں ڈھلتا رہتا ہے۔

تاریخی عمارات، تاریخی ساز لوگ، آزادی کے سوداگر، خودغرضی کی حکایات۔ اور آج بھی لوگ زندگی کی سہولتوں کے لیے اپنے آپ کو بیچتے ہیں۔ نظریات، روایات، اعتقادات، احساسات اور نوازشات۔ صاحب آپ کیا خریدیں گے۔ کس چیز کے شائق ہیں جیب کتنی بھاری ہے....... ہا....... ہا....... ہا.......

لندن کی خوبصورتی کے گن گاتے ہوئے میں جانتی ہوں کہ ان میں سے ایک بھی چیز میری نہیں۔ پھر بھی میرے آباؤ اجداد اور وڈیروں خ نوابوں، سر کے خطاب پانے والوں نے اپنی روایات، اپنی حکومتوں کو ان کے ہاتھ بیچ کر خطابات پائے، سرٹیفیکیٹ حاصل کیئے، جاگیردار بنے اور اب وہی جاگیردار پاکستان کی ڈور کو اپنے ہاتھوں میں تھامے آزادی کے گن گاتے

ہیں...... پاکستان کی زمین اور حکومت کے دعویدار ہیں۔ عوام کو اب بھی بیوقوف بنایا جاتا ہے۔ وہ آج بھی جاہل ہیں۔ تقسیم کا گراف پہلے سے نیچے اتر آیا ہے۔ جی۔ حکومت کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور آقا زادے انہیں اصولوں پر چلتے ہوئے وزیر امیر کہلاتے ہیں...... کس سے گلہ کیا جا سکتا ہے۔ سب دورازوں پر سنتری کلاشن کوف پکڑے نال آپ کی طرف تانے پہرہ دے رہے ہیں۔ صاحب میٹنگ میں ہیں۔ آپ سے ان کی میٹنگ نہیں ہو سکتی۔ بھاگو...... دوڑو...... دفع ہو جاؤ...... اور آج بھی خود غرضوں کو ووٹ دے کر ان کے پاؤں مضبوط کیے جائیں گے اور مہنگائی بڑھے گی...... اور عصمتیں لٹیں گی...... اور سیلاب میں بہہ جانے والوں کی ماں بہنوں کو حفاظت کا جھانسا دے کر رات بھر رسوا کیا جائے گا...... اور صاحب میٹنگ میں رہے گا اور دریدہ دامن بیٹی آنسو بہاتی رہے گی اور اس کا بوڑھا سفید ریش باپ اپنی پگڑی کے پلو سے آنسو پونچھتا کچی راہوں پر دھول کو اپنے سر پر ڈالتا مایوسی کی طرف پلٹ جائے گا۔

اتوار کا دن جاگتے میں خواب دیکھنے کا دن ہے۔ ہاتھ میں ہاتھ دیے...... بگ بین کا چہرہ دریائے ٹیمز میں اپنا عکس دیکھ دیکھ کر نہال ہو رہا ہے خوبصورت نوکیلے گنبدوں والی عمارت...... بڑا تاریخی گاجا۔ سوئے ہوؤں کی آرامگاہ۔ عمارت سازی کا ایک نادر نمونہ ایک قومیت ایک تہذیب کو اجاگر کرتا ہوا......

اور یہ تاریخی ورثہ ان گئے ہوؤں کی یادگار بن جاتا ہے جنہوں نے اپنی ہتھیلیوں کو فگار کیا...... اپنے بالوں کو گرد آلود کیا۔ اپنی راتوں کو بے آرام کیا...... اور لاہور کا تاریخی پس منظر...... شہر پناہ۔ تاریخی دروازے۔ تاریخی عمارتیں۔ وسیع باغ۔ اور ہمارے ہاں بھی ٹورسٹ آتے ہیں...... تصویریں کھینچتے ہیں...... اور دوسرے تاریخی شہروں کو سدھار جاتے ہیں......

لیکن کیا یہ ورثہ ایک شعور بھی دیتا ہے۔ گئے گزرے وقت کو دہرانے کا شعور....... ہوں۔
صرف ماضی کے اندھیرے میں جھانکتے رہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ وہ چنگاری تو ذہنوں، دماغوں
اور دلوں میں نہاں ہوتی ہے جو شعلہ بن سکتی ہے۔ لیکن ہم نے تو گریبانوں میں جھانکنا ہی ترک
کر دیا۔ ہم نے گریبان پھاڑ ڈالے اور مستعار کے کپڑوں سے اپنا سر ڈھانپا اور دوسروں کے
نظریات کا پرچار کیا اور ہم ماڈرن کہلائے....... اور حکایات سنانے اور سننے والے اٹھ گئے۔
اور چوپال خالی ہیں اور سب شہروں کی گلیوں میں سرگرداں ہیں۔ غیر زمینوں پر اپنے پسینوں کو
بہاتے اور خون کو جلاتے ہیں اور نوٹ گنتے ہیں اور یہ بھول رہے ہیں کہ وہ کون ہیں۔

لیکن لندن تو ایک تاریخ ہے اور بگ بین کا چہرہ میری طرف دیکھ رہا ہے....... ہیلو بگ
بین....... ہائے....... اولڈ لیڈی....... تم تاریخ کے بارے میں سوچ رہی ہو.......
وقت کا پہیہ گھومتا رہتا ہے....... تمہیں انتظار کرنا ہوگا.......

ہاں....... میں اچھے وقتوں کا انتظار کروں گی۔ میں پل کر کھڑے ہو کر نیچے بہتے پانی میں چلتے
بجروں کو دیکھ رہی ہوں۔ سیاح سب طرف حیرت زدہ اور خوشی سے بھرپور نظریں ڈال رہے
ہیں۔ سنہرے بال۔ تیز مسرت آمیز چیخیں ہاتھ تھامنے کی ضرورت تو ہمیشہ انسان کے اندر موجود
رہتی ہے۔ دوسرا جو آپ کی ذات کی تکمیل کرتا ہے۔

اکا دکا بوڑھے جوڑے ایک دوسرے کو سہارا دینے کے لیے ہاتھ پکڑے چل رہے ہیں۔ کیا اس
عمر میں بھی محبت کی گرمی اور گرمجوشی کو محسوس کیا جا سکتا ہے....... محبت کی ضرورت تو ہر زمانہ
میں ہوتی ہے۔ اور اس وقت جب سارا زمانہ آپ کے پاس سے ساں....... ساں کی تیز آواز
سے گزرتا جا رہا ہو۔ کسی جذبے اور چیز پر آپ کی گرفت مضبوط نہ ہو سکے۔ صرف ایک بوڑھا
وجود....... ایک تھاما ہوا ہاتھ آپ کو وقت کی تند ہوا میں اڑانے سے بچا سکتا ہے۔ اور یہ وقت کی

آندھی میں اڑنے کے لیے تیار وجود ہی تو ہیں۔ ایک دوسرے کو تھامے ہوئے۔۔۔۔۔ایک دھیمے بہاؤ میں ساتھ ساتھ بہتے ہوئے۔

لندن کا پھیلاؤ وسیع ہے اور ہم ایک جگہ ٹک نہیں سکتے۔ زیر زمین ریلیں بھاررہی ہیں۔ چلو ہم بھی بھاگیں۔۔۔۔ہائیڈ پارک۔

تو میں ہائیڈ پارک کے گیٹ میں داخل ہو رہی ہوں۔۔۔۔۔۔ دور تک سبز لان ہیں اور بلند درخت سڑکوں پر سایہ فگن ہیں۔ ان کے زرد پتے مدھم مدھم چلتی ہوا کے ساتھ اڑتے آگے آگے بھاگتے جارہے ہیں۔ خزاں۔ خزاں انسانی سوچوں میں بھی تو در آتی ہے جب آپ ہر صحیح چیز کا الٹا عکس دیکھنے لگتے ہیں۔ جب اچھائی میں بڑائی اور بڑائی میں آپ کشش محسوس کرتے ہیں۔ اور مجھے اس کونے تک پہنچنا ہے جہاں آزادی تقریر نے دنیا کے تمام کونوں میں دھوم مچا رکھی ہے۔۔۔۔۔۔

ہم چلتے جارہے ہیں۔۔۔۔۔۔ تمام ہی لوگ کشاں کشاں تفریحی موڈ میں سیر کرتے ہوئے ایک جوان کم عمر سا لڑکا روس اور امریکہ کا تقابل کررہا ہے۔۔۔۔۔۔روس سوشلسٹ ملک۔۔۔۔۔۔برابری کا دعویدار۔۔۔۔۔۔ اور امریکہ۔۔۔۔۔۔ گھس بیٹھیا۔۔۔۔۔۔ وہ کہہ رہا ہے روس افغانستان میں اس لیے دخل انداز ہوا کہ وہ ان کے سلب شدہ حقوق واپس دلوا سکے۔ روس جمہوریت پسند سوچ رکھتا ہے، وہ انسانی برادری میں حقوق دلوانے کے لیے کوشاں ہے۔ افغانسبان کی زمین عوام کی زمین تھی جسے وہاں کے زمیندار اور خانوں کے زیر پا کیا ہوا ہے، روس اپنے لوگوں کو قربان کر کے ان کے حقوق کی جنگ لڑ رہا ہے۔

لرگ سوال کررہے ہیں وہ جواب دے رہا ہے۔۔۔۔۔۔ اور جو جواب دے نہیں پاتا منہ کو دوسری طرف موڑ لیتا ہے۔۔۔۔۔۔ ایک آدمی کہتا ہے تم روسی ایجنٹ ہو۔۔۔۔۔۔وہ سر کو زور سے ہلاتا ہے "دیکھو روس میں سب سے اچھی کاشت ہوتی ہے۔ وہاں کا پھل سب سے بہتر ہوتا ہے۔

وہاں کا طرز حکومت سب سے اعلیٰ ہے۔'' ہجوم بڑھ گیا ہے اس کی آواز مجھ تک نہیں پہنچ رہی.......لیکن میں جانتی ہوں یہ لڑکا بھی ان میں سے ایک ہے جسے روس کے صرف اچھے پہلو دکھائے گئے ہیں، وہ جس آزادی اظہار کا لطف اٹھا رہا ہے اس سے روس میں وہ خود بھی محروم ہے۔ وہ اس کی سرزمین پر کھڑے ہو کر اس پر نقطہ چینی نہیں کر سکتا۔

وہ امریکہ پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ امریکہ ویت نام میں اس لیے جنگ لڑا کہ وہ ان کی زمین پر قبضہ کر سکے۔۔۔۔۔ایک دھبہ.......

وہ شائد اس شخص سے نہیں ملا جو روت میں آٹھ دنوں کے نجی دورے پر گیا اور جسے پورا مہینہ زبردستی رکھا گیا....... اسے اپنے وطن میں گھر والوں سے بھی بات نہ کرنے دی گئی، اسے مصنوعی اچھے ماحول کی خوراک تو دی گئی لیکن شخصی آزادی کی دھوپ سے محروم کر دیا گیا۔ اور ادھر گھر والے مسلسل انتظار کے کرب میں مبتلا رہے....... اور یہ کہ وہاں رشوت کا بازار گرم ہے، لوگ ضرورتِ زندگی کے لیے گھنٹوں قطاروں میں کھڑے رہتے ہیں، شائد اسے صرف روپے ہی دیئے گئے ہیں....... اور وہ بیرونی نظریات کے ساتھ آزادی کی نعمت سے بھی لطف اندوز ہو رہا ہے....... کوئی اس پر لعنت بھیج رہا ہے، کوئی مسکرا رہا ہے۔ لیکن وہ بولتا جا رہا ہے۔

یہاں لوگ صرف تفریح کے لیے آتے ہیں....... وہ دھوپ، کھلی ہوا اور لانوں میں بچھی کرسیوں پر لمبی استراحت کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ دوسرا مقرر ایک سٹول پر کھڑا اپنے نظریات کا نئے انداز سے پرچار کر رہا ہے۔ وہ لوگوں کو بتا رہا ہے کہ یہ دنیا ایک بند حسن ہے۔ ہمیں اس کائنات کو اپنے اندر اتار لینا چاہیئے اور جب یہ کائنات انسان کے اندر اتر آئے گی تو پھر باہر کی کائنات کی ضرورت نہیں رہے گی۔ انسان کو ذہنی ارتقاء کی طرف توجہ دینی چاہیئے۔

سامنے کھڑا ایک آدمی کہتا ہے بہتر ہے تم یہاں سٹول سے اتر کر لمبی سیر کیلئے چلے جاؤ کیونکہ

کائنات کو دیکھو گے تو پھر ہی وہ تمہارے اندر اترے گی۔ دوسرا سوال کرنے والا مسلسل اعتراض کرتا جارہا ہے۔ یہ کائنات اپنی تمام وسعت کے ساتھ کیسے انسان کے اندر گھس سکے گی، انسان تو صرف آئس کریم ہی کھا کر پیٹ بھر لیتا ہے اور اس کائنات میں رہتے ہوئے اس سے نفرت کا مطلب سمجھ نہیں آتا۔ تمہیں خود معلوم نہیں کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔

مقرر لاتعلقی سے کھڑا ہے جیسے اس نے سامنے والے کی بات ہی نہ سنی ہو، وہ آزادی اظہار کا خوگر ہے اور دوسرے کے اظہار پر کوئی اعتراض نہیں کرتا۔

تیسرا مقرر ایک کرسی پر چڑھ کر پھر کائنات کا ہی تذکرہ کر رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہمیں تمام اچھائیوں اور خوبصورتیوں سے کائنات کو خوبصورت بنانا چاہئے تاکہ زندہ رہنے کا جواز بن سکے۔ وہ انسا کو اندر سے باہر کی طرف مراجعت کا سبق دے رہا ہے۔

ایک چوتھے مقرر کے سامنے لوگوں کا ہجوم بڑھتا جارہا ہے۔ ایک نیگرو لوہے کے سٹول پر چڑھا مائیک کو تھامے اپنے خیالات کا اظہار کر رہا ہے وہ عورت اور مرد کے باہمی تعلق کو موضوع گفتگو بنائے ہوئے ہے۔ وہ سیب کو ہاتھ میں پکڑے گھما رہا ہے جیسے جانچ رہا ہو لیکن پھر وہ اتر کر اسے تھیلے میں ڈال دیتا ہے۔ لوہے کی ریلنگ سے لگا دوسرا حبشی اس کی باتوں کو مسکراتے ہوئے قطع کرتا جاتا ہے۔ ان کی جنسی گفتگو مراکو کی طرف اشارہ کرتی ہے، وہ مراکو کے سسٹم کا مذاق اڑا رہے ہیں اور دوسرے حبشی کے اعراضات پہلے کو مراکو کو گالیاں دینے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ یہ دونوں بڑے مجمع باز ہیں۔ دونوں باری باری عورت اور مرد کا ذکر کرتے ہوئے مراکو کو ہدف تنقید بنائے ہوئے ہیں۔

عورت اور جنس جس نے سارے یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے جس کی وجہ سے صرف مادیت کا وجود باقی ہے اور یہ مادیت پرستی صرف اندھیروں کی طرف لے جاتی ہے۔

سفید کپڑوں والی نن لوگوں کو اس عذاب سے ڈرا رہی ہے جو ان کو کہیں سے اترتا نظر نہیں آتا، جو ان جوڑے ایک دوسرے کے گرد بازہ حمائل کئے آئس کریم کھاتے ایک ساعت کیلئے رکتے اور پھر مسکراتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ وہ کہہ رہی ہے اے لوگو...... کیا تم نہیں جانتے کہ عیسیٰ فرزند خدا تمہارے گناہوں کے کفارے کیلئے مصلوب ہوا...... کیا تم پر واجب نہیں کہ اس کی طرف رجوع کرو۔ اس کی باتوں پر عمل کرو۔ تم اس دنیا کیلئے سب کچھ نہیں۔ لوگ تیز تیز قدم اٹھاتے پاس سے گزر رہے ہیں۔ آہ مصلوب مسیح میں کوئی بھی دلچسپی نہیں لے رہا...... بیچارا مصلوب مسیح۔ اس کی بھیڑیں بکھر گئی ہیں...... اور وہ اکیلا ہی سرزنش کا عصا ہاتھ میں تھامے حیران نظروں سے خلا میں گھور رہا ہے اور آج کا انسان خود خدا بنا ہوا ہے، اسے کسی پیغام رساں کی ضرورت نہیں۔ کسی سرزنش کو کیوں برداشت کیا جائے نیگرو لڑکے نے اپنی سفید فام محبوبہ کے ہونٹوں کو چوم کر مسکرا کر تن کو دیکھا ہے۔ وہ اسی طرح چھوٹی سی سیڑھی پر چڑھی مسیح کی تبلیغ کر رہی ہے۔

اور یہ بھی تو مسیح کی بھیڑیں ہی ہیں جو طرح طرح کے پرندوں، چرندوں اور درندوں کے رنگین لبادے اوڑھے چلے آ رہے ہیں...... دو دو کی ٹولی بنائے ہاتھ پکڑے...... ساتھ ساتھ......

''فرینڈز آف دا ارتھ''...... ان کے سینوں پر بیج لگے ہوئے ہیں۔ سب اپنے زرد کپڑوں اس کے ماسک............ طرح طرح کے چہرے...... ''فرینڈز آف دا ارتھ'' تو محبت کی جا سکتی ہے ان سے بھی جو آپ کے برابر کندھے سے کندھا جوڑ کر کھڑے نہیں ہو سکتے۔ جو آپ کی زبان نہیں بولتے۔ جوان لڑکے لڑکیوں نے رنگا رنگ نقش و نگار سے چہروں کو سجایا ہوا ہے۔ رنگین چھتریاں سروں پر تانے...... اپنی دموں کو ہلاتے۔ بھالو کا ماسک پہنے لڑکی چہرے یک ہڈا اٹھائے دیکھ رہی ہے...... بندر اپنی دم ہلاتے ہوئے کھکھیا رہا ہے شیر نے دھاڑ مارنے کی کوشش کی ہے۔ کوا

چونچ میں انگور پکڑے کائیں کائیں کر رہا ہے اور یہ انسانوں کا جانوروں کے حقوق کیلئے لمبا جلوس ہے۔ جو ختم ہونے میں نہیں آ رہا...... یہ جلوس افریقی فاقہ

برٹش میوزیم

برٹش لائبریری اور میوزیم کی دید کے بغیر لندن یاترا نامکمل کہلائے گی۔ اس لئے وہاں جان بے حد ضروری ہے اور اس کے گیٹ کے اندر داخل ہونے سے پہلے اس کی خوبصورت اور بلندی کی ہیبت سی چھا گئی ہے، بڑے بڑے گلوب چھت سے لٹکے ہوئے ہیں۔ میں سرخ قالینوں والی سیڑھیوں پر چڑھتی۔ ماربل سٹیچر آف اینتا بھ بدھ کا کریم رنگ کا بت بڑی سنجیدگی سے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا ہے علم اور عرفان کا منبع۔ انسانیت سے محبت کا نیا اور انوکھا درس...... کیڑے بھی محترم ہیں، پانی چھان کر پیو...... نفس کو مار کر بڑا بننے کا درس۔ بدھ کے کتنے آسن ہیں...... بدھا کے کتنے رنگ ہیں بدھا کو مخنسبت کرنے کے کتنے انداز ہیں۔ سیاہ بدھا۔ سفید بدھا۔ پیتل کا بدھا۔ سونے کی مورتیاں...... آنکھیں بند کیے نروان کے لمحوں کے انتظار میں عورت کا مجسمہ......

اور جب انسان فطرت سے خوفزدہ اور اپنی قیمت سے آگاہ نہیں تھا تو تمام مظاہر فطرت اس کے خدا ٹھہرے تھے اور مصر کے بت کدے میں بھی بکروں جیسی شکل والے خداؤں کی پوجا کیا کرتے تھے۔ وہ ماربل کے برتن استعمال کرتے اور شاید قربان گاہوں پر ایسے ہی برتنوں میں عود لوبان جلا کر قربانی دیا کرتے ہوں گے۔

وہ سمندروں کو کشتیوں ارو ملاحوں کی مدد سے عبور کیا کرتے تھے اور ان کے ملاح اپنی حفاظت کیلئے دیوتاؤں کی بارگاہ میں دعائیہ حمد گاتے لہروں سے خوفزدہ...... ساحل کی تمنا کیا کرتے

تھے...... سب چیزیں ان کو اپنی طرف بلاتی تھیں اور قدرت ان کے لئے سربستہ راز تھی جس سے وہ خائف اور ہراساں تھے۔

ارے یہاں یہ قالین پانچویں صدی سے سفر کرتا 20 ویں صدی کے انیس سو اٹھاسی کے ستمبر کے مہینے میں میری آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔ ان پر نہ جانے کن شہزادیوں نے قدم رنجہ فرمایا ہوگا۔ نہ جانے کون سے شہزادے ان کے سامنے جھکے ان کو اپنی محبت کا یقین دلاتے رہے ہوں گے اور پھر امتداد زمانہ...... ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں۔ چوتھی صدی کی کڑھائی کا نادر نمونہ...... باریک سوئی کا کام...... جیسا آج کل چینی تصویروں میں نظر آتا ہے تیزہ...... لڑکا...... تیر کمان...... ٹیبل میٹ خوبصورت پھول...... گھوڑ سوار۔

بدھا کا جنت کا سفر...... آگہی اور علم کیلئے سفر ضروری ہے۔ انسان کا انسان کی طرف سفر، روح کا عرفان کی طرف اور موت کا حیات کی طرف...... حیات کا موت کی طرف۔

یہاں اسلام اور ہندوستان کے بارے میں بھی جگہ مخصوص کی گئی ہے۔ ظروف...... مینا کاری...... رنگوں کی دنیا فیروزی پھول...... گل کاری۔

سندھ کی تہذیب، بت، برتن، مختلف دیوتا جو نروان کے لمحوں میں مسکراتے ہیں۔ سکون ان کے انگ انگ سے ہویدا ہے۔ دنیا کا کوئی دکھ انہیں چھو نہیں سکا...... دنیا فانی اور روح غیر فانی۔

ارے یہاں مہاتما بدھ بے لباس تھے اور یہاں ان کو لباس تو پہنایا گیا...... میں مسکرا رہی ہوں۔ بھلا یہ کس سنگ تراش نے تراشا ہوگا۔ شاید مونچھیں اس کی کمزوری ہوں گی کہیں وہ عورتوں کے بتوں کو بھی مونچھیں نہ لگا دیتا ہو جیسے کہ اکثر لڑکے رسالوں پر بنی لڑکیوں کے چہرے بگاڑنے کیلئے مونچھیں بنا دیتے ہیں۔

کوشاں خاندان کی حکومت کے وقت بدھا ہمیشہ آسن میں رہتا تھا...... دھیانی بدھا...... وشنو کا

لکڑی کا پتھر سے تراش کر پھولوں والی جالیاں بنادی گئی ہیں۔

پتھروں پر خطاطی کے نمونے، شیو اور پاربتی کے بت، وشنو کے بت۔

ہاتھی دانت کا ایک شیطان جو بدصورت اور خوفناک شکل والا ہے۔ اس کی آنکھیں باہر کی نکلی ہوئی اور دانت بڑے بڑے ہیں اور ایک اور شیطان...... شیطان کا چیلا۔

منگ خاندان کا سولہویں صدی کا بادشاہ۔ پتھر سے تراش کر اس پر فیروزی رنگ دیا گیا ہے۔ بہت نایاب بت۔

چین کی خاص فن کاری۔ برتن۔ گل دان۔ تصویریں۔ لندن کا شہر۔ پیرس کا شہر۔ بوسیدہ نقشوں کی مدد سے انڈر گراؤنڈ ریلوے کا نقشہ۔

اور فرانس کی ایمبیسی نے مجھے ویزا نہیں دیا۔ نہ جانے آن والے دن کیسے ہوں۔ وقت مجھے کتنی مہلت دیتا ہے وقت کس کی گرفت میں آیا ہے، رہے نام اللہ کا اور اللہ نشانیاں دیتے ہے تاکہ تم سمجھو اور اس کی طرف رجوع کرو......

انڈر گراؤنڈ راہداریوں کو تیز تیز قدموں سے طے کرتے اکثر دیواروں پر لگے بڑے بڑے پوسٹرز کو دیکھتی ہوں...... اور پھولوں سے بھرے ایک پوسٹر پر کیو گارڈن لکھا ہوتا ہے۔ پھول ہی پھول...... خوبصورتیوں کے مظہر، خدا کی صناعی کا نمونہ۔

کیو گارڈن

ٹورسٹ ان پوسٹروں کو دیکھ کر اپنے ہاتھ میں پکڑے نقشے پر جھک کر اس کیو گارڈن کے محل وقوع کا جائزہ لیتے ہیں...... رنگ ہی رنگ...... جانا چاہئے...... ضرور۔ نظاروں کو دل اور روح میں اتارنے سے راحت ملتی ہے لمبے سفر کے بعد انڈر گراؤنڈ ریلوے سے باہر آ رہے ہوں، چھوٹا سا چوک، میز اور سفید کرسیاں، اوپر تنی ہوئی چھتریاں، پب، بکھرے زرد پتوں کے ڈھیر، اداسی اور خوبصورتی باہم بغل گیر ہیں۔ میں ایک گھنے درخت کے موٹے موٹے بیجوں والے پھلوں کو پاؤں تلے روندتی، کیو گارڈن کے گیٹ کے اندر داخل ہو گئی ہوں...... ٹکٹ گھر سے ٹکٹ ہاتھ میں لئے گھر گھنے درختوں وسیع جھاڑیوں اور بلند درختوں تلے بنی روشوں پر مڑتے ہوئے چلتی جا رہی ہوں بی بی اور عاشی مجھ سے آگے تیز تیز بڑھ رہی ہیں۔ پھول کہاں ہیں۔ پھول جو انڈر گراؤنڈ راہداریوں کو سجا رہے تھے...... دو جاپانی ایک پرانے بے برگ درخت کے تنے کے ساتھ لگی تختی کو غور سے دیکھکر ڈائری میں کچھ لکھ رہے ہیں۔ کتنے پرانے درخت اپنی شاخوں کے پھیلاؤ میں بڑھاپے کی دہلیز تک پہنچ چکے ہیں...... بزرگی اور پھیلاؤ اور خمیدہ کمر بوڑھے عقل کی باتیں چوپالوں میں سناتے تھے...... جوان زندگی کا سبق جھکی آنکھوں اور پر ادب انداز سے لکھتے تھے اور پھر یہ امانت اپنے بچوں تک پہنچاتے تھے۔ لیکن اب کوئی بوڑھا نہیں رہا اس لئے کہ ان کی بزرگی کے تجربات کی کسی کو ضرورت نہیں۔ ہم سارے سبق ریڈیو، ٹیلی ویژن، فلموں، رسالوں اور نہ جانے کون کون سے نظریات سے سیکھتے ہیں۔ بڑھاپا اور بوسیدگی...... وقت سے بچھڑ جانا...... راہ سے بھٹک جانا۔ لیکن کیو گارڈن میں اس بڑھاپے کی حفاظت کی جاتی ہے...... ہوائیں پتوں کو اڑاتی سبز لانوں میں دھکیل رہی ہیں...... سرخ زرد...... سبز نارنجی...... عنابی رنگوں کا میلہ...... موسم بنجارا ہے جو ہر آن ایک نئی بستی میں قیام کرتا ہے اور پھر جدائیوں کی آندھیاں چلتی ہیں رتوں کے روپ بدلتے ہیں۔ شاخیں برہنہ ہوتی ہیں نئے لبادے اوڑھے وقت پھر

وصال کی ساعتوں میں پلٹتا ہے۔

اور میرے شہر لاہور میں اگست ستمبر کی گرم ہوائیں لودیتی گلیوں میں آوارہ تھیں تپتی زمینیں الاماں الاماں، کہتی گھروں کی ٹھنڈک کے باہر ہی رک جاتی تھیں اور چہرے ہاتھوں کے کٹوروں میں بھی جھلنے لگتے تھے۔تب میں نے سفر کا ارادہ کیا اور لندن کی خوشگوار فضا کو اپنے گرد اوڑھے تاریخی جگہوں بازاروں باغوں اور محلوں میں پھرنے لگی۔شکر ہے لیکن کیا اس شکر میں میں نے اپنے وطن کو حقیر سمجھا۔اس کی آب و ہوا سے بیزاری ظاہر نہیں کی تھی...... میرا ضمیر اسی مٹی سے گوندھا گیا۔میں نے اس کے موسموں کی سختیوں اور نرمیوں کو ہمیشہ برداشت کیا۔نہیں مجھے اس کی ناشکری نہیں کرنی چاہئے۔مجھے پلٹ کر جانا تو ہے لیکن یہ وقتی آرام مجھے سکون دے رہے ہیں۔

میں انگور کی بیلوں تلے سیلف سروس ریسٹوران کے لان میں بیٹھ کر چڑیوں کی چہکار سن رہی ہوں......ارے بالکل پاکستانی چڑیوں جیسی ہیں یہ چڑیاں۔چہکار ایک راگ بن کر نیلے شفاف آسمان تلے میرے گرد گھوم رہی ہے۔اتنے دنوں سے میں نے ایک پرندے کو بھی بولتے نہیں سنا تھا......اور مجھے کائنات نامکمل لگ رہی تھی۔اور آج تکمیل کا دن ہے صاف ستھری روشیں، وسیع میدان، نیلام آسمان اور انگور کی بیلیں......اور سرمئی کبوتروں کی ٹولی جو دھیمے دھیمے چلتی میز کے گرد اکٹھی ہو گئی ہے ہمارا رزق تمہارے رزق میں سے لکھا گیا ہے۔وہ منتظر عنابی گول آنکھوں سے مجھے بتا رہے ہیں۔لیکن میں نے اتنے پاکستانی روپے ادا کئے ہیں...... جانتے ہیں بانٹ کر کھائیں۔اچھا ہوتا ہے۔توبہ ہے تم سب کتنے باتونی ہو۔غٹرغوں۔غٹرغوں...... وہ بحث کئے جا رہے ہیں آلوؤں کے چپس کے ذرے ان کی چونچوں میں بھرے جا رہے ہیں انہیں مجھ سے کوئی خطرہ نہیں۔سارا لندن اور لندن کے باسی ان سرمئی کبوتروں کے دوست ہیں۔ہائے

''فرینڈز آف دا ارتھ''۔ سرمئی لبادہ اوڑھے تم ہمیں اعتماد اور محبت کا سبق دیتے ہو...... وہ اکیلی ٹورسٹ کے میز کے اوپر چڑھے مزے سے لیفٹ اوور زکھا رہے ہیں۔ معصوم اعتماد اور بھروسہ۔

سرخ چھت والا دس منزلہ پگوڈا دور سے مسافروں کو اپنی طرف بلاتا ہے۔ میں اس کے سامنے کھڑی عمارت پر لکھی عبارت کو پڑھ رہی ہوں۔ لکھا ہے۔

''اس عمارت کو سر ولیم چیمبرز نے ایکسٹا ڈوویگر جو ویلز کی شہزادی تھی کے لئے ڈیزائن کیا''۔ ہر چھت پہلی چھت سے گولائی میں چھوٹی ہوتی جا رہی ہے اور سیڑھیاں آخری منزل تک جاتی ہیں۔

شہزادی یہاں جھروکوں سے جھانکتی چاروں طرف پھیلے فطرت کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتی ہوگی...... دور کوئی شہزادہ بانسری بجاتا الوہی نغمے سنا رہا ہوگا...... اور یہ گلہری...... اتنی موٹی اور اتنی بہادر...... جس نے عاشی کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ کر اس سے کوک کے گلاس میں سے اپنا حصہ مانگا تھا...... ''بہادر فرینڈ آف دی ارتھ'' میں دل ہی دل میں دہراتے ہوئے خوب ہنس رہی ہوں...... والٹ ڈزنی کا ایک کردار جو بول سکتا ہے اشاروں کی زبان میں۔

والٹ ڈزنی ایک لافانی نام جو تصورات کی خوبصورتیوں کو مجسم کر دیتا تھا۔ پرواز تخیل...... نازک احساسات کی دنیا...... فن کی بلندی...... ہیلو سویٹی میں اس کی طرف بڑھ کر اپنے ہاتھ میں پکڑی کون آئس کریم کا آخری سرا اس کی طرف اچھالتی ہوئی کہہ رہی ہوں۔ وہ بڑی پھرتی سے اسے اچک کر دور بنچ کی پشت پر بیٹھی کھا رہی ہے۔

فطرت لامحدود ہے آگے بڑھو...... یہ جھیل...... ارے کتنا گہرا۔ مونگیا پانی ہے اور کناروں پر ایستادہ درختوں کے سائے سورج کی کرنوں کو سطح تک پہنچنے سے روک رہے ہیں اور مرغابیاں سیاحوں کو بیٹھا دیکھ کر ان کی طرف اپنی بھاری پشتوں کو ہلاتی آ رہی ہیں......

سوری معلوم نہیں تھا کہ آپ یہاں براجمان ہوں گی۔ نہیں تو ضرور ضیافت کا انتظام کر کے لاتے...... درخت سرسراتی ہواؤں میں ہولے ہولے جھوم رہے ہیں۔

لیکن اس گلاس ہاؤس میں ہوا داخل نہیں ہو سکتی۔ یہاں ایسے پودوں کی حفاظت کی جاتی ہے جو سرد جھونکوں میں مرجھا جاتے ہیں...... کتنے ہی گلاس ہاؤس ہیں۔ پودوں کی قسمیں ان کی مدت...... چھت سے فانوسوں کی طرح لٹکتی سبیلیں...... کریلے کے پھول اور پھل...... اندر گرمی ہے ہم اگلے گلاس ہاؤس میں داخل ہو گئے......

گلاس ہاؤس...... اور پتھر...... لیکن یہ شیشے برسوں سے اپنا کام انجام دے رہے ہیں شاید یہاں شیشے کے گھروں میں رہ کر دوسروں پر پتھر پھینکنے کا رواج نہیں۔ ہمارے ملک میں تو یہ محاورہ بہت درست بیٹھتا ہے ہم اپنے عیب سے قطع نظر دوسروں کے عیب دیکھتے ہیں...... تا کہ لوگ خود حفاظتی کے عذاب میں مبتلا ہو کر ہماری طرف توجہ ہی نہ دے سکیں۔ ہماری عقل کا جواب نہیں۔

آسمان سفید بادلوں سے ڈھک گیا ہے اور اس بڑے تالاب میں فوارے نیلا پانی اگل رہے ہیں ارو سفید چھوٹی چھوٹی مرغابیاں تیر رہی ہیں اور زندگی اپنے جوبن پر اتراتی گلاب کے تختوں بے وقعت جھاڑیوں میں گھوم رہی ہے انہوں نے نئے بنتے گلاس ہاؤس کے باہر لان کے جانوروں کے بڑے بڑے مجسمے رکھے ہوئے ہیں شیر، گھوڑا، ہاتھی، زیبرا، ’’فرینڈز آف دی ارتھ‘‘۔

آسمان پر ہوائی جہاز غیر ملکیوں کو لاتے لے جاتے گزر رہے ہیں جیسے وہ کسی سفید بادل کے پس منظر میں ایک تصویر میں ڈھل گئے ہوں۔

مالی گھاس کاٹ رہے ہیں، باڑوں کو درست کر رہے ہیں اور بیکار پتوں کو ٹرالی میں ڈالتے جاتے ہیں۔

اور خدا بھی مالی ہی تو ہے جو انسانوں کی قطع برید میں مصروف رہتا ہے میرے وطن میں جہاز کریش ہوتے سیلاب آتے، تخریب کار گولیاں چلاتے اور انسان موت کی نیند سو جاتے ہیں۔

اور کائنات کے اسرار انسانی فہم سے بالا ہیں اور خدا کے حکم کے بغیر ایک پتہ بھی جنبش نہیں کر سکتا۔

اور میں جمیل جالبی صاحب کے اعزاز میں منعقد کیئے گئے فیض سیمینار سے آ رہی ہوں......

سیمینار کامیاب تھا...... اور لوگ دوستی اور محبت کے ناطے دور دور سے آئے تھے۔ شاہ صاحب اور مشتاق یوسفی صاحب کی دعوتیں خلوص سے بھرپور تھیں۔ ان کی خالہ زاد بہن دعوت کھلاتے ہوئے ان لوگوں کی تعریفیں کیئے جا رہی ہے...... سچائی اور دیانت داری کے ساتھ...... اور میں سوچ رہی ہوں کہ جو لوگ روایات کے حامل ہوتے ہیں روایات کو نبھاتے ہیں اور دانتوں سے دمڑی پکڑنے والے محبت کے الفاظ کو بھی کنجوسی سے استعمال کرتے ہیں اور رشتوں کو دمڑی خرچ کرنے کے خوف سے توڑ دیتے ہیں۔

افتخار عارف صاحب کامیاب فنکشن کرنے پر مطمئن ہیں اور پیشانی سے فکرمندی کا پسینہ پونچھ رہے ہیں اور ٹیکسی روشن سڑکوں پر بھاگتی جا رہی ہے اور رات خاموش ہے...... اور ہمیں صبح ویلز کے لئے جانا ہے نئی زمینوں کی دید۔

ٹیکسی اس علاقے سے گزر رہی ہے جہاں مشہور ادیب بین الاقوامی شہرت کے حامل مصور رہتے تھے۔ جارج ایلیٹ روزیٹی اور تھامس کارلائل اور دریائے ٹیمز کے اوپر تیرتی ہوا خاموش گلیوں دو رویہ کھڑی کاروں پرانے درختوں کی پھننگوں کے اوپر سے کودتی اندھیرے کونوں کھدروں میں گھس رہی ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح ہوموسیکشوئل لوگوں کا کلب...... جو روح کے اندھیروں کی گندگیوں فطرت کی آلودگیوں کو گودوں میں بھرے دھواں دھار کمرے

کے اندر شراب کے گلاس میں ڈوب رہے ہیں...... فطرت اپنا مذاق اڑا رہی ہے گندے چہروں والے جوان مرد...... ایک دوسرے ساتھ لگے کھڑے ہیں میں اس گزرتے لمحے میں سب کچھ دیکھ چکی ہوں...... کانوں میں بالیاں پہنے بالوں کو بڑھائے پھٹی جینز پہنے مرد شراب انڈیلتا بوڑھا ساقی فطرت سے انحراف، فطرت کے مقاصد سے انحراف، سچائیوں سے انحراف اور یہ چیلسی کا علاقہ ہے اور خوبصورت گھر شفاف کھڑیوں روشن مکانوں کے ساتھ ساتھ میں اس نظارے کے بارے میں سوچ رہی ہوں جو ابھی میری نظروں کے سامنے سے گزرا۔

چیلسی کے روئل ہسپتال میں ان بیماروں کا علاج نہیں شاید...... اور فطرت ان خزاں زدہ ذہنوں کی زندگی کے لئے کچھ نہیں کر سکتی اور زرد پتے درختوں پر دوبارہ آویزاں ہو کر جھول نہیں سکتے...... اور برہنہ شاخیں ایک دوسرے سے مل کر افسوس کرتی ہیں...... اور رات ایک کمرے کی کھڑی سے لگی نظاروں کی قطاروں میری نظروں کے سامنے لا لا کر ڈھیر کرتی جا رہی ہے اور میری آنکھیں مند گئی ہیں...... رہے نام اللہ کا......

ویلز

میں نئے نظاروں کی کھوج میں لندن کی گہما گہمی، خود پسندی اور تھکا دینے والی مسافرت کو چھوڑ کر ویلز میں سچی اور کھری فطرت کی طرف جانا چاہتی ہوں۔

ویلز کا پچاس پونڈ کا ٹکٹ...... میں سامان کو ویل کیریئر پر رکھے آہستہ آہستہ پلیٹ فارم کی طرف بڑھ رہی ہوں۔ میں نے لندن دیکھ لیا باقی واپس آ کر دیکھ لوں گی۔ اس شہر نے مہربان

ہاتھوں کی بجائے قہر اور سختی سے میری ہمتوں کو جانچا ہے لیکن میں ہاروں گی نہیں...... میں اس کی بسوں، اس کی ٹرینوں اور اندھیری غار جیسی راہوں پر چل سکتی ہوں۔ حالانکہ زندگی نے ہمیشہ میرے ساتھ مہربانی کا برتاؤ کیا ہے۔ میں اتنی محنت کی عادی نہیں تھی...... انسان کے اندر حالات کے مطابق اپنے جسم کو اپنی سوچوں کو موڑنے کا ملکہ ہے۔ لیکن میں اب نئی صورتوں میں ڈھل کر کیا کروں گی۔

وقت پر پلیٹ فارم کا گیٹ کھلے گا ایک لمبی لائن دور تک کھڑی ہے۔ بوڑھی عورتیں ارو مرد جوان عورتیں گردنوں میں موتیوں کی مالائیں پہنے، آنکھوں کو رنگوں سے سنوارے بہترین لباس زیب تن کئے تفریحی دورے پر جانے کیلئے تیار کھڑے ہیں۔ سامان کو کھینچ ٹرالیوں پر رکھے اپنی باری کے منتظر......

پلیٹ فارم کا دروازہ کھلا اور پھر آرام دہ ٹرین کی نرم سیٹوں پر بیٹھے ہوئے میں نے اپنے آپ کو بڑا جہاں گرد سمجھتے ہوئے اردگرد دیکھا ہے...... میرے ساتھ والی سیٹ پر عمر رسیدہ میم اخباروں کا پلندہ لئے خاموشی سے بیٹھ گئی ہے...... اس کے ساتھ جوان خوبصورت لڑکیاں، لڑکے اور نہ جانے کون کون خاموشی سے سیٹوں پر بیٹھ گئے ہیں"۔ میں انہیں جھانک کر دیکھ نہیں سکتی...... ایسی بدتہذیبی کر کے میں کیوں اپنے آپ کو بدتمیزی بلیکی کہلواؤں...... اور پھر کتنی چپ ہے جیسے پتے کی جنبش بھی سنائی دے...... ان کے گورے چہرے...... میرا سانولا چہرہ...... میں ان سے مختلف ہوں اور اللہ تعالیٰ نے ہی تو لکھا ہے کہ میں نے تمہیں مختلف رنگوں، قبیلوں، خاندانوں میں بانٹا تاکہ تمہاری پہچان قائم رہے۔ گورے ہونے میں خدا کے نزدیک کوئی فخر نہیں اور کالا بھی اسی کی تخلیق ہے پھر یہ تفاخر کیوں...... بلندی کیوں...... میں اس کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے انہیں نہیں دیکھوں گی...... میں دل میں تہیہ کرتی ہوں...... لیکن فطرت کی

دید سے میں کسی صورت محروم نہیں رہوں گی اور یہ بوڑھی سمارٹ عورت معمہ حل کر رہی ہے۔ حالانکہ اس کی علمیت کے شوق نے مجھے بڑا مرعوب کیا تھا...... وہی پیسہ حاصل کرنے کی کوشش......اندھی قسمت پر یقین کرنے کی خواہش۔

میں کھڑکی کے ساتھ لگی لندن کو پیچھے چھٹتا دیکھ رہی ہوں......عمارتوں میں چھپا زمین کا بطن اب کھلی فضا میں ڈھل گیا ہے۔ گھاس کس قدر سبز ہے اور پھر یلیٹو زکیز مین اونچی نیچی ڈھلوان اور سرسبز، جگہ جگہ باڑیں اگا کر انہیں مختلف قطعوں میں بانٹا گیا ہے۔ کیا معلوم یہاں بھی زمینوں کو ہتھیانے کیلئے ایک دوسرے کو قتل کیا جاتا ہو۔ بہنوں کو بن بیاہے زندگی گزارنے پر مجبور کیا جاتا ہوتا کہ زمین دوسرے نہ لے جاسکیں اور عورت تو ازل کی معصوم اور بے بس ہے۔ یہاں کی عورت نے اپنا آپ دریافت کیا ہے وہ اپنی ذات کی کولمبس ہے۔

ہم انسان ہیں آزاد اور خود مختار، برابر کے ذمہ دار......لیکن اور اس لیکن کا سفر ایک براعظم سے دوسرے براعظم کا سفر ہے۔ مختلف سوچوں مختلف تہذیبوں اور معاشرے کا سفر ہے پاکستانی عورت ترقی کر رہی ہے۔ پڑھ رہی ہے جائیداد میں حق دار ہے اور یہ حصہ اس کا حق ہے لیکن وہ صدیوں پرانی ہندو روایات کی بھینٹ چڑھ رہی ہے......اگر بیٹی جائیداد میں سے حصہ مانگے تو لوگ اسے خوفناک نظروں سے گھورتے ہیں۔ باتیں کی جاتی ہیں۔ ستی ہونے کے کتنے ڈھنگ ہیں۔ طلاق، جائیداد سے محرومی......علیحدہ کر دینا......بچوں کا بچھڑ جانا اور وہ ایک بار کی بجائے بار بار ستی ہوتی رہتی ہے اور کوئی اس کے زندہ جسم کو دفنانے کو تیار نہیں۔ کوئی اس کا دکھ نہیں بٹاتا۔ کوئی اس پر رحم نہیں کھاتا۔ اسے تعلیم حاصل کر کے باشعور بننا چاہئے......لیکن اخلاق کی حد کو پھلانگنے پر عورت، عورت سے زیادہ طوائف بن جاتی ہے اپنے جسم کی حدود کی حفاظت کرنا اسے عورت بناتا ہے اور عورت ہونے میں ہی بڑائی ہے عورت بھیڑ بکری نہیں کہ اسے اپنی بے بس

ملکیت بنایا جائے۔

بھیڑیں سیاہ اون کے گولوں کی طرح نم آلود سبزے کی قالین پر بکھری ہوئی خوبصورت لگ رہی ہیں۔ ان کے منہ مسلسل تلاش رزق میں جھکے ہوئے ہیں۔ ایک جگہ ٹھہرے ہوئے...... سیاہ اور سفید جلدوں والی بھاری تھنوں والی گائیں باڑوں کے اندر خراماں چہل قدمی کرتی ہوئی پسند کی گھاس پر منہ مارتی اور آگے بڑھ جاتی ہیں۔ اور یہ میرے خوابوں کی دنیا جیسی دنیا ہے خوبصورت چراگاہوں کے درمیان گڑیا گھر جیسا ایک گھر...... جس پر وسیع آسمان جھکا ہوا ہے پہاڑ اپنا چہرہ سبز چراگاہوں میں جھکائے خاموش کھڑے ہیں...... ایک ہی منظر سب طرف پھیلا ہوا ہے اور یہ بلند پرانا قلعہ اور اس کی دیوار نہ جانے کون فاتح ان سرزمین کو مفتوح کر کے آگے بڑھ گئے کتنے انسانوں کا خون ان کائی زدہ سیاہ پڑتی دیواروں کو زیر کرنے کیلئے بہایا خون تو ہر انسان کا ایک جیسا ہوتا ہے وہی سفید اور سرخ کارپوسلز سے بنا ہوا۔ جو زندگی اور خوبصورتی کی ضمانت دیتا ہے۔

قلعہ مجھے اپنی طرف بلا رہا ہے شاید اس نے میرا نام پکارا ہو...... کیا مجھے رک جانا چاہئے شاید یہاں سے اس قلعے کو دیکھے بغیر کیونکر گزر سکیں گے۔

کنوائے

''کنوائے''........ میں سامان کو گھسیٹ رہی ہوں۔ رات اکیلی سڑکوں پر آنکھیں جھپکاتی گزر رہی ہے۔........ بیڈ اینڈ بریک فاسٹ کمرے کی بکنگ ہم پہلے ہی سے کروا چکے ہیں۔ ڈھونڈ لیں گے........ آہ........ اولڈ شپ ہاؤس........ بیل اندر گونج رہی ہے دروازے

میں چابی گھومتی ہے ہائے........ لیڈیز........ ہائے۔ اوہ........ لیس........ کم ان .... اور رات باہر رہ گئی ہے چھوٹے سے خوبصورت سجے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر میری تھکاوٹ کم ہو رہی ہے۔

خوبصورت بیڈ کورز والا بستر........ نرم و گداز........ چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں جن میں پھول اگے ہوئے ہیں اور باہر چھوٹا سا چوک........ اور پھر........ کمپلی منٹری چائے کی کیتلی میں چائے بنا کر پیتے ہوئے میں کھڑکی کے سامنے کھڑی باہر دیکھ رہی ہوں تو یہ ساری زمینیں میرے لیے بھی تخلیق کی گئی تھیں کہ میں ان کی دید سے اپنے ذہن اور دل میں فرحت محسوس کروں........ خدا اور خوبصورتی........ لیکن بے آب و گیاہ صحرا بھی تو اس نے ہی بنائے ہیں ایتھوپیا کے ریگستان جہاں سیاہ فام بلند قامت انسانوں اور جانوروں کو اس انے پانی کی بوند بوند کے لیے ترسایا۔ جہاں ننگے جسموں اور پھولے پیٹ والے بچے سلور کے کٹورے ہاتھ میں پکڑے گرد آلود فضا میں ایک مٹھی چاول کے لیے اپنی بڑی بڑی حیران آنکھیں کھولے منتظر کھڑے ہیں جہاں گرم لو جانوروں کے ڈھانچوں کے اندر باہر سرگرداں پھرتی ہے۔ جہاں زمین کی پیاس بجھانے والا کوئی بادل آسمان کی تپش کو نہیں ڈھانپتا........ میں اعتراض کرنے والی کون........ لیکن ان خوبصورت پھولوں کو چھوتے ہوئے مجھے وہ سب یاد آ رہا ہے۔

میں ڈھلوان گلی سے اتر کر سامنے بنے بڑے سے محرابی دروازے کے باہر جا رہی ہوں اور سامنے والا سمندر زمین کے بازوؤں میں سمٹا فرفرا رہا ہے........ پانچ بجے........ بازار بند ہے۔ صرف ریسٹوران کھلے ہیں۔ ہائے........ کیا ایک آئس کریم کا کپ مل جائے گا........ کیوں نہیں........ ویلکم ٹو کنوائے........ یہاں دیکھنے کو بہت سی چیزیں ہیں۔

آپ یہ قلعہ ضرور دیکھ کر جائیے گا اور پھر سمندر کی لہر ہے........ خیر........ آپ اوپر ویلز کی طرف ضرور جائیں۔ وہاں جہاں سفید برف پہاڑوں کو ڈھانپتی ہے اور سرد ہوائیں نیچے کی طرف سفر کرتی اب اپنے ساتھ ٹھنڈ کو بھی لائیں گی۔ اور میں یہاں کی نہیں ہوں........ میں یونان میں اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتی تھی........ میرا شوہر انگریز ہے اس لیے مجھے یہاں رہنا پڑ رہا ہے........ وہ تیزی سے فرش کو میزوں کو صاف کرتے ہوئے مسلسل باتیں کیے جا رہی ہے۔ یہاں نسان کی انسان کو ضرورت نہیں۔ اسے چیزوں کی ضرورت ہے اسے ٹیلی ویژن کی ضرورت ہے اسے نہ جانے کس کس چیز کی ضرورت ہے۔

ہائے ڈارلنگ۔ مجھے ایک برگر اور گرم کافی کا ایک گلاس۔ بوڑھے گاہک نے اس کے گالوں کو ہلکے سے چومتے ہوئے کہا ہے اوہ بس........ وہ ڈسپوزیبل گلاس میں گرم کافی انڈیل رہی ہے۔ برگر کے اندر سرخ گوشت جھانک رہا ہے۔ کیا کیا جائے........ اس لیے ہی تو میں چکن برگر کھاتی ہوں۔ ایک چھوٹے سے جانور کی گردن کاٹنے میں کم وقت لگتا ہوگا۔ اس لیے مجھے کھانے میں بھی تھوڑا گناہ ہوتا ہوگا........ اوہ........ صفائی کی غیر یقینی حالت نے میرے دل میں نماز پڑھنے کے لیے بھی وسوسے ڈال دیئے ہیں........ اور پھر وضو کے لیے پانی۔ یہاں آپ کو پانی نہیں ملے گا اور میں کوک سے تو وضو کرنے سے رہی اور میں ساقی یا ناصح نہیں ہوں۔ رات ٹی وی پر بڑی اچھی پکچر چل رہی ہے........ میں دیکھ رہی ہوں میری گھڑی میں گیارہ بجے ہیں اور چھوٹا سا گھر بالکل خاموش ہے........ چوک خاموش ہے اور خاموش چوک میں پولیس چوکی کے باہر پولیس گاڑی کھڑی کسی حادثے کی منتظر ہے۔

آج کی رات اس اجنبی قصلے میں خدا کرے کوئی حادثہ نہ ہو........ کہیں........ ہشت........ بیکار سوچیں۔ نیند مری آنکھوں میں گھسنے کی کوشش کر رہی ہے اور پکچر ابھی مکمل

نہیں ہوئی اور کنوائے کی جھیل ساکت ہوگی اور چاند بادلوں میں آنکھ مچولی کھیل رہا ہوگا۔

صبح کے ناشتے کے لیے چھوٹے سے چار میزوں والے ڈرائنگ کمرے میں آ کر بیٹھ گئی ہوں۔ویلش لڑکا ناشتہ دیتے ہوئے چاروں میزوں کے مہمانوں سے باتیں کر رہا ہے وہ خوبصورت چہرے والا بیس بائیس سالہ لڑکا ہے جو اپنے اس گیسٹ ہاؤس کو چھوٹی چھوٹی خوبصورتیوں سے میزین کیے فخریہ انداز میں سب طرف دیکھ رہا ہے۔

تو یہ کنوالے کا قلعہ ہے جس کی بڑے بڑے پتھروں سے گز بھر موٹی دیواریں وقت کے جابر کوڑوں کی ضربوں سے سیاہ پڑ چکی ہیں۔لوگ سمندر میں بجروں میں بیٹھے لہروں پر ہچکولے کھا رہے ہیں۔چپو والی کشتیاں، بادبانی کشتیاں خ موٹر بوٹس اور سمندر کی سیر پر اکسانے کے لیے مائک پر بولتا آدمی جس کی سفید داڑھی ہوا میں اڑ رہی ہے........

''صاحبان یہ آج کا اکلوتا ٹرپ ہے۔آیئے سیر کیجیے۔کنوالے کا قلعہ........ ھینگنگ پل اور سمندری لہروں کا سفر آپ کو لطف دے گا........ جلدی کیجیے........ جلدی آیئے''........

بادل گھرے نیچے سمندر کی طرف اترتے لگ رہے ہیں پانی کی بوندیں میرے بالوں میں اٹک گئی ہیں۔آج اتوار ہے اور لوگ تفریحی موڈ میں ہیں........ اور بوٹ اپنے انجن سے پانی کو کاٹتی آگے بڑھ رہی ہے۔پلوں کے نیچے سے گزرتے ہم سمندر کی وسعت کی طرف جا رہی ہیں۔لیکن کنارا ابھی تک ڈھلوان چراگاہوں نوکیلی چھتوں والی بستیوں میں گھرا ہوا ہے یہ جھیل سمندر سے ضرور ملے گی۔لیکن جھیل کے کناروں پر آبادی ہے۔اور بچے کشتیاں چلا رہے ہیں۔

اور اس کشتی میں انگریز اور نیگرو عورت کی گیہواں رنگ ننھی سی بیٹی سب کو ٹاٹا کر رہی ہے........ ٹاٹا........ میں بھی ہاتھ ہلاتی ہوں۔وہ مجھے غور سے دیکھتی اور پھر مسکرانے لگتی ہے۔ٹاٹا اور محبت کا یہ اظہار کتنا بے ساختہ اور سچا ہے۔اور ان سچائیوں کو وقت بچوں کے ذہنوں

سے بھی کرید کو نکال دے گا اور پھر یہ بھی اپنے ہی جذبوں کے اندھیرے میں صرف جسم کی قید میں چلی جائے گی جیسے ایک جوڑا بیٹھا مسلسل ہونٹوں کا کھیل کھیلتا جا رہا ہے۔ ان کے چہروں پر بے ساختگی کی بجائے نفس کی تپش ہے جیسے وہ اپنے ہی جسم کے عقوبت خانے میں جکڑے گئے ہوں........ بوڑھی خواتین چپ چاپ بیٹھی چائے پی رہی ہیں۔

رات کا خاموش قصبہ قدرے گہما گہمی سے بھر گیا ہے۔ رات جب میں واپس آ رہی تھی تو تین چار افراد ایک گاڑی میں میرے پاس سے گزرے۔ انہوں نے قہقہہ لگا کر زور سے کہا تھا ''پاکستانی''........ تو میں پاکستانی ہوں۔ وہ یقیناً پاکستان گیا ہوگا اور پاکستانی اور ہندوستانی عورت کا فرق جانتا ہوگا........ میں رات کو سوتے ہوئے بھی وسوسوں میں ہمیشہ کی طرح گھری ہوئی تھی۔ لیکن رات عافیت سے گزر گئی۔ میرے ملک میں رات کا خوف ہماری نیندیں حرام کر دیتا ہے دروازہ کھلا نہ رہے۔ بچے ابھی تک کیوں نہیں آئے۔ گاڑی کے دورائے لاک کرو۔ بیل کس نے بجائی۔ جھانک کو دیکھو۔ انجان کے لیے دروازہ نہ کھولو........ روپے بینک میں رکھو........ داخلہ نہیں ملتا........ دکاندار لوٹتا ہے۔ نوکر ذمہ داری سے کام نہیں کرتے۔ ان گنت فکروں نے ہمیں ذہنی بیماری اور پریشانی میں مبتلا کر دیا ہے لیکن یہاں میرے ذہن سے ایسی ساری پریشانیاں اتر کر صرف ایک پریشانی باقی رہ جاتی ہے میں اپنے بچوں سے اتنی دور کیا کر رہی ہوں۔ رات کا پھیر، دن کا پھیر، گھنٹوں کا پھیر۔ اور میں رات کا اپنے گھر والوں کے لیے سندیسہ بھی نہیں دے سکتی وہاں تو دن ہوگا اور وہ زندگی کے کاروبار میں مصروف ہوں گے اور پھر اتنے ہیر پھیر میں نہ چاند نہ رات۔ کوئی بھی میرا سندیسہ میرے بچوں تک لے کر نہیں جائے گا۔

اور ہماری کشتی کا چکر پورا ہو گیا........ ہوا میرے بالوں پر بوجھ بن گئی ہے۔ چلو چھوڑو۔

میں اپنے بالوں کو سنوار کر کیا کروں گی۔۔۔۔۔۔۔۔ تعریفی نظریں جوان چہروں کا طواف کرتی ہیں۔
بوڑھی عورتیں غمزدہ اور خاموش ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔ لیکن وہ تفریح سے واقف ہیں۔

بارش ہو رہی ہے۔ ہم اونچی گلیوں میں خاموشی سے پھر رہے ہیں اور چھتیں بھیگ رہی ہیں۔ درخت بھیگ رہے ہیں اور میں بھی تو بھیگ رہی ہوں اور سمندر بیکراں اور بے کنار وسعتوں کے ساتھ دور بہہ رہا ہے۔

لیکن سب طرف اطمینان سا ہے مجھے لگا جیسے سمندر بھی پانی کا کھیت ہو جسے ہل چلا کر ہموار کر دیا گیا ہو۔

کم اینڈ سی۔۔۔۔۔۔۔۔ وکٹورین گیلری۔۔۔۔۔۔۔۔ چھوٹے سے دروازے پر بورڈ لگا ہوا ہے۔ گول بیضوی پتھروں والی چھوٹی سی ڈیوڑھی کے بعد سیڑھیوں کو طے کرتی میں اوپر چلی گئی ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔ تو یہ بھی موت کا نظارہ ہی تو ہے۔ انسان غائب اور ان کے گھریلو استعمال کی چیزیں موجود۔۔۔۔۔۔۔۔ سیاہ لکڑیوں سے بنی چھتیں اور دیواریں۔ ڈائننگ ہال۔ بیڈ روم۔ کچھ اپنی میزوں اور کرسیوں کے ساتھ۔ اور یہاں اپنے وقت کی خوبصورت عورتیں اپنے لمبے سایوں کو سمیٹی ان بنچوں پر بیٹھی کشیدہ کاری کرتی ہوں گی۔ آتشدان میں لکڑیاں چٹختی ہوں گی۔۔۔۔۔۔۔۔ اور دوسرے کمروں میں ان کے بچے اپنے ٹیوٹروں سے پڑھائی میں مصروف ہوں گے اور ان کے ذہنوں سے موت کا خیال بھی مٹ چکا ہوگا۔ اور وہ زندہ رہنے میں خوش ہوں گی اور ان کے شوہر گھوڑ سواری کرتے، تلواروں سے دشمنوں کا مقابلہ کرتے، کشتیوں کو اجنبی زمینوں پر اپنی وفاداری کی قسمیں کھاتے ہوئے دشمنوں سے مقابلہ کرتے ہوں گے اور پھر یہ قلعہ۔۔۔۔۔۔۔۔ ہمیں ابھی قلعہ بھی تو دیکھنا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ قلعہ اور بادشاہتیں۔ دونوں ہی لازم وملزوم ہیں۔

وکٹوریہ عہد کا مکمل زندگی کا نمونہ۔۔۔۔۔۔۔۔ اور یہ سفید بے نور آنکھوں اور چہرے والا سفید

بت۔ وہ خاموشی سے اپنے ستون پر دھرا ہوا شانت لگ رہا ہے، نیچے لکھا ہے۔

''یہ درزی کا بیٹا انیگو جونز ہے۔ جو ایک مقتدر ویلش آرکیٹکٹ تھا۔ اس کا زمانہ ستارہویں صدی کا ابتدائی زمانہ تھا۔ اس کی تاریخ پیدائش 1573ء ہے۔ یہ اسی سال پیدا ہوا جب بین جانسن کی پیدائش ہوئی اور یہ شیکسپیئر سے نو سال بعد دنیا میں آیا'' اس کے سر پر ایک رومال بندھا دکھایا گیا ہے یہ بت شاک سے بنایا گیا ہے یا سفید سنگ مرمر سے........ میں اسے چھو نہیں سکتی........ چھونا منع ہے........ میں پرانے بلند پشت والے لکڑی کے صوفے پر بیٹھ کر اسے دیکھ رہی ہوں اور ہر سفید چیز اپنی پاکیزگی کی مظہر صرف سفید بے داغ وجود سے ہی ہوتی ہے۔ کردار کی خوبصورتی........ اخلاق کی خوبصورتی، لباس کی خوبصورتی اور ملکہ کا بیڈ روم خالی ہے اور ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں۔

''یہ قلعہ کنگ ایڈورڈ ارل نے 1283ء اور 1287ء کے درمیان ویلز کو فتح کرنے کے بعد تعمیر کروایا''۔ قلعے کے بلند مینار بوسیدہ اور سیاہ ہو چکے ہیں۔ دیواروں کی موٹائی کم از کم پانچ فٹ ہے۔ وہی بربادی اور ویرانی جو گزرے لوگوں، جاتی بادشاہتوں کے نقشِ پا پر ماتم کناں رہتی ہے، کیسے کیسے جابر پیوند خاک ہوئے۔ کیسے کیسے قلعے مسمار کیے گئے۔ میں دروازے کے بیچ چپ چاپ کھڑی ہوں۔ مجھے گھوڑوں کی چاپیں، تلواروں کی جھنکار اور چیخوں کی گونج سنائی دے رہی ہے خون کی سرخی بھی شاید اس کائی بھری سیاہ دیواروں میں شامل ہو۔

میں کنوئیں میں جھانک رہی ہوں۔ پانی تارا سا سطح میں چمک رہا ہے اور کوک کے ٹن، آئس کریم کے خالی گلاس اس پر تیر رہے ہیں اور یہ حقیر چیزیں بھی وقت کے ساتھ لمحے میں قید ہوگئی ہیں۔ ہوائیں موٹی دیواروں سے ٹکراتی پوری رفتار سے سیاحوں سے ٹکرا رہی ہیں جیسے گئے ہواؤں کی کھوج میں سرگرداں ہوں۔ چاروں برج چار کونوں میں کھڑے ثبات پر پہرہ دے

رہے ہیں۔ کمرے، جھروکے، راہداریاں، دیوانِ عام، دیوانِ خاص، جھکی نظریں، سینوں پر جھکے سر، خوف زدہ دل اور فضا کے ہاتھ بادشاہوں کے دامنوں کو ہوا دے رہے ہیں اور یہ دیواریں ان کے جبر کو گواہ ہیں اور ساری بے ترتیبی میں ایک ترتیب ہے میں جھیل کے رخ اوپر کی منزل پر ایک بنچ پر بیٹھ گئی ہوں۔ جھیل کا سفید پانی ہلکورے لے رہا ہے اور کشتیاں چھوٹے دخانی جہاز منظر میں ٹھہرے ہوئے لگ رہے ہیں اور ایک خاندان اپنی تصویریں کھنچ رہا ہے بچہ بھاگ رہا ہے۔

میں کیا ہوں۔۔۔ بڑھاپے کی دہلیز پر کھڑی ایک پاکستانی عورت........ اور ہوا میرے لبادے میں گھسی مجھے کپکپائے دے رہی ہے اور میرے سامنے کا منظر ایک مکمل کائنات بن کر ایستادہ ہے۔ خدائے رب جلیل میں نے تیرا روپ بھی دیکھ لیا........ مجھے محسوس ہو وہا ہے جیسے اس کائنات کو تخلیق کرنے والا خدا، مسلمانوں کے خدا سے کوئی الگ ہستی ہے، مجھے بھی علامہ اقبال کی طرح اس سے گلہ ہے، ہم کیوں پیچھے چھپ گئے........ میرا دل ان کمیوں پر اداس اور خامیوں پر شرمندہ ہے۔ گنبد بلند ہو گئے لیکن میں خاموش بیٹھی ہوں۔ مجھے بار بار احساس ہو رہا ہے کہ میں دس برس سے کائنات کے اس حصے کو دیکھنے آئی ہوں۔ میرا گھٹنا جو پہلے کبھی کبھار درد کیا کرتا تھا، ہلکا ہلکا درد کرنے لگتا ہے۔ سفر........ مسلسل سفر........ میں سنبھل سنبھل کر پاؤں رکھتی ہوں تاکہ درد میں اضافہ نہ ہو۔ ایک مصری نوجوان خاتون دیوار پر بیٹھی مسکرا رہی ہے۔ اس کا شوہر اور بچہ خاموش کھڑے میری طرح ہی سامنے بے آف کنوائے کو دیکھ رہے ہیں۔

انسانی تعلقات کا بہتر ہونا خوشی کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ لیکن دوری کے کنوئیں میں سب کچھ گر رہا ہے۔ سوائے چند ناگوار تکلیف دہ یادوں کے کچھ بھی نظر نہیں آتا........ جیسے کنوائے

کے کنوئیں کی سطح پر تیرتے خالی ٹن۔

سیڑھیاں اترتے ہوئے میں پیچھے مڑ کر قلعے کے دروازے کو دیکھ رہی ہوں........ خدا حافظ۔ میں ایک انسان ہوں۔ گارہ اور پتھر نہیں........ اس لیے مجھے فنا ہونا ہے۔ خدا حافظ۔

اور میں نے کنوائے کی دوسرا تھ میں دو دن بنا دیے ہیں ایک چھوٹا سا بازار........ چائے خانہ۔ پب۔ بینک۔ ہوٹل۔ بیڈ اینڈ بریک فاسٹ تلی مچھلی۔ گرم فرنچ فرائیز۔ آئس کریم۔ لے آف کنوائے کا سرد نیلا پانی اور ایک جملہ پاکستانی........ ایک بلند قہقہہ جو میرے کانوں میں گونجتا جا رہا ہے۔ میں حقیر نہیں ہوں۔ ایک آزاد ملک کی آزاد باسی ہوں۔ اس ملک کی آزادی کی راہ میں عصمتوں کا خون، جان کا نذرانہ، کٹے جسم اور گمشدہ عورتوں کی آنکھوں کی مایوسی کی دھول ہے اور یہ دھول مجھے عزیز ہے........ میری سوچیں کتنی محدود ہیں۔ میں کبھی بین الاقوامی سطح کی ادیب نہیں بن سکتی کیونکہ میں دوسروں کی نظریات کی تبلیغ کرنے میں فخر محسوس نہیں کرتی........ اس لیے میں پاکستانی ہوں........ تم ہنستے رہو........ لیکن کوئی وقت تو ایسا ضرور آئے گا جب تم مجھ پر ہنس نہیں سکو گے........ کب........ وقت کے گرداب میں دن اور رات نہیں ہوتے، صرف سیلِ کارواں ہے جس میں سب کچھ تنکوں کی طرح بہا جا رہا ہے اور وقت جب پلٹ کر آئے گا تو تم مجھ پر ہنس نہیں سکو گے۔

میں کمرے میں بیڈ پر بیٹھی باہر چوک میں جلتی زرد بتیوں کو دیکھ رہی ہوں۔ سڑکیں سنسان ہیں چھوٹے سے پارک پلیسز پر گاڑیاں خاموش کھڑی ہیں۔ آسمان سیاہ بادلوں میں گھرا ہوا ہے ہوا خاموش گلیوں میں آواز پیدا کرتی گزر رہی ہے اور کھڑکی کی سل کے باہر لٹکے ہوئے پھول ہل رہے ہیں۔

ہم مسافر ہیں ''ٹیمپیرس'' رک نہیں سکتی۔ قصلے کی ساری خوبصورتی بھی ہمارے پاؤں کی

زنجیر نہیں بن سکتی۔ آؤ آگے چلیں۔ نظارے ہمارے منتظر ہیں......... میں بس سٹاپ پر کھڑی بس کو آتے دیکھ رہی ہوں۔ ابھی ایک ٹورسٹ بس بغیر چھت والی ڈبل ڈیکر میرے سامنے سے گزری ہے جس میں ادھیڑ عمر عورتیں اور مرد چپ چاپ نظارے سمیٹ رہے ہیں۔ میں ہاتھ ہلا رہی ہوں......... شاید ہم کسی پڑاؤ پر ملیں......... ہاں شاید ہلتا ہاتھ کہہ رہا ہے۔ اس ہلتے ہاتھ نے میرا اور جاتی بس میں بیٹھے انسانوں کا رشتہ استوار کر دیا ہے۔

بس میں سامان رکھ کر ہم نئی دنیاؤں کو چل پڑے ہیں۔ خلیج کے دونوں کناروں پر خوبصورت مکانات قطار در قطار کھڑے ہیں۔ سرخ۔ سیاہ۔ کائی زدہ چھتیں۔ خلیج کبھی وسیع اور کبھی تنگ ہو کر زمین کے بازوؤں میں سمٹ آتی ہے۔ ساری کائنات ایک خوبصورت تصور میں ڈھلتی ہوئی لگ رہی ہے، برساتی نالے میں گہرا سبز پانی تیزی سے بہہ رہا ہے۔ جھکی گردنوں والی سفید بھیڑیں جو مسلسل چارہ کھاتی نظر آ رہی ہیں اور ڈیری فارم کی گائیں اور خاموش گھر۔ سڑکیں ہموار اور صاف ستھری ہیں۔ کہیں سے ایک بالشت سڑک بھی ٹوٹی ہوئی نظر نہیں آتی۔ اور ہمیں تو اپنی گاڑی میں ہچکولے کھانے کی عادت ہے۔ اپنے ملک کی بوسیدگی تکلیف دیتی ہے.........
سڑکیں بنانے والے انجینئر......... ٹھیکیدار اور نہ جانے کون کون حرام کی کمائی کے حصہ دار بنتے ہیں اور ضمیر سوئے رہتے ہیں......... اور بینک بیلنس بڑھتا ہے اور سٹینڈرڈ آف لائف بلند ہوتا ہے اور جسم فربہ ہوتے ہیں اور رعونت بھری گردن اکڑی رہتی ہے۔ میں آنکھیں کھلے رکھے رکھے تھک چکی ہوں۔ میری آنکھیں مند گئی ہیں لیکن خوبصورتیاں پرے باندھے پیچھے کو بھاگتی جا رہی ہیں۔ کھڑکیوں میں رکھے پھولوں کے گملے......... لانوں میں اُگے بڑے بڑے پھولوں کی کیاریاں فطرت کی صناعی۔ انسان کی کاری گری۔ چھوٹے چھوٹے چوک۔ خاموش فضا۔ انسان کدھر چلے جاتے ہیں۔ یہ سوال مسلسل میرے ذہن میں کھٹک رہا ہے۔ سڑکیں سونی

ہیں۔ میرے دل میں تنہائی بڑھ رہی ہے.......بس میں سب خاموش ہیں شاید منزل کے نزدیک آنے پر مطمئن اور شانت۔

........O........

لیمپیرس:

لیمپیرس کا خوبصورت قصبہ......سیاہ سلیٹ کے پہاڑ جھیل کے اوپر سایہ فگن ہیں۔ٹکڑے ہی ٹکڑے جو ایک دوسرے کو سہارا دیئے پڑے ہیں اگر کوئی انہیں ذرا سا بھی دھکیلے کناروں سے اچھل پڑے چھوٹا سا سٹیشن۔ چھوٹی پٹڑی کی لائن......سٹیشن کا چائے خانہ جہاں سب مسافر سیلف سروس سے چیزیں لا کر تھکاوٹ کو دور کر رہے ہیں سامان پاس پڑا ہوا ہے......ہمیشہ کی طرح چکن برگر کے ساتھ کافی پیتے ہوئے باہر دیکھ رہی ہوں۔

لیمپیرس کی سب سے اونچی دھند میں لپٹی چوٹی پر جانے کے لیے چھوٹی سی ٹرین سگنل دے رہی ہے......بھاگو بھاگو......انسان کا مقصد ہمیشہ اونچائیوں پر پہنچنے اور انہیں سر کرنے کا ہونا چاہیے اور پھر یہی لوگ تاریخ کے اوراق بنتے ہیں۔......اونچائیاں نیک مقاصد کی طرف رہبری کرتی ہیں اور پھر ملک ترقی کرتے ہیں ٹرین ہولے ہولے اوپر چڑھتی جا رہی ہے۔ پہاڑ۔ آبشاریں۔ تیز بہتی ندی۔ بل کھاتی سڑکیں۔ سلیٹ کے پہاڑوں کی کھدائی کرتے دو کانکن۔ صرف دو انسان اس وسیع تناظر کو زندہ مخلوق سے جوڑ رہے ہیں اور اس گاڑی میں بیٹھے منتظر آنکھوں والے لوگ ٹرین بڑھتی جا رہی ہے۔ پہاڑ کی ڈھلوان کے کنارے موت کے

قریں اور اس وقت جب ہم سارے انسان اس کائناتی خوبصورتیوں کی دید کے لیے جا رہے ہیں۔ وہ ہمیں ان سے محروم نہیں کرے گا۔ میں دعا مانگ رہی ہوں۔ میرے سامنے بیٹھی خوبصورت بوڑھی عورت اپنے خوف کو دور کرنے کے لیے مسکرا رہی ہے۔ ''وہ کتنی ڈھلوان ہے۔ گہرائی ہے خوفناک'' ہاں خوفناک۔ میں جواب میں مسکراتی ہوں...... اور پھر کھڑکی کی طرف رخ موڑ کر باہر دیکھنے لگتی ہوں۔ ایک بھیڑ عمودی چٹان کے کنارے لاپرواہی سے چر رہی ہے۔ لیکن یہاں بھیڑیں کم ہیں کیونکہ پہاڑ پتھریلے اور بنجر ہیں بڑے بڑے پتھر بے ترتیب سے سب طرف بکھرے ہوئے ہیں۔ جیسے ابھی لڑھک کر ٹرین کی راہ روک لیں گے...... وادیاں اور پہاڑ پیچھے چھٹ رہے ہیں ٹرین آخری پہاڑی کی چوٹی کے ریستوران کے پاس جا کر رک گئی۔ بادل سب طرف بھر بھرے اڑاتے تیر رہے ہیں۔ تیز ہوا میرے بالوں کو گیلا کر رہی ہے میں نیچے دھند میں چھپی وادیوں کو دیکھنے کے لیے چھتری کو سر پر تانے پتھروں کے بنے اونچے راستے پر چلتی اوپر جا رہی ہوں۔ تیز ہوا میرے قدم اکھاڑ رہی ہے اور میں اپنے قدم جمائے رکھنا چاہتی ہوں۔ میں نے ہمیشہ وقت کے چیلنج کو قبول کیا اور اپنی ساری توانائیوں کو بروئے کار لا کر راستے کی سختیوں کو حوصلے سے جھیلا رہے۔ میں جانتی ہوں انسان اتنا بے بس نہیں وہ بہت کچھ ہے۔ کائنات کی امانت کو اٹھائے قرن ہا قرن سے محو سفر ہے۔ اور اپنے آپ کو منوا رہا ہے اور میں بھی اسی لمحے اس دھند میں چھپی چوٹی پر اپنے قدموں کے نشان ثبت کرنے آئی ہوں...... نمی میرے بالوں کو بوجھل بنا رہی ہے۔ میرا لباس نم ہے...... اوہ...... کتنی خوفناک گہرائی ہے۔ میں تند ہوا کے مخالف رخ پر کھڑی ہوں اور اوپر خدا آسمان کی وسعتوں سے اپنی تخلیق کو دیکھ رہا ہوگا اور اس کی فائل میں ان نظاروں کے ساتھ ساتھ میرا بھی نام لکھا ہوگا۔ بادل تیزی سے سفر کرتے اوپر اٹھ رہے ہیں۔ آدھ گھنٹہ گزرنے والا ہے اور مجھے ریستوران کے وسیع

ہال میں میز پر بیٹھ کر گرم کافی کے گھونٹوں سے اپنے جسم میں گھسی سردی کو دور کرنا ہے میں نے اپنی پسند چیزوں کو ٹرے میں رکھا اور کاؤنٹر پر جا کر کھڑی ہو گئی ہوں......ایپل پائی......اور چوکلیٹ......بہت دن ہو گئے میں نے میٹھی چیز نہیں کھائی۔اور پھر میں اتنا چلتی بھی تو ہوں۔

میٹھی چاکلیٹ......بچوں کی فرمائش......امی چاکلیٹ ضرور لائے گا۔ضرور جاتے ہوئے لے کر جاؤں گی۔ہم سب پھر ٹرین میں بیٹھ کر نیچے کو آ رہے ہیں۔فطرت کی وڈیوالٹی چل رہی ہے۔پانی پتھروں سے پتوں سے ٹوٹی پھوٹی شاخوں سے بہہ کر ساتھ ساتھ بنی چھوٹی سی نالی میں بہہ رہا ہے۔اور نہ جانے اسے سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے کتنے زمانے ہو چکے ہیں ......دھند پیچھے چھٹ گئی ہے اور سورج کھڑکی سے اندر جھانک رہا ہے"۔تیز اور تیز......اور جھیل سواگت کے لیے شانت چہرہ لیے ایک منتظر ہے۔

گاڑی نے وسل دی۔اور پھر چھوٹے پلیٹ فارم پر رک گئی......اور اپنا سامان سٹیشن ماسٹر کے کیبن میں چھوڑ گئی تھی......اسے لے کر میں پھر بس کے انتظار میں کھڑی ہو گئی ہوں۔ہمیں پڑاؤ کے لیے کسی نئی جگہ کا انتخاب کرنا چاہیے بس پھر وسیع چراگاہوں اور ڈیری فارموں کے درمیان بنی سڑک پر بھاگ رہی ہے زیادہ تر خواتین اترتی اور چڑھتی ہے۔قصبے ویسے ہی جاذب نظر اور دل ہیں۔سڑکیں صاف ستھری ہیں اور لوگ خوبصورت اور سادہ ہیں۔مائیں مامتا سے بھری ہوئی ہیں اور ان کی آنکھیں ویسی ہی مسکراہٹ سے بھری ہوئی اپنے بچوں کو دیکھ رہی ہیں......اور ان سے دوری مجھے اکثر پریشان کر دیتی ہے۔

بلینو فیٹینوگ......اور اس قصبے کا نام بلینو فیٹینوگ ہے......بڑا لمبا اور مشکل نام جو مجھے بار بار بھول جاتا ہے۔شاید ذہن جب کسی چیز کو یاد نہ رکھنا چاہے تو آپ لاکھ کوششوں کے باوجود بھی بھول جاتے ہیں......بعض اوقات بھول جانا بھی ایک نعمت ہے۔میری دوست اکثر میری

شکایت سن کر مجھ سے کہتی ہے۔

''چھوڑو۔لوگوں کی زیادتیاں بھول جانا ہی بہتر ہے۔ارے اتنی چھوٹی سی تو زندگی ہے اور ہم اسے نفرتوں کدورتوں منافقتوں میں ضائع کر دیتے ہیں۔ مجھے دیکھو میں کبھی بری بات کو دل میں نہیں رکھتی...... میں چاہتی ہوں سب خوش اور پر امن رہیں۔'' میں نے ان کے بتائے فارمولے پر عمل کرنا چاہا تھا۔مجھے بھی نیک فطرتی سے پیار ہے لیکن لوگوں کی منافقتوں کو دیکھ کر دکھ ہوتا ہے۔اپنی محبتوں کے ضائع ہونے پر میرا دل رنجیدہ اور اداس ہو جاتا ہے میں محبت بھرا سلوک کرنا اپنا فرض سمجھتی ہوں لیکن بدلے میں بھی ویسا ہی سلوک مانگتی وں۔میں شاید نروان کے اس لمحے تک نہیں پہنچی جو انسان کو نیک اور پارسا بنا دیتا ہے۔میں تو ایک انسان ہی ہوں اور دینے اور لینے کے فارمولے پر یقین رکھنے والا انسان......

ایک بار میں اور کشور ناہید باتیں کر رہے تھے۔اس نے کہا تھا......''میں اس نروان کے لمحے سے گزر چکی ہوں جب کچھ کرنے کے بعد بدلے کی طلب نہیں ہوتی...... میں جو کر سکتی ہوں کر دیتی ہوں اور بس......'' اور میں نے اس کے کہے کو سچ مانا تھا کیونکہ وہ دوسروں سے کبھی کئے کا بدلہ طلب نہیں کرتی...... اگر آپ اس سے محبت کرتے۔اسے سراہتے اور اس کی تعریف کرتے ہیں تو وہ کبھی آپ کا شکریہ ادا کرنے نہیں آئے گی......وہ واقعی زروان کے لمحے سے گزر چکی ہے......اور میں اس نروان کے لمحے کو پانے کے لیے کدورتوں کے داغ برداشت کرتی ہوں...... پریشان ہوتی ہوں۔آنسو بہاتی ہوں لیکن اس راہ پر چلنا نہیں چھوڑتی......میرے اندر ایک ہم زاد ہمیشہ محبت کی طلب میں اپنا سہ لیے آپ کی طرف دیکھتا ہے۔مسکراتے ہوئے...... پوری دیانت داری اور سچائی کے ساتھ۔

اور اس قصبے کا نام بلینو فیٹینوگ ہے......عاشی ہوٹی کے اندر ایک رات رہنے کا ریٹ

پوچھنے گئی ہوئی ہے۔ میں باہر کھڑی سامنے کے بلند پہاڑ کو دیکھ رہی ہوں جو پتھریلی چٹانوں سے بنا بادلوں میں چھپا ہوا ہے اس کے دامن میں کوئلے کی کانوں کے اندر جانے والی گاڑیاں کھڑی ہیں۔

میں نے وقت دیکھا ہے...... ساڑھے پانچ بج چکے ہیں۔ دکانیں بند ہیں بازار سونا ہے لیکن سات آٹھ برس کے چند ہم عمر لڑکے اپنی سائیکلوں، سکیبورڈ، ٹوٹی ہوئی جیپ اور لکڑی کی بنی ہوئی چھوٹے پہیوں والی گاڑی لیے میرے پاس آ کر کھڑے ہو گئے ہیں...... "ہیلو...... تم ایک ٹورسٹ ہو" ہاں...... میں جو دنیا کے سارے بچوں سے پیار کا رشتہ رکھتی ہوں انہیں خوش آمدید کہتی ہوں۔ وہ سب روشن چہروں چمکیلی آنکھوں والے پر اعتماد بچے ہیں...... وہ شاید میری ناک میں پڑی کیل کو دیکھ کر رک گئے ہیں...... "یہ کیا ہے" ایک بچے نے اپنے ناک پر انگلی رکھتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ میں انہیں کیا بتاؤں...... وہ شاید میرے ملک کا نام بھی جانتے نہ ہوں...... لیکن ان کو جواب تو دینا چاہیے۔

"یہ میں نے خوبصورت نظر آنے کے لیے پہنا ہے۔" "لیکن میری ماں تو نہیں پہنتی۔" وہ حیران ہو کر بولتا ہے۔ "لیکن ہمارے ملک میں عورتیں پہنتی ہیں"...... تم کس ملک سے آئی ہو۔"...... وہ میرے لباس پر حیران ہیں۔ کیا تم پاکستان کا نام نہیں جانتے۔" انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا ہے" پاکستان ایشیا میں ہے...... کیا تم عمران خان' جہانگیر خان اور مارشل لاء کے بارے میں کچھ جانتے ہو"...... "نہیں"...... ان سب نے سر کو نفی میں ہلا دیا ہے۔ میں انہیں بتا رہی ہوں...... لیکن وہ نقشوں کی مدد کے بغیر کیسے جان پائیں گے اور میرے پاس نقشہ نہیں...... نقشے تو میرے بیٹے فیصل کے پاس ہیں اور فیصل پاکستان میں ہے۔ لیکن پھر بھی ویلش یا فرنچ بول سکتی ہیں...... نہیں۔ "کیا تم اردو بول سکتے ہو"...... "نہیں" وہ سب اونچی آواز

میں بولے ......اور پھر ہم مل کر ہنسنے لگے۔ مجھے لگا جیسے میں اور وہ ہمیشہ سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ وہ آپس میں اور میرے ساتھ باتیں کر رہے ہیں اور میرے دل سے اجنبیت کا بوجھ کم ہو رہا ہے۔

ہم پھر ملیں گے۔ میں نے سامان کو اٹھا کر اندر جاتے ہوئے کہا ہاں ہم پھر ملیں گے وہ ننھے فرشتے سامنے کھڑے مجھے اندر جاتا دیکھ رہے ہیں......اجنبی دوست......

ابھی سورج کی آخری کرنیں خاموش قصبے کی چھتوں پر پڑ رہی ہیں' میں قصبے کی سیر کے لیے باہر آ گئی ہوں۔ وہ دور بچوں کے پارک میں کھیل رہے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کو وِیو کرتے ہیں' دوستی دل کے اندھیروں میں چمکدار کرن کی طرح اجاگر کر دیتی ہے۔ لیکن بعض لوگ اس روشنی کو اپنی آنکھیں بند کر کے باہر دھکیل دیتے ہیں......ان ننھی سی مسکراہٹوں نے میرے اندر کا بوجھ کم کر دیا ہے اور پھر میں نے دیکھا ہے کہ سب لوگ ایک دوسرے کو ہائے ہیلو کہتے ہوئے گزر رہے ہیں۔ اس زندگی میں اپنائیت اور خلوص ہے۔ ہم شاید پہلی پاکستانی خواتین ہیں جو ویلز کے اتنی دور تک چلی آئی ہیں۔ جہاں گرد بننے کی خواہش میں ہم سڑک کے اوپر کی طرف جا رہے ہیں۔ دور پہلی بار میں نے ایک گراؤنڈ میں جوان لڑکے لڑکیوں کو فٹ بال کھیلتے دیکھا ہے...... پہاڑ اوپر اور بلند اٹھ رہے ہیں۔ سنگین جالیوں میں جکڑے ہوئے پتھر سڑک کے کنارے بہتے گہرے نالے کی دیوار پر رکھے ہوئے ہیں......اکا دکا گاڑیاں آ رہی ہیں...... میں چلتی جا رہی ہوں۔ دور جانے میں ڈر لگ رہا ہے لیکن آج تک خدا نے ہی تو حفاظت کی ہے اور مجھے اس بات پر بھی پختہ یقین ہے کہ مجھے اسی نے یہاں بھیجا ہے...... پھر میں کیوں ڈروں...... وہ ضرور حفاظت کر رہا ہوگا۔ اے خدا رب العزت ہماری حفاظت کر میں نے پھر دعا مانگی ہے۔ ہم پلٹ کر بازار کی طرف چل پڑے ہیں ایک بند دکان کے سامنے پانچ چھ لڑکیاں

بیٹھی گپیں لگا رہی ہیں وہ نہ جانے کیا باتیں کر رہی ہیں، فٹ پاتھ پر دوسری طرف کھڑی ہو گئی ہوں۔ تو اس قصبے میں انسان بستے ہیں۔ ان کے گھروں کے دروازے کھلے ہوں گے...... وہ پیاری سی لڑکیاں اپنےمیں مگن باتیں کیئے جا رہی ہیں۔ محبتوں کے دکھ جدائیوں کے قصے آپس میں ٹھٹھول...... دوسروں کی باتیں سننا گناہ ہے اور میں یہ گناہ کر رہی ہوں۔ انسانوں کو جاننے کے لیے ان کے چہروں کو پہچاننا اور ان کی آوازوں کو سننا بے حد ضروری ہے...... اور ہمارے دیہات کی لڑکیوں کی طرح جو رات کے پردے میں اکٹھے ہو کر گایا اور ناچا کرتی تھیں، بیٹھی وقت گزار رہی ہیں۔ سارا منظر بے حد اپنا اپنا نظر آ رہا ہے...... کچھ دور چند نوجوان لڑکے آپس میں مصروفِ گفتگو ہیں تو یہاں بھی اخلاقی اصولوں کو مانا جاتا ہے میں ان سے کیونکر پوچھوں۔ وہ شاید میری مداخلت پسند نہ کریں۔ میں نے بیف برگر اور ہاٹ کافی کو پیتے ہوئے دل ہی دل میں کہا ہے...... اور میں نے کسی کو بھی ایک دوسرے جڑتے اچکتے نہیں دیکھا۔

اور رات پہاڑوں کی ڈھلوانوں سے نیچے اتر رہی ہے اور وہ سارے بچے گھر کے گرم ماحول میں پلٹ گئے ہیں...... اور لڑکیاں ابھی تک باتیں کیئے جا رہی ہیں۔ سب طرف مکمل خاموشی ہے۔ قدموں کی گونج بھی نہیں صرف میرے قدم آواز پیدا کر رہے ہیں ہمارے ہوٹل کے بار روم میں جوڑے بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں۔ بوڑھا سفید ریش پر ہاتھ پھیرتا آنکھیں بند کیئے بھرے گلاس کو تھامے پی رہا ہے۔

صبح پردوں سے جھانک رہی ہے میں سر کو تکئے پر رکھے سوچ رہی ہوں کہ اس سارے سفر نے مجھے کیا دیا۔ درخت۔ پہاڑ۔ نالے۔ ندیاں۔ دریا جھیلیں۔ سمندر دیکھنے کے لیے اتنا دور کا سفر کرنا ضرور تھا۔ کیا میرے ذہن نے کچھ پایا بھی یا میں بھی بے عقل لوگوں کی طرح ساری نعمتوں کا شکریہ ادا کیئے بنا خود پسندی کے خول میں لپٹی رہوں گی۔ ابھی مجھے کچھ سمجھ نہیں

آ رہا...... سفر وسیلہ ظفر ذہن کھلتا ہے۔ آئی کیو وسیع ہوتا ہے دوست بنتے ہیں...... لیکن میں اس عمر سے گزر چکی ہوں جب ہر نیا انسان ہوا کا نیا جھونکا پھول کا نیا رنگ۔ آپ کو اپنی طرف کھینچتا ہے...... اور آپ بے اختیار مسکرا دیتے ہیں' لوگوں سے خواہ مخواہ محبت کرتے ہیں۔ آپ کے اندر نفرتیں بھی خورو گندی جڑی بوٹیوں کی طرح بغیر ضرورت کے اگ آتی ہیں اور کبھی کبھار تو ہمارے اندر صرف نفرتوں کا ہی کوڑا بھر جاتا ہے اور وہاں اچھائیاں داخل ہی نہیں ہو سکتیں...... اور پھر گلیوں میں خون بہتا ہے۔ عصمتیں تار تار ہوتی ہیں۔ ڈاکے پڑتے اور معصوم لوگ لوٹے جاتے ہیں...... لیکن کیوں...... میں اس سوال کا جواب جانتی ہوں لیکن ہمیشہ "کیوں" کا یہ لفظ میرے ذہن کو پریشان رکھتا ہے...... اور سارے بے گناہ انسان اس کیوں کا جواب مانگتے ہیں۔ کبھی خدا سے اور کبھی ارباب اقتدار سے۔ یہاں بھی زندگی کے مسائل ہیں۔ لیکن لوگ ایک دوسرے سے نفرت نہیں کرتے۔ میں نے اتنے دنوں سے کسی دو انسانوں کو لڑتے نہیں دیکھا وہ سب ایک دوسرے کا حق تسلیم کرتے اور اپنے دائروں میں خود مختار ہیں۔ لیکن ہم تو اپنے آپ کو بڑا بنانے کے لیے دوسروں کے سروں کو کاٹتے ہیں۔ دوسروں کی ذات کی نفی کرتے ہیں تا کہ بونوں میں ہمارا قد بڑا لگے۔ ہم نے تمام بہتر اور بلند اصولوں کو خود پسندی کی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ ہماری ذات کے دیوتا کے سامنے انسانی جذبات کا بلیدان دیا جاتا ہے۔ ہم تلوار کی دھار پر اپنوں اور پرایوں کو رکھنے سے نہیں گھبراتے۔ ہمیں اپنی اچھائیاں تسلیم کرتے ہوئے بھی عار ہے۔ مشتاق یوسفی صاحب کی دعوت میں ایک بی سی سی آئی کے بلند مرتب افسر نے کہا تھا...... "پاکستان کا اپنا کوئی کلچر نہیں۔ یہ تو دبی کلچر ہے" اور میں جوان سب میں اجنبی تھی خاموش نہ رہ سکی...... میں نے جواب دیا "نہیں صاحب پاکستان گزرے چالیس برس میں ہندو ثقافت سے اتنا دور جا چکا ہے کہ دونوں کو آپس میں خلط ملط کرنا ناممکن ہے۔ ایک

پاکستانی کے چہرے کی طمانیت' اس کا اپنے پر اعتماد' اس کا بھرا پیٹ' ہندوستان کی فاقہ زدہ رعایا سے قطعی مختلف ہے۔ دبئی میں پاکستانی کلچر ایکسپورٹ ہو رہا ہے دبئی کا اپنا کلچر تو صحرائی ہے اور صحرا آج کے زمانہ کا سمبل نہیں۔ "اچھا" وہ ہولے سے بولے...... "بڑی اچھی بات ہے"۔

اور مسز عابدی مسکرا کر بولی تھیں۔ "بھئی ہماری عورتیں بڑی سمارٹ اور خوبصورت ہیں بہت اچھی لگتی ہیں۔ ہمیں تو وہ بڑی اچھی لگتی ہیں"۔ افتخار عارف بولے...... "جب میں ہندوستان کے ایک مشاعرے میں گیا تو میری آنکھیں اصلی اور سچی خوبصورتی کو دیکھنے کو ترس گئیں۔ لندن سے وہاں جا کر ایک دم خلاء کا احساس ہوتا ہے۔"

اور بستر پر لیٹے میرے اندر بھی خلاء کا احساس ہو رہا ہے...... یہ سارے دن' ساری مسافتیں میرے دل کے باہر کھڑی مجھے پکارتی ہیں۔ وہ میرے دل کے اندر اتر نہیں پائیں...... شاید میں بھی ایکسٹر یمٹ رہنا برداشت کر لوں گی لیکن نظر انداز ہونا پسند نہیں کروں گی۔ میں نے سر اٹھا کر پردہ کھسکا کر پہاڑوں سے اترتی دھند کو بستی کو اپنی لپیٹ میں لیتے دیکھا ہے۔ رات والے میرے ننھے دوست اپنے اپنے بستروں میں خرگوش کی طرح لپٹے سو رہے ہوں گے۔ خوبصورت لڑکیاں خواب دیکھ رہی ہوں گی اور مائیں ناشتے کی تیاری میں آ جا رہی ہو گیں۔ وہ گھر آ کر ضرور کہتی ہوں گی کہ آج بھی میں نے کچھ نہیں سیکھا...... کسی کو کوئی کچھ سکھاتا ہی نہیں...... اور پھر وہ مایوس ہو کر رونے لگے گی...... اس کے اندر کا سٹوڈنٹ بڑا مایوس ہے اور ہماری ساری قوم روتی ہے...... سچائی اور محنت کا راستہ کوئی اپنانا نہیں چاہتا...... اس لیے تو ہم پیچھے چھٹنے والوں میں سے ہیں۔ ہم ماتم کرتے ہیں اور دوسروں کی خامیوں کا لیکن ہمیں اپنی ذات کی خامیاں نظر نہیں آتیں...... اور میرا ذہن گڈمڈ خیالات سے بھاری ہو رہا ہے...... مجھے تیار ہو کر نیچے ڈائننگ ہال میں جانا ہے۔ دھند پھوار کی صورت بارش میں ڈھل رہی ہے۔ شاید

اسی موسم کے لیے میں نے دو پونڈ میں چھتری خریدی تھی جو ابھی تک استعمال میں نہ آنے کی وجہ سے مصیبت بنی ہوئی تھی...... ویٹرس بڑی عجلت اور بے دلی سے ہمیں ناشتہ کروا رہی ہے' یہاں کاروباری ملائمت اور کرٹسی کا فقدان ہے ڈائننگ ہال کی کرسیاں اوندھی پڑی ہیں میز کے ایش ٹرے سگرٹوں کے ٹکڑوں سے پٹے پڑے ہیں ایک لمبے قد والی ویٹرس صوفے پر ٹانگیں رکھے کھڑکی سے باہر چند مردوں کی تیز تیز باتیں سننے میں مصروف ہے' وہ مسکرا رہی ہے سدا بہار پھول مسکرا رہے ہیں بارش مسکرا رہی ہے' میری چھتری مسکرا رہی ہے' میں چھتری کو تانے جانے سے پہلے آخری راؤنڈ کے لیے باہر آ گئی ہوں۔ سب کچھ گیلی دھند کی چادر میں لپٹا ہوا ہے۔ لوگ چھتریاں تانے کاموں پر' بسوں کے اڈے پر یا ٹرین کے لیے جا رہے ہیں...... سڑک کنارے چند خوبصورت لڑکیاں گھریلو چیزیں' گڑیاں' کیک' پنسلیں اور نہ جانے کیا کیا بیچ رہی ہیں...... خرید لیں...... وہ کسی ادارے کی مدد کرنا چاہتی ہیں۔ میں آگے بڑھ کر کیک کو دیکھ رہی ہوں...... صرف دو پونڈ...... صرف دو...... یعنی چونسٹھ روپے...... میں نے فوراً ضرب دے ڈالی۔ اور یہ پنسل میرے چھوٹے بیٹے نے دو درجن پنسلوں کے لیے بھی تو کہا تھا۔ ایک پنسل پچیس پاکستانی روپے...... توبہ توبہ...... اور دو درجن...... ناممکن...... لڑکیاں پرامید نظروں سے میری طرف دیکھ رہی ہیں۔ لیکن میں آگے بڑھ کر سٹیشنری کی دکان میں داخل ہو گئی ہوں...... چند ویو کارڈز خریدنے کے لیے۔ دس پینی۔ یعنی۔ پاکستانی روپے نہیں میں ہر مزے کو ضرب سے بے مزہ کر دیتی ہوں۔ ہاں کارڈوں کی قیمت مناسب ہے۔ چیزیں بیچنے والی لڑکیاں مسکرا رہی ہیں دنیا مسکرا رہی ہے اور میں اس تاریخی ٹرین میں سوار ہونے کے لیے جا رہی ہوں۔ جو اپنے ایک سو پچاس برس پورے کر چکی ہے یعنی 1836ء تا 1986ء چھوٹی سی ٹرین جیسی ہمارے چھانگا مانگا کے پارک میں چلتی ہے۔ پچاس پونڈ کی ٹکٹ ابھی تک کام کر رہی

ہے۔ٹرین مزے مزے سے کسی تفریح پسند بچے کی طرح خراماں خراماں چلتی جارہی ہے۔نالے چشمے۔ندیاں جھیلیں۔کھیت۔سبزہ۔جنگل۔پہاڑ۔قصبے۔ٹرین چل رہی ہے...... سب کچھ ہر لمحہ بدلتا جارہا ہے اور جب دوبارہ نظر آتا ہے تو جھیل کی صورت اختیار کر چکا ہوتا ہے۔بطخیں گردنیں اٹھائے ٹرین میں بیٹھے مسافروں کو گھور رہی ہیں۔بارش کی چادر مسلسل تنی ہوئی ہے...... فطرت نوحہ کناں ہے۔کون سا غم اسے پریشان کرتا ہے کس کی جدائی اس کا خون کئے دے رہی ہے حالانکہ یہاں کا ہر مسافر ٹکٹ لیتا ہے کوئی غیر ٹکٹ کے سوار نہیں ہوتا۔پھر...... یقیناً ان کا خزانہ بھرا ہوا ہوگا۔ان کی سرحدوں پر کوئی پریشانی نہیں...... یہ لوگ اتنے مطمئن تو ہیں...... ہماری طرح خوف اور وسوسوں کی دلدل میں گرتے نہیں رہتے۔زیادتیوں کا ماتم کرتے عمر نہیں گزار دیتے...... پھر فطرت کیوں نوحہ کناں ہے۔بلیتیو فیتینوگ کا قصبہ پیچھے چھوٹ گیا۔جہاں میں نے رات گزاری تھی جس کے کمرے میں چائے کو اپنی مرضی سے بنا کر پی لیتی تھی۔ایک سٹیشن آیا ہے اور عورت کے بچے کو ڈرائیور نے تھام رکھا ہے تاکہ ماں اس کے لیے پرام کھول لے۔اب بچہ اور ماں بارش میں خوبصورت پلیٹ فارم پر چلے جارہے ہیں۔یہاں میں نے تمام بچوں کو بے حد صحت منداور خوش وخرم پراموں میں بیٹھے دیکھا ہے۔مائیں بچوں کو پالنا انہیں خوبصورت اور جاذب نظر بنانا جانتی ہیں۔یعنی یہاں انسان کو انسان سمجھا جاتا ہے۔انسان جو کائنات کا حاکم ہے جو پرتو خداوند ہے۔جو فرشتہ صفت اور پاکیزہ ہے...... لیکن پھر...... پھر کیا ہوتا ہے کہ وہ جسم کی دلدل میں گر جاتا ہے۔

ہائے...... ایک خاتون نے میرے پاس سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا ہے...... ہائے...... لیکن ہمارے درمیان بات کرنے کا کوئی موضوع نہیں۔لیکن یہاں ہر کوئی دوسرے سے مسکرا کر بات کرتا ہے۔یہ لوگ روشن فطرت کی ہمسائیگی میں رہنے سے فراخ دل

اور دوست نواز لگتے ہیں۔ سب طرف پہاڑ ہیں نالے ہیں...... دریا اور جھیلیں ہیں۔ خدا بیٹھا زمین کے کینوس میں رنگ بھرتا جاتا ہے...... زرد خزاں درختوں کی شاخوں سے جھانک رہی ہے۔ لیکن زمین پر بکھرے ہزاروں رنگ بہار کے ثبات کا قصیدہ ہیں۔ اب ہم بس میں بیٹھے آگے جا رہے ہیں۔ ویلز کی خوبصورت زمین ہمارے آگے پیچھے اپنی تمام توانائیوں' وجاہتوں اور رعنائیوں کے ساتھ پھیلی ہوئی ہے۔ اب قصبوں میں گھروں کے سامنے کے چھوٹے چھوٹے لان پتھر کی موٹی دیواروں میں گھرے ہوئے ہیں۔ مکانوں کا ایک جیسا نقشہ دیکھتے دیکھتے میں تھک سی گئی ہوں۔ مجھے لگتا ہے جیسے صرف ایک ہی قصبہ دیکھ رہی ہوں۔ مکمل خوبصورتی کا ایک ہی تصور۔ فطرت کے وہی رنگ...... درخت چراگاہیں سفید بھیڑیں چتکبری گائیں۔ سفید لوگ۔ خوبصورت سنہری بالوں والی عورتیں۔ لمبے دراز قد خاموش طبع مرد۔ محبت کرنے والے جوڑوں کا ایک ہی انداز۔ شراب خانوں میں ایک جیسی اوندھی بوتلیں۔ جھاگ اڑاتی شمپئن ...... مجھے ہچکولوں سے نیند آ رہی ہے لیکن میں نے سونا نہیں چاہتی۔ مبادا کوئی خوبصورت سین میری نظروں سے اوجھل ہو جائے...... انسانوں کے بغیر قصبے...... چوک...... مین بازار کی دکانیں...... ہسپتال...... سکول...... انسان اور انسان کی برتری۔

اب پہاڑ پیچھے چھٹ گئے ہیں یا دور ہٹ کر کھڑے آسمان کی نیلی شفاف سطح کو گھور رہے ہیں۔ کھیتوں کا اتار چڑھاؤ ہتھیلی کے ابھاروں کی طرح کہیں سے زیادہ کہیں سے کم ہے۔ قصبوں میں بس رکتی' مسافروں کو اتارتی' سوار کرتی بڑھتی جا رہی ہے...... اوہ...... یہاں عورتوں کے قد دراز نہیں۔ وہ نسبتاً کوتاہ قد ہیں۔

ہماری بس ایک سکول کے سامنے آئی ہے۔ سکول سے لڑکے اور لڑکیاں سوار ہوئے ہیں وہ شور مچاتے ایک دوسرے کو دھکیلتے ڈبل ڈیکر کے اوپر کے حصے میں سوار ہو رہے ہیں...... میں

بس کے اوپر کے حصے میں سامنے کی سیٹ پر بیٹھی ہوئی ہوں۔ وہ اجنبی اور غیر مانوس چہرے کو دیکھ کر جھجکے اور پھر پیچھے چلے گئے...... ایک لڑکا جوان میں بڑی عمر کا لگتا ہے۔ بے ہودہ شور مچا رہا ہے۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے۔ کہ وہ ویلش میں ہمارے بارے میں دوسروں سے فضول باتیں کر رہا ہوگا...... ویسا ہی لڑکا ہے جو فلموں میں دکھائے گئے سکولوں میں غنڈے کا کردار ادا کرتے ہیں۔ لڑکیوں کو چھیڑتے۔ چھوٹے بچوں پر جنسی تشدد کرتے ہیں۔ وہ ہمارے بارے میں متجس ہیں اب وہ میرے پاس کی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئے ہیں۔ میرا جی ان سے باتیں کرنے کو چاہتا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ ان کو پاکستان کے بارے میں بتاؤ۔ میں کہوں......

بچو......! تم جانتے ہو کہ ہم کتنی دور سے تمہاری اس خوبصورت بستی کو دیکھنے آئے ہیں۔ وہاں بھی تمہارے جیسے شریر بچے سکولوں میں جاتے ہیں وہاں بھی کوئی نا کوئی غنڈے کا کردار ادا کرتا ہے۔ انہیں نشے کی سگرٹوں کا عادی بنا دیتا ہے۔ اور پھر ان کے مستقبل کو تاریک بنا کر اپنے آقا کا حکم بجا لاتا ہے اور ہمیں لگتا ہے جیسے ہماری ساری زندگی کسی نہ کسی آقا کی رہین منت ہے۔

وہ لڑکا فضول طریقے سے ایک لڑکی کو چھیڑ رہا ہے لڑکی اونچی آواز میں چیخ رہی ہے لیکن کوئی اس بات کو اہمیت نہیں دے رہا...... خدا کا شکر ہے ہمارے ملک کی بیٹیاں اس واہیاتی سے محفوظ ہیں میں حیران ہوتی خاموشی سے انہیں دیکھ رہی ہوں۔ شاید روزمرہ کی شرارت ہو...... وہی لڑکی اب ہنس رہی ہے۔ اب وہ راستے میں اترتے جا رہے ہیں اور وہ بدمعاش لڑکا آخری بس سٹاپ لیمپیرس میں اترا ہے وہ بڑے جارحانہ انداز سے ہمیں گھور رہا ہے۔ لیکن فکر کی کوئی بات نہیں...... پولیس موجود ہے اور پھر ہم ٹورسٹ ہیں اگر کسی ٹورسٹ کا کوئی گزند پہنچی تو ان کی اپنی بدنامی کا رڈ بھی تو ہے اور یہ لوگ بڑے محب وطن اور باشعور ہیں اور اپنی شہرت کو بڑی

اہمیت دیتے ہیں۔

ہم لیمبیرس میں پھر پلٹ آئے ہیں۔ یہ قصبہ اپنی خوبصورتی کی وجہ سے میرے دل میں گھس گیا ہے۔ یہاں ایک رات گزارنا ضروری ہے......اور یہ راوکٹوریہ ہوٹل ...... پہاڑ کے سائے تلے۔ گیارہ پونڈ اور چالیس پینس پر ہیڈ...... پر نائٹ......اب میں صرف پونڈ کو پونڈ کی صورت میں دیکھتی ہوں۔ مجھے ڈر ہے میرے پونڈ ختم نہ ہو جائیں۔ ابھی مجھے بہت کچھ دیکھنا ہے۔ میں خدا کی شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے جس نے گزرے برسوں میں کبھی لاہور بھی پوری طرح نہیں دیکھا تھا ایک دم غیر ملکی وسعتوں میں دھکیل دیا ہے لیکن میں گھر سے دوری کو فکر مندی سے محسوس کر رہی ہوں۔ میرے بچوں کو میری ضرورت محسوس ہوتی ہو گی......گھر کے نوکروں کو میری چھوٹی بیٹی کیونکر سنبھال پائے گی۔ فیصل ہمیشہ کی طرح بغیر ناشتہ کیے سکول جانے کی کوشش کرتا اور میرے شوہر بہت سی باتوں میں ضرورت سے زیادہ فکر مند ہوں گے۔ لیکن آسانی سے پلٹنا مشکل ہے۔ میں نے ٹکٹ پر ہزاروں روپے خرچ کئے ہیں......ایک لمبا سفر کیا ہے کئی کانٹینینٹل کو عبور کیا ہے......وکٹوریہ ہوٹل کئی منزلہ ہزاروں روپے خرچ کئے ہیں......ایک لمبا سفر کیا ہے میں نے جھیل کے رخ کھڑکیوں والا کمرہ مانگا ہے......یس میڈم......ہم آپ کو ایسا ہی کمرہ دیں گے۔ پورٹر سامان اٹھا کر لے جا رہا ہے۔ لفٹ سے اتر کر لمبی راہداریوں کو عبور کر کے اس نے ایک دروازہ کھولا ہے۔ میں کھڑکی کھول کر کھڑی ہو گئی ہوں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا، سیاہ سلیٹ کے پہاڑ......دور پہاڑوں پر دھند......اور ضرور مسافر اس دھند میں چھپی چوٹیوں کو دیکھنے چھوٹی ٹرین پر سوار جا رہے ہوں گے۔ وہ بھی نظاروں سے محظوظ ہوتے گھاٹیوں سے خوفزدہ ہوتے خوشی سے بھرپور سا چوٹی پر جائیں گے جو دھند میں نظر نہیں آتی۔ میں کھڑکی میں کھڑی سٹیشن پر اترتے مسافروں کو دیکھ رہی ہوں۔ آخری پھیرا مکمل ہوا......رات آسمان کے

کونے سے بادل کے جھروکے سے جھانک رہی ہے......اور مجھے ابھی قصبہ دیکھنا ہے۔قصبہ دیکھنا ضروری ہے کیونکہ مجھے ہر حال میں اگلے پڑاؤ کی طرف کوچ کرنا ہے......میں خاموش قصبے میں آہستہ آہستہ تفریح کرتی پھر رہی ہوں......دکانیں بند ہو رہی ہیں اور پھر جادو کا ڈنڈا خاموشی کے جن کے ہاتھ میں ہے اور وہ سب طرف پرواز کرتا اسے گھما رہا ہے۔سو جاؤ۔سو جاؤ ورنہ۔لیکن بیکری اور چائے خانے ابھی تک کھلے ہوئے ہیں جیسے ہمارے ملک میں آدھی رات تک پان اور کوک کی دکانیں کھلی رہتی ہیں۔

میں ایک ریسٹوران میں گھس گئی ہوں......رات آ رہی ہے۔پلیز چپس اور بگ بیف برگر اور نہ جانے اس گائے کو کس نے ذبح کیا ہوگا اور وہ کونسی چراگاہوں میں فربہ ہوتی رہی ہو گی۔اور اب اس کے ایک حصے پر میرا نام بھی لکھا گیا تھا۔حلال اور حرام......اور اللہ تعالیٰ نے کلام مقدس میں فرمایا ہے کہ......"حلال چیزوں سے کھاؤ اور میرا شکر ادا کرو" اور میں جو تمام زندگی اس کے حکم پر چلنے کی کوشش کرتی رہی ہوں......اب اس کی حکم عدولی کر رہی ہوں......اور خدا معاف کرنے والا ہے کیونکہ چائے خانے والے کے پاس چکن ختم ہو چکا ہے اور میرے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں اور رات سر پر ہے......رات جو میں اپنے گھر سے دور گزار رہی ہوں......آدھی رات کس سے کہوں گی کہ مجھے بھوک لگی ہے اور پھر میری بیٹی تو یہاں نہیں جو مجھے کچھ نہ کچھ کھانے کو دے گی......

میں کھڑکی کے پاس بیٹھی آہستہ آہستہ کھا رہی ہوں۔چائے خانے کا آخری آدمی میزوں پر کرسیوں کو اوندھا کر کے رکھ رہا ہے۔ایک اشارہ ......تم جاؤ...... مجھے بھی جانا ہے......میں اس نظارے سے محروم نہیں ہونا چاہتی۔میرے سامنے پہاڑ کے پس منظر میں خوبصورت آسمان نظر آ رہا ہے......سورج کی کرنیں پہاڑ کی سیاہ چوٹی کو روشن کر رہی

ہیں۔الوداع......خدا حافظ۔

میں نے باہر آتے ہوئے دروازے کو لا پرواہی سے چھوڑ دیا ہے میرے اندر اس کے لیے غصہ بھر رہا ہے۔بدتمیز۔مہمانوں سے سلوک کرنا نہیں آتا۔وقت کے پابند لوگ...... بڑے آئے کہیں کے ......لیکن میں جانتی ہوں گھڑی کی سوئیاں چھ کے ہندسے کو پار کر چکی تھیں۔اور وہ میرے جانے کا منتظر تھا میں چھتری کو تانے جھیل کے کنارے کنارے چلتی جا رہی ہوں۔پھوار مسلسل گر رہی ہے......اور مجھے لگتا ہے جیسے میں بھی زندگی کے سٹیج کا ایک کردار ہوں جو اپنا پارٹ کرنے پر مجبور ہے......اور میری ڈور کسی دوسرے کے ہاتھ میں ہے۔

اگر ہم مجبور ہیں تو سزا جزا کا چکر کیا ہے......یقیناً میرا عمل میری خواہش کے مطابق ہے......پھر بھی انسان اکثر اوقات اپنی تمام طاقتوں اور قوتوں کے باوجود مجبور محض ہوتا ہے۔خدا عظیم اور برتر ہے اور خدا پھوار گرا رہا ہے۔جھیل کا نیلی سطح پر لہروں پر ہوا سوار چپو چلا رہی ہے اور میں چلتی جا رہی ہوں اور میری چھتری ہوا کے باؤ سے بار بار الٹ رہی ہے۔چھتریاں سارے ملکوں کی ہواؤں کے سامنے بے بضاعت ہیں۔میں جھیل کے کنارے رکھے بنچ پر بیٹھ کر شفاف پانی کی تہہ میں بچھی بجری کے پتھروں کو دیکھ رہی ہوں......کشتیاں اپنے اپنے اینکر سے بندھی ہل رہی ہیں۔چند بچے گولف کی سٹکس لیے جھیل کے ساتھ بنے میدان کو جا رہے ہیں جھیل کا محافظ جو مچھلی کے شکار کا کانٹا پانی میں ڈالے کھڑا تھا۔ڈوری کو سمیٹتا ہوا کیبن کی طرف جا رہا ہے مایوسی......پھر کیا ہے......مچھلیاں بھی رات کے آرام کے لیے پتھروں تلے اپنے اپنے بستروں پر چلی گئی ہیں۔وہ مسافر نہیں اور میرے گھر میں نہ جانے دن ہو گیا یا رات......وہاں اس وقت گیارہ یا بارہ کا وقت ہو گا گلی میں چوکیدار سیٹی گونج رہی ہو گی۔ماڈرن لوگ وی سی آر پر بلیو پرنٹس دیکھ رہے ہوں گے۔اور غریب اپنے جھونپڑوں میں سارا دن کے کام کی تھکاوٹ کے

بعد سو رہے ہوں گے...... اور میرے شوہر میرے بارے میں فکر مند کچی پکی نیند میں لیٹے ہوں گے اور میں یہاں جھیل کے کنارے بیٹی اس خیال سے مطمئن ہوں کہ پورے پانچ انسان میرے لیے دعائیں مانگ کر مجھے خدا کی امان میں دے چکے ہیں اور خدا رات کے شر سے ضرور محفوظ رکھے گا۔ محافظ کیبن کو تالا لگا کر جا چکا ہے۔ میں نے سوچا پوچھوں...... نو لک...... لیکن وہ تیزی سے آگے بڑھ چکا ہے زندگی پر سکون مطمئن اور اپنے آپ میں مگن لگ رہی ہے۔

میں سارے دن کی مسافرت کے بعد تھک چکی ہوں۔ ہمیشہ کی طرح...... مجھے آرام کرنا چاہیے...... میں اپنے آپ سے کہتی ہوں...... میں وکٹوریہ ہوٹل کے کمرے میں نظاروں کی طرف کھڑکی وا کر کے بیٹھ گئی ہوں...... اس قصبہ کا خوبصورت مکمل ترین نظارہ ہے۔ جھیل کا پانی لہروں سے جھول رہا ہے اس کے پرے سیاہ سلیٹ کے پہاڑ ہیں اور پہاڑوں کے اوپر تنا آسمان سورج سارے دن کے بعد پہاڑوں کے پیچھے ہلکی شفق کو بکھرا رہا ہے ہلکے گلابی گوٹ والے سفید بادل نیلے آسمان کے پس منظر میں دلکش لگ رہے ہیں۔ بادل ہولے ہولے انجانی منزلوں کو میری طرح ہی محوِ سفر ہیں۔ ہر شے مسافر ہر چیز راہی اور ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں...... اور میں خدا کی حمد کر رہی ہوں۔ بادل شفاف سڑکوں سنوڈن کے اوپر پہاڑوں کی طرف جانے والے سٹیشن کی سرخ گوٹ والی چھوٹی سی عمارت بلند پہاڑوں اور گہرے مونگیا درختوں پر جھکے ہوئے ہیں۔ میری کھڑکی کے سامنے لمبی اور گول شاخوں والا درخت جھوم رہا ہے۔ میں نے ایسا درخت اس سے پہلے نہیں دیکھا۔ سامنے کی سڑک پر اکا دکا گاڑیاں تیزی سے سڑک کنارے اکٹھے معمولی سے پانی کو اڑاتی کہیں پہاڑوں کی گہرائیوں میں گم ہو رہی ہیں۔ اوپر اور اوپر جہاں برف گرتی ہے...... اور دوشیزائیں محبت کے گیت گاتی ہیں۔ یہاں اور دوشیزائیں...... میں ہنسنا چاہتی ہوں۔ یہاں اخلاق کے اصول بالکل بدل چکے ہیں۔ اخلاق کے اصول انسانی خود

مختاری اور عمل میں رکاوٹ ہیں۔اس لیے ان کی ان لوگوں کی ضرورت نہیں۔حیا اور دوشیزگی ۔فضول محض اور اکا دکا گاڑیاں تیزی سے بھاگ رہی ہیں اوپر جہاں گہری گیلی دھند ہوگی جو مسلسل پانی کی صورت میں درختوں اور بیلوں کے لٹکتے پتوں چٹانی پتھروں سے رس رس کر چھوٹے چھوٹے نالوں اور پھر ندیوں کے بعد جھیلوں میں پانی کی صورت میں اکٹھی ہوتی ہوگی۔

میں ابھی تک کھڑکی میں کھڑی ہوں اب سورج پہاڑوں کے موڑ پر کسی ہچ ہائیکر کی طرح میری نظروں سے اوجھل ہوگیا ہے۔میں نئے اتنے دنوں سے ایک بار بھی تو سورج کو پوری آب وتاب اور جولانی سے چمکتے نہیں دیکھا۔وہ ساری توانائی شاید ہمارے ملک میں صرف کرنے کے لیے جمع کرتا رہتا ہے۔جہاں ہم پسینے سے شرابور ہانپتے ہوئے اپنی توانائیاں ایک دوسرے کو کوسنے میں صرف کردیتے ہیں ہمیں سولر انرجی کا اور کوئی مصرف ہی نظر نہیں آتا......حالانکہ اللہ میاں نے تو مسلمانوں کو بتایا ہے کہ میں نے سمندروں آسمانوں میں تمہارے لیے راز چھپا رکھے ہیں اور یہ نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو سوچتے ہیں یہاں کے لوگوں کا انداز فکر لندن کے مضافات سے مختلف ہے۔یہ ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرانا جانتے ہیں اور بھئی ہم بھی تو مسکرانا جانتے ہیں۔ہم اس وقت مسکراتے ہیں جب کسی کو اپنے سے کمتر پاتے ہیں۔یہ ہنسی غرور بھری ہوتی ہے ہم اس وقت مسکراتے ہیں جب دوسرے کی خامیوں کو اپنے گریبان میں منہ ڈالے بغیر اچھالتے ہیں۔ہمیں اپنی آنکھوں کا شہتیر نظر نہیں آتا یہ ہنسی تفاخر بھری ہوتی ہے۔ہم دوسروں کی غیر موجودگی برائیوں کی تشہیر کرتے ہوئے مسکراتے ہیں ہم رشتوں کو قطع کرتے ہوئے مسکراتے ہیں۔کیونکہ ہماری بڑائی اسی طرح قائم رہ سکتی ہے اور بڑا ہونا کون نہیں چاہتا۔ہم دوسروں کو دھوکا دیتے وقت مسکراتے ہیں۔ہم تو ان سے بہت زیادہ مسکراتے ہیں۔کیا مجھے اپنے آپ پر شرمندہ ہونا چاہیے۔میں شرمندہ ہوں کہ میں نے

اچھائیوں کو اپنانا اور ماننا چھوڑ دیا۔ یورپ آتے ہوئے مجھے یہاں چند لوگوں سے ملنے سے منع کیا گیا تھا کیونکہ وہ میری عمر کا لحاظ کئے بنا میرے بارے میں کوئی بھی لچر بات کر سکتے ہیں۔ میں نے کہا ایسا نہیں ہوگا۔ وہ عورت کی آزادی کے معاشرے میں رہتے ہوئے یقیناً باشعور ہو چکے ہوں گے......

نہیں چند لوگوں کا باطن اور بھی گھناؤنا ہو چکا ہے وہ ہر عورت کو خیالوں ہی خیالوں میں برہنہ کر کے اس سے ہم بستر ہوتے ہیں اور پھر اس تصوراتی فتح کو سچ سمجھ کر کہانیاں پھیلاتے ہیں۔ وہ عورت کی آزادی کے معاشرے کے ذہنی مریض ہیں۔ شاید یہاں آ کر بسنے والے اکثر لوگ ذہنی مریض ہیں اگر وہ مریض نہ ہوتے تو اپنے تنگ ذہن کی دلدل میں پھنسے زندگی نہ گزار دیتے۔ فراخ دلی اور دوسرے کے حقوق کو تسلیم کرتے۔ میں جانتی ہوں یہاں آنے والے جسمانی اور ذہنی کرب سے گزرتے ہیں اور جھوٹے بھرم کو قائم رکھنے کے لیے واپس پلٹنے سے گھبراتے ہیں۔ وہ شراب کے حصول کو اولیت دیتے ہیں اور ہزاروں بار کی ہری ہوئی عورتوں سے محبت کرتے ہیں وہ بھی میری طرح یہاں کے پونڈ کو پاکستانی روپے سے ضرب دیتے ہیں اور پھر بے وطنی میں غرور سے گردن پھلا کر مرغ کی طرح اذانیں دینے لگتے ہیں یہ اذانیں وطن کے مرغزاروں تک کبھی نہیں پہنچتیں۔ آہ بے چارے پاکستانی۔

میرے سامنے فطرت اپنی ہتھیلی میں کائنات کی خوبصورتی کی ایک قاش لیے سرمئی اندھیرے میں اترتی جا رہی ہے۔ سڑکوں پر زور روشنی کے فانوس جل اٹھے ہیں۔ گاڑیاں آ جا رہی ہیں۔ پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر اکا دکا بکھرے گھروں میں روشنیاں ستاروں کی طرح ٹمٹما رہی ہیں۔ اب سیاہ پہاڑوں کے پس منظر میں نیلے آسمان کی تکونی پٹی سب سے نمایاں لگ رہی ہے......اور میں خوش ہوں کہ میرا وطن ہے اور اس کی ساری خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ

وہ مجھے بے حد پیارا ہے اور مجھے اس کی طرف پلٹ کر جانا ہے اور میں واپس جا کر دل کھول کر خرچ کروں گی کہ ہر بار مجھے ایک پونڈ کو بتیس سے ضرب نہیں دینی پڑے گی۔ میں اپنے بستر پر بے خوف ہو کر سوؤں گی۔ کیونکہ میں ان سب کے درمیان ہوں گی جو مجھے پیارے ہیں جن کو میں عزیز ہوں۔ ہاں آنے والے دنوں میں میں یقیناً فطرت کی ان خوبصورتیوں کو بھی یاد کروں گی جو خدا نے کائنات کے وسیع کینوس پر بکھرا رکھی ہیں۔ میں اس کا شکر ادا کیا کروں گی کہ اس نے مجھے اپنی صناعی کے اس نمونے کو بھی دیکھنے کا موقع دیا جو اس نے آج تک میری آنکھوں سے اوجھل کر رکھی تھیں۔

27 تاریخ کا دن ختم ہو گیا۔ رات آ گئی رات جس سے مجھے غیر ملک میں ڈر آنے لگتا ہے۔ شیشوں کی بڑی بڑی کھڑکیاں۔ کوئی آ نہ جائے۔ کتنی آسانی سے ہم انہیں اٹھا سکتے ہیں۔ میں وقت کے گھڑیال پر پڑتے گھنٹوں کی ضربات کو گن رہی ہوں...... پوری آٹھ ضربات...... کمرے میں رات کے ساتھ اداسی بھی گھس رہی ہے...... لوگوں میں شامل ہونے کے لیے میں لفٹ سے نیچے اترتی ہوں ارے اتنے سارے ٹورسٹ۔ ڈائننگ ہال اور بار روم۔ دونوں لوگوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ سفید لباس سرخ کالر اور کمر کی پٹی باندھے طرح دار ویٹرلیس تیز تیز قدم اٹھاتی لوگوں کو سرو کر رہی ہیں۔ خدا اس قوم پر کتنا مہربان ہے کہ اس سے مجھے پھر شکوہ ہونے لگا ہے اگر میری چھوٹی بہن میمونہ اتنا حسن دیکھ لے تو حیران رہ جائے۔ اسے لڑکی کا چہرہ خوبصورت لگتا ہے اسے سیاہ رنگ میں بھی کشش محسوس ہوتی ہے۔ مجھے اس کی فراخ دلی پر اکثر حیرانی ہوتی ہے وہ کتنی بے ساختگی کے ساتھ اپنی ہم عمر دوستوں اور لڑکیوں کی تعریف کر دیتی ہے...... میں اسے اکثر ڈانٹتی ہوں...... بس کرو۔ ہر چہرہ خوبصورت نہیں ہوتا۔ لیکن وہ میری رائے سے اتفاق نہیں رکھتی۔ اس کے دل کی وسعت میں ہر کوئی سما سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس

کے پاس کوئی بات اسے خوش کرنے کے لیے ہو۔ میں ٹیلی ویژن والے کمرے کو کھول کر اندر بیٹھ گئی ہوں...... لیکن کوئی پروگرام بھی اچھا نہیں...... جوڑے آتے۔ بیٹھتے اور چلے جاتے ہیں اور روز مرہ کی باتیں اور عام معمولی چہرے۔ پھر فرانس اور انگلستان کے درمیان ٹیوب چینل کے بارے میں پروگرام تھا جو جامع اور مکمل تصور پیش کر رہا تھا ہر محکمے کا بڑا افسر جو اس چینل سے متعلق تھا اپنے خدشات اور فائدے بتا رہا تھا۔ وہ انسان کی حفاظت کو اولیت دیتے ہیں اور اس چینل سے بہت سے انسانوں کو موت کا خطرہ بھی لاحق ہو سکتا ہے لیکن پھر بھی وہ پر امید ہیں ایک برس میں بڑے بڑے حادثات کا ذکر بھی ہے وہ طاقت ور ہوتے ہوئے بھی قدرت کے طاقتور پنجے میں جکڑے ہوئے ہیں اور پھر انسان کچھ بھی کر نہیں پاتا۔ خدا جو عظیم ہے طاقت ور اور سزا و جزا کا مالک ہے۔ گناہوں کے لیے انسان اپنا گریبان پھاڑ چکا ہے وہ اس میں جھانکنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا۔ وہ برہنہ پھرتا ہے اور کوئی بچہ بھی اس کی برہنگی کے بارے میں کچھ نہیں بتاتا۔ وہ خدا کی طاقت سے خائف اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گھور رہا ہے۔ لیکن خدا کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ ہے۔

آرکسٹرا کی آواز بند دروازے سے اندر آ رہی ہے ارے موسیقی۔ میں تیزی سے ٹیلی ویژن کو بند کر کے ہال کی طرف جا رہی ہوں۔ دروازے کھلنے پر ڈھول اور باجوں کی آوازیں تیز ہو گئیں۔ آرکسٹر والے مختلف دھنیں بجا رہے ہیں سر جو روح کے سرد خانوں میں گھس کر انہیں شعور کی بالیدگی بھی عطا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں دھن کے سر تھم جاتے ہیں لوگ تالیاں بجا رہے ہیں۔ سر اور تال۔ مختلف دھنیں تالیاں تفریح خوشی جو خریدی گئی تھی۔ چند ٹورسٹ خواتین اٹھ کر ایک دوسرے کی کمر پر ہاتھ رکھے ہال کا چکر لگانے لگی ہیں۔ سر ان کے پاؤں کو تال دے رہا ہے۔ ان کے چہرے تمتما رہے ہیں وہ زندگی کے اس لمحے سے لطف

اٹھاتے لوگوں میں شامل ہیں۔لوگ خوش ہیں کہ بار بار باہر جا کر اپنے گلاسوں کو جھاگ اڑاتی شراب سے بھر لاتے ہیں۔ اکثر عورتیں جوس پی رہی ہیں۔وہ سب آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔پھر دو چھوٹے لڑکے سرخ رنگ کے پلاسٹک کے گولک لیے لوگوں سے آرکسٹرا والوں کے لیے چندہ مانگ رہے ہیں۔ ہر کوئی کچھ نہ کچھ گولک میں ڈال رہا ہے۔ہم بھی اس خیرات میں شامل ہو گئے ہم سب مسافر خوشی کے ایسے ہی لمحوں کی تلاش میں سرگرداں اس ہال میں اکٹھے ہوئے ہیں۔

تماشا ختم ہو گیا۔دھنیں تھم گئیں۔باجے اوندھے ہو گئے۔لوگ آرکسٹرا کے جاتے ہوئے فنکاروں کی پذیرائی کے لیے تالیاں بجا رہے ہیں۔مرد اپنے اور اپنی ساتھی عورتوں کے لیے جام بھروانے چل پڑے بوڑھی عورتیں خوبصورت لباسوں میں ملبوس ادھیڑ عمر عورتیں طرحدار خوبصورت چہروں والے مرد بدصورت مرموٹی عورتیں لیکن وہ سب خوبصورت لگ رہے ہیں۔

مجھے اچھا لباس پسند ہے میں اپنی پسند کے لباس خرید سکتی ہوں۔لیکن میرا لباس تو میری بھی پسند نہیں نہیں مجھے یہاں کی شردی سے ڈرایا گیا تھا......اس لیے میں اپنے آپ کو بھی اچھی نہیں لگ رہی۔لیکن جس طرح میں اور بہت سی چیزوں سے مانوس ہو رہی ہوں۔اسی طرح میں اپنے سا موٹے سوتی لباس سے بھی مانوس ہو رہی ہوں جس میں میں خوش نہیں ہوں۔میں پچھلے پندرہ دنوں سے دو سوتی جوڑوں میں پھر رہی ہوں۔ٹریول لائٹ والا فارمولا استعمال کرتے ہوئے میں ان سے مانوس ہو رہی ہوں۔میں صبح سے لے کر شام پڑنے تک پھرنے والے اپنے تھکے وجود سے مانوس ہو رہی ہوں۔اپنے میلوں پیدل چلنے سے مانوس ہو رہی ہوں۔میں جو اپنی گاڑی کے بغیر ایک قدم بھی نہیں نکالتی تھی اکثر اپنے آپ کو بڑا بے بس محسوس کرتی ہوں......سامان کو گھسیٹتے ہوئے میرے بازو تھک جاتے ہیں تو میں اسے عاشی کو پکڑا دیتی

ہوں۔لیکن وہ اپنا بھی سامان اٹھائے ہوئے ہے میں جلدی پھر اپنے سامان کو تھام لیتی ہوں۔میں نے اتنے دنوں تک اتنا سامان کبھی بھی نہیں اٹھایا تھا۔میں جانتی ہوں مجھے اپنے حصے کا بوجھ اٹھانا ہی ہے اس لیے میں اسے ویل کیریئر پر رکھے گھسیٹتی رہتی ہوں۔یہاں تک کہ کسی بس کسی ٹرین یا کسی ہوٹل تک نہ پہنچ جاؤں۔لیکن پھر اگلا دن اگلا قصہ اور اگلے قصبے کی سڑکیں لیکن اس تھکاوٹ میں بھی مجھے مزہ آ رہا ہے میں اپنے سفر سے لطف اندوز ہو رہی ہوں۔لیکن میں سامان گھسیٹنا نہیں چاہتی میرا کندھا دکھنے لگا ہے میرے وجود پر یہ بوجھ ضرورت سے زیادہ ہے بے لطفی اور بدمزگی کا احساس بڑھ جاتا ہے میں نے تو اتنے لمبے اور تھکا دینے والے سفر کا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔لیکن یہاں میں ایک مسافر ہوں ایک سیاح ہوں۔مجھے ایسا کرنا چاہیے مجھے ایسا کرنا پڑے گا۔ہر کوئی اپنا سامان خود ہی اٹھاتا ہے وہ اس کے عادی ہیں لیکن میں اس کی عادی نہیں ہوں۔سفر نے مجھے زبردستی اپنے طریقوں کا پابند بنا لیا ہے۔آسمان سیاہ اور گہرے بادلوں سے ڈھکا ہوا ہے۔بارش کی مدھم آواز مسلسل آ رہی ہے۔سوچوں اور احساسات سے میرا ذہن بھرا ہوا ہے اور میرا قلم تیزی سے صفحوں پر بھاگتا جا رہا ہے رات کے سوا بارہ ہو چکے ہیں میرے شہر میں صبح کے پانچ بجے ہوں گے۔ستمبر کا سورج میرے گھر کی مشرقی سمت سے آہستہ آہستہ طلوع ہو رہا ہوگا۔اس کی کرنیں بوگن بیلا کی شاخوں میں سوئی چڑیوں کو جگائیں گی اور پھر ساری فضا ایک حمدیہ موسیقی سے بھر جائے گی۔میری بڑی بیٹی سعدیہ اٹھے گی اسے بہت سے ایسے کام کرنے ہوں گے جو میرے ذمہ تھے۔وہ خانساماں کو دوپہر کے کھانے کے لیے سامان دے گی وہ اپنے اور چھوٹے بھائی فیصل کے لیے ناشتہ تیار کرے گی اور پھر تیار کرے گی اور پھر تیار ہو کر فیصل کو اس کے سکول اتار کر ہسپتال چلی جائے گی۔جہاں وہ صبح سات سے لے کر رات آٹھ ساڑھے آٹھ بجے تک مسلسل کام میں مصروف رہے گی۔ہمارے ہسپتالوں میں

ہاؤس جائرز سے بہت سختی سے کام لیا جاتا ہے لیکن انہیں سکھانے کے لیے کوئی سینئر ڈاکٹر فراخ دلی سے تیار نہیں ہوتا اور پھر مایوسی اور نفرت ان کے دلوں کو نیکی اور خدمت کے جذبے سے خائف کر دیتی ہے اور وہ بھی آنے والے وقت میں ایسے ڈاکٹر بنتے ہیں جو خدمت کے جذبے سے تہی صرف نوٹ بنانے کی مشینوں میں ڈھل جاتے ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ میرے دونوں بچے ایسے ڈاکٹر بنیں۔ میں انہیں نیکی اور خدمت کی تلقین کرتی ہوں اور وہ مجھے خود غرضیوں اور بے رحمیوں کے قصے سنانے لگتے ہیں...... کتنی سیاہ پورٹریٹ ہے ایک مشہور ڈاکٹر کی...... اور میں پریشان ہوں میں تو ایسی پورٹریٹ میں اپنے بچوں کو شامل دیکھنا نہیں چاہتی...... میں اپنے جواز پیش کرتی ہوں اور وہ آپ بیتی سناتے ہیں میں جانتی ہوں پروفیشنل جلن تو ہر جگہ ہوتی ہے لیکن ڈاکٹروں کی خود غرضی تو روحانی تکلیف کے ساتھ جسمانی تکلیف کو بھی بڑھا دیتی ہے۔

میری بیٹی کہتی ہے امی آپ جس زمانے کی باتیں کرتی ہیں وہ بیت چکا زمانہ بہت بدل چکا ہے لوگ کسی اخلاقی قیود پر یقین نہیں کرتے۔ اس معاشرے میں رہنا بہت مشکل ہے۔ اور میں جانتی ہوں اس دلدل سے گذرنا جان جوکھوں کا کام ہے۔ لیکن خدا کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے میں انہیں تلقین کرتی ہوں اور جانتی ہوں میرے بچے برائی کی کانٹوں بھری راہ پر نہیں چلیں گے۔ لیکن وہ رنجیدہ تو ہوں گے اور ان کی رنجیدگی مجھے ابھی سے رنجیدہ کر دیتی ہے۔ میری بیٹی سعدیہ سارے دن کے ان تھک کام کے بعد نڈھال سی واپس آتی ہے اس کی آنکھوں میں اکثر آنسو ہوتے ہیں۔ امی آج بھی میں نے کوئی نئی بات نہیں سیکھی۔ وہی بلڈ پریشر اور نبض...... میں ان دونوں کاموں سے تھک چکی ہوں...... وہ ایک مشہور اور ہنر مند ڈاکٹر بننا چاہتی ہے۔ لیکن وہ میری ایک بھی بات سننے کو تیار نہیں۔ وہ کہتی ہے امی شادی ہی زندگی کا انجام نہیں۔ آپ باہر نکل کر دیکھیں۔ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہے۔ آپ تو بالکل پرانی ماؤں کی

طرح سوچتی ہیں۔اور میں جانتی ہوں۔اور میں جانتی ہوں میں سب سے پہلے ایک ماں ہوں۔میں جو اپنے گھر سے دور اجنبی سڑکوں پر پھرتے ہوئے اجنبی لوگوں کے درمیان چلتے ہوئے پہلے سے بھی زیادہ مامتا کے رنگ میں رنگی جا رہی ہوں۔میں اپنے گھر میں بچوں کے درمیان جانا چاہتی ہوں۔اس رنگ سے گہرا اور خوش رنگ تو کائنات میں اور کوئی بھی رنگ نہیں۔

بارش لگاتار ہو رہی ہے کبھی تیز کبھی مدھم۔اٹھائیس تاریخ کا سورج ضرور آسمان کے مشرق میں طلوع ہو چکا ہے لیکن بھیگنے کے خوف سے اس نے بھی بادلوں کا ین کوٹ پہن رکھا ہے۔میں ناشتہ کے بعد دوبارہ جاگتے قصبے کی سیر کے لیے نکلی ہوں۔سارے دن کی مسافرت کے بعد ہم اکثر چار پانچ کے درمیان کسی قصبے میں رات کے پڑاؤ کے لیے رکتے ہیں۔شہر رات کی استراحت کے بے پاؤں پسار رہا ہوتا ہوں۔اس کے چہرے پر غنودگی ہوتی ہے وہ ہم سے آنکھ نہیں ملاتا۔لیکن آج میں ضرور اسے جاگتے میں پکڑنا چاہتی ہوں......ارے اس کی آنکھیں تو کھلی ہیں لیکن اس کے چہرے پر وہی خاموشی اور تنہائی کا پرتو ہے......لوگ کاموں پر جا چکے ہیں......اور عورتیں گھر داری کر رہی ہیں۔میں آخری راؤنڈ کے لیے جھیل کی دوسری طرف ایک چھوٹے سے ریلوے سٹیشن کی طرف چھتی تانے آہستہ آہستہ بڑھ رہی ہوں......بارش کے قطرے چھتری کی نوکدار سلاخوں سے لگاتار ٹپک رہے ہیں......جھیل کنارے چھوٹی پلاسٹک کی کشتیاں اوپرے سے رکھی ہوئی ہیں۔دھند بڑھ رہی ہے بارش تیز ہو گئی ہے میں چپ چاپ جھیل کو دیکھ رہی ہوں۔دوسرے کنارے قصبے کو دیکھ رہی ہوں۔یہ نظارے آنکھوں میں اتار کر ان کے قصے اپنے بچوں اور دوستوں سے بیان کروں گی۔صفحوں پر رقم کروں گی۔عاشی ایک چھوٹی کشتی کرائے پر لے کر جھیل کنارے بنے تالاب میں کینوئنگ کر رہی ہے اس نے اپنے سر

کو پلاسٹک کے لفافے سے ڈھانپ رکھا ہے بارش اور تیز ہوگئی ہے میں جھیل کنارے بنائے گئے پبلک کیبن میں بیٹھ گئی ہوں...... دیر ہو رہی ہے ہمیں واپس چلنا چاہیے۔ میں چھتری تانے باہر نکل کر اسے آواز دینے کے لیے سر اٹھاتی ہوں تو وہ اترتے اترتے اتھلے پانی میں گر جاتی ہے اسے دیکھ کر میں ہنسنے لگی ہوں وہ بھی ہنس رہی ہے۔ خدا کا شکر ہے وہ جھیل میں نہیں گری تھی...... میں دنوں بعد قہقہے لگا رہی ہوں شاید میرے چاروں طرف پھیلی خوبصورتی ایک سر بن کر میرے اندر اتر گئی ہے میں پچھلے دنوں صرف مسکراتی رہی ہوں اور وہ بھی اجنبی لوگوں سے جن سے بات بڑھانے کے لیے کوئی بات نہیں ہوتی۔ ہاں یہ لوگ ایک دوسرے اور اجنبیوں سے بھی مسکرا کر بات کرتے ہیں۔ آتے جاتے سامنے بیٹھے لوگوں کو ہیلو کہتے ہیں۔

ویلش انگریز لندن کے انگریز سے بالکل مختلف ہے۔ ان کی محبت کو محسوس کر کے انسان اکیلے پن کی اذیت سے بچ جاتا ہے ہم بارش میں ہوٹل واپس آ گئے ہیں۔ میں نیچے ہال میں بیٹھی اخبار پڑھ رہی ہوں۔ وہی قتل ڈاکہ آبروریزی یہاں کی عورت جنسی خیالات میں بھی بیباک ہے وہ آبروریزی میں بھی اپنی خواہش کا برملا اظہار کرنے سے نہیں گھبراتی۔

خبر کچھ یوں ہے کہ ایک لڑکی اپنے پسندیدہ ایکٹر کو ملنے کے لیے جاتی ہے راہ میں وہ ایک موٹر والے سے لفٹ لیتی ہے موٹر والا اس کی تنہائی کا زبردستی فائدہ اٹھاتا ہے وہاں سے بچ کر وہ ایک اور موٹر والے سے لفٹ لیتی ہے موٹر میں دو اوباش لڑکے سوار ہیں۔ وہ دونوں بھی اس سے ویسا ہی سلوک کرتے ہیں۔ معاملہ پولیس تک پہنچتا ہے وہاں وہ کہتی ہے کہ ”میں آج تک کنواری تھی۔ میں سوچتی تھی جنسی تعلق کوئی بہت خوشگوار تجربہ ہوتا ہے لیکن میں بہت مایوس ہوئی ہوں۔ اگر میرے ساتھ یہ سب کچھ ہونا تھا تو کم از کم مرد ہی میری پسند کا ہوتا...... یعنی وہ ایکٹر ہی ہوتا جس سے میں ملنے جا رہی تھی“۔

میں خاموش بیٹھی اخبار کو گھور رہی ہوں میں اس خبر پر کیا تبصرہ کرتی......بس چپ ہوں...... بظاہر یہاں سب کچھ کتنا پر سکون اور خوبصورت ہے۔ چند جوانوں نے بینک لوٹ لیا ایک ایشیائی ہندو عورت کو چند لڑکوں نے ریپ کے بعد قتل کر دیا......عورت تصویر میں زندہ ہے لیکن وہ جل کر خاک ہو چکی ہے......لیکن پھر بھی سب کہتے ہیں یہاں فکر کی کوئی بات نہیں......اور میں یقین کرنے کی کوشش کرتی ہوں کہ یہاں فکر کی کوئی بات نہیں۔

ہے اینڈ وائے:

میں بس میں بیٹھی ہے اینڈ وائے جانے والی سڑک کو غور سے دیکھ رہی ہوں۔اب دیکھنے کو زیادہ نہیں۔میں آنکھیں بند کر کے بھی ساری تفصیل بیان کر سکتی ہوں۔بار ماؤتھ کے سٹیشن سے ہمیں ٹرین پر سوار ہونا ہے موسم قدرے سرد ہو رہا ہے۔پلیٹ فارم پر تیز ہوا کے جھونکے جسم میں کپکپی پیدا کر رہے ہیں۔یہاں ٹرینیں ہمیشہ وقت پر آتی ہیں لیکن یہ ٹرین آدھ گھنٹہ لیٹ ہے۔میں سٹیشن کے رستوران کے اندر چلی گئی ہوں...... میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں...... مالکہ مسکرا کر پوچھ رہی ہے چکن برگر اور گرم کافی...... افسوس ہمارے پاس چچ برگر ہے تو آلو کے چپس دے دیں...... ہاں یہ میں ابھی دیتی ہوں۔پلیز بیٹھ جائیے...... اندر کمرے میں ٹیلی ویژن پر سیول کی کھیلیں دکھائی جا رہی ہیں۔لیکن وہ ان کا ذاتی کمرہ ہے گاہکوں کو اندر جانے کی اجازت نہیں کا بورڈ آویزاں ہے۔

میں چپس اور کافی پی رہی ہوں...... اور پلیٹ فارم پر چند بچے سکول کے بستے لیے منتظر ہیں۔وہ آدمی مسلسل شراب پیتے کمرے میں رکھے بورڈ پر بلیرڈ کھیل رہے ہیں...... میں ایک نئی مسافر سے باتیں کر رہی ہوں وہ کسی ہسپتال میں نرس ہے اسے دوسرے ملکوں میں جانے کا شوق ہے ہاں آپ ہمارے ملک ضرور آئیے گا...... وہاں تاریخی یادگاریں ہیں۔مغل حکومت کا ورثہ...... اور بھی بہت کچھ لیکن وہاں شراب کی پابندی ہے۔اوہ...... مشکل ہوگا...... شاید...... اور کروڑوں لوگو جو شراب نہیں پیتے...... سرخ گوشت نہیں کھاتے کیسے جی رہے ہیں۔میں اس سے پوچھنا چاہتی ہوں۔لیکن چپ ہوں...... ٹرین نہیں آرہی...... تو یہاں بھی ٹرینیں لیٹ ہو جاتی ہیں کبھی کبھار اور پر سیلاب آیا ہوا ہے ٹرین کے آئی ے میں وقت لگتا ہے۔ہوا اور تیز ہو گئی ہے میں بار بار باہر سے اندر آجاتی ہوں میں نے دوسرا کافی کا کپ خریدا ہے دوسرا چپس کا

پیکٹ...... آخر میں کیوں روپوں کو سینت سینت کر رکھوں...... ٹرین آ گئی۔ زرد پتوں پر خزاں کی گرفت مضبوط ہوتی جا رہی ہے اور پھر وہ شاخ سے ٹوٹ کر آوارہ پھریں گے۔

کیا ذہن سوچوں کی خزاں کی زد میں آ کر آوارہ نہیں ہوتے...... ایسے ذہنوں کو شاخ سے ٹوٹ کر شائد غم ہوتا ہو لیکن وہ اپنے اس غم کو جھوٹی انا میں چھپا لیتے ہیں۔ وہ انگریزی کو انگریزوں کے لہجے میں بولنے میں ہی فخر محسوس کرتے ہیں۔ انسان کو اپنی نظروں میں بلند رہنے کے لیے کوئی نظریہ کوئی مفروضہ گھڑنا کتنا ضروری ہے۔ اور انگریزی ہی بہت ہے...... جب آپ اپنے ملک جا کر انگریزی بولتے ہیں تو کوئی آپ سے یہ نہیں پوچھتا کہ جناب آپ کہاں برتن مانجھتے ہیں کون سے پلیٹ فارم پر کوڑے کے ڈرم اٹھاتے ہیں کونسی فیکٹری میں پیکنگ کرتے ہیں بھئی انگریزی بولنے والا صاحب اور وہ بھی لاٹ صاحب سے کم کیا ہوگا۔ اس انگریزی زبان نے میرے ملک کی کتنی بیٹیوں کو دھوکے دیئے کتنے مستری انجینئر بنے کتنے بیرے ہوٹلوں کے مالک کہلائے کتنے خواب پریشان ہوئے...... اور کتنے ہاتھوں کی مہندی طلاق کی سیاہی میں ڈوب گئی...... ٹرین چلتی جا رہی ہے...... سمندر کبھی پھیلتا کبھی سمٹتا ہے نیلے بادلوں سے سورج کی روشنی جھانک رہی ہے۔ سورج کبھی کسی پہاڑ کو ہیلو کہتا ہے اور کبھی کسی پہاڑ کو۔

سمندر کے کنارے کیراوان کھڑے ہیں بلکہ کیراوان کے ننھے ننھے شہر آباد ہیں خوبصورت چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں والے ان کو ننھے ننھے ستونوں پر رکھا ہوا ہے لیکن کام کا دن ہونے کی وجہ سے یہ شہر سنسان ہیں بے آباد ہیں راستے میں آئے قصبوں میں سوائے چند مردوں اور عورتوں کے علاوہ میں نے کسی ذی روح کو نہیں دیکھا۔ کام کے دیو نے انہیں شائدہ زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔

کیورن کا قصبہ...... زندگی کی تھوڑی سی ہلچل سکولوں سے آتے بچے خریداری کرتی

خواتین پوسٹ آفس کے سامنے لوگوں کی قطار...... مختلف جاتی آتی بسیں...... محبت میں مصروف جوڑے پرامیں دھکیلتی جوان مائیں فطرت کی دید کے مشتاق لوگ۔ بہت دیر بعد مجھے کھلا سمندر نظر آیا ہے۔ سمندر جو بیکراں اور عظیم ہے۔ عظمت کے لیے وسعت کتنی ضروری ہے۔ اور تنگ نظر لوگ بھی عظیم کہلوانے کے شوق میں وسعت کا ڈھونگ رچاتے ہیں۔ فراخ دلی کا ثبوت دینے کا دھوکا دیتے ہیں اور بالآخر اپنے ماننے والوں کو مایوس کرتے ہیں لیکن سمندر کوئی دھوکا نہیں دیتا۔ وہ جیسا ویسا ہی نظر آتا ہے پرخطر عمیق اور پایاب۔

سمندر ہر جگہ ایک جیسی وسعت کے حامل ہوتے ہیں ہمارے حصے کا سمندر بھی تو ایسا ہی ہے وہاں بھی لہریں اٹھتی ہیں مچھیرے مچھلیاں پکڑتے اور بحری جہاز غیر ملکی پانیوں کو قطع کرتے مسافروں کو ملاتے اور بچھڑاتے رہتے ہیں۔ سمندر وسیع ہے کیرواتوں کے شہر اس کے اور بھی نزدیک ہوگئے ہیں۔ دوسری طرف وہی خوبصورت چھتوں والے گھر ہیں یہ لوگ خدا کی کائنات کو مزید خوبصورت بنانے کا گر جانتے ہیں۔ سمندر دور کہیں اپنے کناروں پر بادلوں میں مدغم ہو رہا ہے اور بادل سمندر میں یکجائی کا عجیب سماں ہے۔

اور یکجائی کے لیے ایک دوسرے کی ذات کو اپنی ذات میں مدغم کرنے سے ہی تو ہم اپنے مقاصد میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ محبت رفع ہوتی ہے فن نکھرتا ہے شاعری آفاقی کہلاتی ہے افسانہ لازوال ہو جاتا ہے اور پھر یہ سب باتیں مل کر لافانی انسانوں کو جنم دیتی ہیں۔

سمندر پھر پہاڑوں کی بلندی سے خائف ہو کر پیچھے ہٹنے لگا ہے شام کے چھ بجے ہیں اور سمندر کے اوپر سورج کی روشنی کہیں بادلوں کے پیچھے نیچے کی طرف جھک گئی ہے ٹرین ایک قصبے کے سٹیشن پر رک گئی ہے۔ دوسری ٹرین شلزبری کی طرف جانے کے لیے تیار کھڑی ہے گارڈ لوگوں کو بتا رہا ہے باقی مسافر باہر جانے والے راستے کی طرف مڑ گئے ہیں لیکن چند مسافر جن

میں میں بھی شامل ہوں بھاگ کر اس میں سوار ہو گئے ہیں۔اب گاڑی تیزی سے شلز بری کی طرف بھاگ رہی ہے دن ابھی باقی ہے روشنی باقی ہے میں نے پہلی بار سورج کو پورے چہرے کے ساتھ چمکتے دیکھا ہے جنگلوں کو کاٹ کر پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر چراگاہوں کے سرسبز میدان بنائے گئے ہیں۔کہیں کہیں درختوں کے چھوٹے چھوٹے زخیرے ہیں۔اوران ذخیروں کے دامن میں ننھے منے قصبے پہاڑوں کے درمیان سے جاتی سڑکیں سیاہ گائیں سفید بھیڑیں اونچی نیچی پہاڑیاں بلند درختوں کے درمیان سے ٹرین گزر رہی ہے۔سب کچھ اس سبز دیوار کے پیچھے اوجھل ہو گیا ہے۔سورج اور سمندر اس بلند دیوار کے پیچھے ضرور موجود ہوں گے لیکن مجھے نظر نہیں آ رہے۔دور دائیں طرف سورج سیاہ پہاڑ کی چوٹی کو روشن کر رہا ہے۔سیاہ بادل آہستہ آہستہ اوپر اٹھ رہے تھے۔سفید بھیڑیں ہی بھیڑیں۔اپنی اپنی باڑوں کے درمیان اپنی اپنی حدود کے اندر رہنے سے کتنی سکھ شانتی ملتی ہے۔میں نے تمام راہ میں ایک بھی بھیڑ کو دوسری طرف جانے کی کوشش کرتے نہیں دیکھا۔لیکن ہمارے کسان کھیتوں کے کنارے اگر ایسی ہی باڑیں بنایا کریں تو آئے دن جانوروں کے چرنے پر کئی قتل نہ ہوا کریں۔بیوہ عورتیں اپنی سہاگ کی چوڑیاں نہ توڑیں۔یتیم بچے بڑے ہو کر ڈاؤاور چور نہ بنیں۔ہمارے کسانوں کو ایسا ضرور کرنا چاہیے۔مل کر رہنے کا شعور حاصل کرنا چاہیے انسانوں کی عزت کا سبق پڑھنا چاہیے۔

گاڑی اور تیز بھاگتی جا رہی ہے۔پہاڑ سبزہ بستیاں سب پیچھے رہ گئے ہیں۔لیکن نئے آبادیاں نئی زمینیں نظارہ ہی نظارہ میرے دل سے اداسی کا بوجھ قدرے کم ہو گیا ہے۔ہم ساؤتھ ویلز کی طرف محوِ سفر ہیں۔ایک پہاڑ ترتیب وار اگائے گئے درختوں کی وجہ سے بڑا ہی جاذبِ نظر لگ رہا ہے۔

سرمئی شام دھیرے دھیرے کسی مشرقی دیہاتی دوشیزہ کی طرح قدم قدم لجائی شرمائی سی

نیچے اتر رہی ہے۔افق پر روشنی ابھی تک واضح ہے۔چشمے نالے جھیلیں اکا دکا گھر۔کہیں کہیں گولف کے میدان۔تو یہاں کے لوگ گولف سے گہرا شغف رکھتے ہیں۔صحت کی نعمت سے آگاہ ہیں۔ان کے پاس قدرے فرصت کا وقت ہے۔سیر کی افادیت سے باخبر ہیں۔زیادہ تعلیم یافتہ ہیں۔

میں سفر میں ہوں۔لیکن ابن بطوطہ نہیں ہوں۔آج کا ابن بطوطہ گاڑی میں یا جہازوں میں سفر کرتا ہے بہترین ہوٹلوں میں ٹھہرتا اور بہترین کپڑے پہنتا ہے۔اس کے خیالات کو رقم کرنے کے لیے ٹائپ رائٹر یا شیفر ہوتا ہے۔اس کی کتاب بہترین انداز میں چھپتی ہے اور بہترین پبلسٹی کے ساتھ قاری کے ہاتھوں تک پہنچتی ہے۔پھر اس کی تقریب رونمائی ہوتی ہے۔بہترین اور مشہور نقاد اس پر مقالے لکھے جاتے ہیں۔اور وہ دنیائے ادب میں عظیم تر ٹھہرتا ہے۔لیکن میں ابن بطوطہ نہیں ہوں۔میں تو بس سائرہ ہاشمی ہوں جو محض نئے لوگوں کو دیکھنے نئی زمینوں کی خوشبوں سونگھنے کے لیے چھوٹے چھوٹے بیڈ اینڈ بریک فاسٹ ہوٹلوں میں ٹھہرتی صرف ایک محدود علاقے میں گشت کر رہی ہوں۔

اور اب ٹرین چھوٹے سے قصبے کے ایک چھوٹے سے پلیٹ فارم پر ایک لمحہ کو رکی ہے۔اس کا نام کیئرسوس ہے۔یا شاید میں اس کے ہجے غلط کر رہی ہوں۔تو اے قاری تم اس کو بے شک غلط تلفظ کے ساتھ پڑھو تمہیں کوئی ٹوکے گا نہیں۔ٹرین پھر چل پڑی ہے۔نہر کا پل جس کے نیچے سے یخ پانی بہہ رہا ہو گا جو اوپر پہاڑوں سے سفر کرتا ہوا کئی نشیبوں کو سرفراز کرتا ہوا سمندر کی گہرائی اور وسعت میں اپنے وجود کی پہچان کھو دے گا۔رات کا اندھیرا گہری سیاہی میں بدل جائے گا۔تارے آسمان کی وسعتوں کو سجائیں گے۔چاند پانیوں کی سطح پر اپنے چہرے کو دیکھ کر مسحور ہو گا۔اور شاید یہ بھیڑیں یہ گائیں جو ہمیشہ اپنے سر کو جھکائے چارہ کھاتی نظر آتی

ہیں، بیٹھ کر جگالی کریں گی۔ میں نے ابھی تک ایک بھیڑ یا گائے کو بھرے پیٹ کے ساتھ جگالی کرتے نہیں دیکھا۔

شلزبری نہ جانے کب آئے گا۔ ٹرین خوب صورت بڑے سے سٹیشن کے پلیٹ فارم پر رک گئی ہے۔ ''مینوٹاؤن'' کا بورڈ آویزاں ہے۔ بارش میں بھیگا ہوا چھوٹا سا شہر۔ مجھے بھوک محسوس ہو رہی ہے۔ کافی کے دو کپ اور چپس کے دو پیکٹ کب کے ہضم ہو چکے ہیں۔ مجھے اپنی منزل تک پہنچنے کا انتظار کرنا ہوگا۔

شلزبری کتنی دور ہے۔ میں ٹکٹ چیکر سے پوچھتی ہوں۔ وہ ٹکٹ کاٹنے والا آلہ بغل میں دبائے نئے لوگوں کو ٹکٹ دیتا اور چیک کرتا ہے وہ پوری ذمہ داری سے وقت بتاتا ہے۔ دور ایک پہاڑی کے اوپر شفق گوں بادل سنہرے کے بے کنار سمندر میں اپنی الگ پہچان بنا ہوا ہے۔ دائیں ہاتھ شفق نے ایک اور بادل کو رنگ ڈالا ہے۔ ٹرین ابھی تک بھاگ رہی ہے۔

تھکاوٹ پھر میری روح پر اتر رہی ہے میں گھر جا کر اپنے بستر پر سو جانا چاہتی ہوں لیکن ابھی مجھے جاگتے رہنا ہے۔ میں سونا نہیں چاہتی۔ میں نیند سے لڑ رہی ہس۔ ویلش پول کا قصبہ پیچھے یک طرف بھاگ رہا ہے۔ اگر میں سو جاتی تو اس قصبے کو پیچھے بھاگتے کیوں کر دیکھ سکتی تھی۔ گھروں میں روشنیاں جاگ اٹھی ہیں۔ دیکھنے کے لیے روشنی کتنی ضروری ہے۔ راہوں کا تعین اندھیروں میں نہیں ہوتا...... علم کی روشنی شعور کی روشنی ایمان کی روشنی باطن کی روشنی اور یہ ساری روشنیاں مل کر صراط مستقیم کی طرف راہنمائی کرتی ہیں۔ لیکن بدباطن پر روشنی سے منکر ہو جاتے ہیں اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں اور پھر راستے مٹ جاتے اور انسان بھٹکنے لگتے ہیں۔ اور میں اپنے آپ کو اس کی پناہ میں دیتی ہوں۔ اور اسی روشنی کی طالب ہوں۔ فطرت ایک ہی نظارہ بار بار پینٹ کر رہی ہے۔ لیکن پھر بھی جاذب نظر تھوڑی دیر میں

اندھیرا چھا جائے گا اور ٹرین کے شیشوں میں سے ہمارے چہروں اور سیٹوں کا عکس نظر آنے لگے گا۔ میں شیشے سے اپنا چہرہ لگا کر باہر کی دنیا کو جھانکنے کی کوشش کروں گی۔ باہر رات ہے اندر روشنی۔ اب دونوں طرف کی کھڑکیوں میں سے ٹرین کے ڈبے کی کریم رنگ کی دیواریں نظر آ رہی ہیں۔ جیسے ہمیں کسی نے دوہری دیواروں میں قید کر دیا ہو۔ دونوں طرف درختوں کا گہرا مونگیا اندھیرا ہے۔ درختوں کی دیوار ختم ہو جاتی ہے تو وہی نظارے پھر آنکھوں کی پتلیوں میں گھس آتے ہیں۔ شام قدم قدم رات کی اندھیری غار میں اتر گئی ہے۔ اس وقت مجھے ٹرین میں اپنا وجود بالکل بیکار لگ رہا ہے۔ ٹی وی نے دنیا کو سمیٹ کر ہمارے حافظے میں بند کر دیا ہے۔ لگتا ہے سب کچھ دیکھا بھالا ہے سب کچھ اپنا اپنا سا ہے۔ یہ لوگ فطرت سے کھیلتے پہاڑوں کو مطیع کرتے ہیں اور ایک ہم ہیں کہ اپنی پہچان سے بھی بے خبر ہیں۔

فطرت ہمارے بھی تابع ہو سکتی ہے۔

شلزبری کا سٹیشن آ گیا...... ہمیں بھی بہت دور جانا ہے لیکن رات ہماری راہ میں کھڑی ہے۔ اس نے قمقموں کی مالا پہن رکھی ہے اور مسافروں کو بلا رہی ہے۔ جیسے کہہ رہی ہو مجھے دیکھو۔ میں سٹیشن کے ویٹنگ روم کی کینٹین میں صوفے پر بیٹھی برگر کے ساتھ ہمیشہ کی طرح کافی پینے کی بجائے گرم چاکلیٹ پی رہی ہوں۔ رات روشنی کی زد میں کھڑی بڑی تیکھی اور بانکی لگ رہی ہے۔ چاروں طرف مسافر بیٹھے کھا پی رہے ہیں۔ بھاپ اڑ رہی ہے۔ سگریٹوں کا دھواں فضا میں شامل ہے انسانوں کی دوسراتھ خوشیوں کے لیے بہت ضروری ہے سامان اٹھائے سٹیشن سے باہر آ کر بارش میں ہوٹل کو ڈھونڈنے کے لیے ہم غیر مانوس راہوں پر مڑ رہے ہیں...... نہیں ہمارے پاس جگہ نہیں...... ہمارا ہوٹل فل ہے...... وہاں اگلے موڑ پر شاید آپ کو جگہ مل جائے...... کوئی بات نہیں...... کہیں نہ کہیں تو ہمارے حصے کا ایک خالی کمرہ ہمارا منتظر ہوگا...... اور

ایک گرم بستر جہاں میرا جسم تھکاوٹ سے چور فوراً پاؤں پسارے سو جائے گا...... اور پھر خواب میں میں اپنے بچوں کے درمیان بیٹھی باتیں کرتی ہوں گی...... میں پہلی بار نیند کے انتظار میں چلتی جا رہی ہوں۔ جگہ خالی ہے۔ لینڈ لیڈی کا چہرہ تنا ہوا اور غیر دوستانہ ہے۔ میں نے اتنے لمبے سفر میں پہلا چہرہ دیکھا ہے جو مسافر کو دیکھ کر مسکرایا نہیں۔ جس نے ہمیں کوئی اہمیت نہیں دی۔ ہیلو نہیں کہا۔ پہلا کمرہ ایسا ہے جہاں چائے کے کمپلیمنٹری برتن نہیں۔ کمرے میں بہت سے ہدایات لکھی ہوئی ہیں۔ مثلاً ہیٹر کے اوپر کوئی گیلا کپڑا نہ ڈالیں...... کرسیوں پر پاؤں نہ رکھیں۔ ٹونٹیاں بند کرنا نہ بھولیں...... اور شاید یہ بھی کہیں ہو کہ بستر پر سونا منع ہے۔ میں پلنگ کی پشت کو غور سے دیکھ رہی ہوں...... لیکن ایسی کوئی ہدایت نہیں۔ خاصی فراخ دل ہے یہ لینڈ لیڈی...... جاتے ہوئے ہوٹل کا نگر یا مالک (نہ جانے وہ کون ہے اس نے لینڈ لیڈی سے شادی بھی کی ہے یا نہیں۔ اور ان دونوں کا رشتہ کیا بنتا ہے جہنم میں جائیں یہ دونوں......) تاکید کر رہا ہے کہ کمرہ اندر سے لاک رکھیں۔ تو شک کی کوئی بات ہے۔ میں بستر میں اٹھ کر بیٹھ گئی ہوں۔ پہلی بار مجھے رات کے اندھیرے اور اپنی تنہائی سے خوف آنے لگا ہے۔ اندر کوئی اضافی چٹخنی بھی نہیں میرے اندر کا جاسوس وسوسوں میں مبتلا ہو گیا ہے ایک یہ تالہ جو یقیناً دوسری چابی سے باہر سے بھی کھل سکتا ہو گا...... کیا کیا جائے۔ ہاں تالا لگا کر چابی کو اندر ہی رہنے دیا جائے تا کہ باہر سے کوئی چابی اسے کھول نہ سکے میں کم از کم اپنے وطن سے اتنی دور کسی حادثے سے دو چار ہونا نہیں چاہتی...... مجھے ابھی بہت سی ذمہ داریاں پوری کرنا ہے۔ بچوں کی شادیاں کرنا ہیں۔ فیصل کو پائلٹ بننے کے لیے اس کے ابو سے جھگڑ کر بھجوانا ہے۔ میرے نہ ہونے سے وہ سب سے زیادہ دکھی ہو گا۔ اور اس بات سے اور بھی زیادہ کہ کوئی اور اس کے لیے اس کے ابو کی نہ بھیجنے کی رائے کو تبدیل کروانے کی ہمت نہیں رکھتا۔ ایک تو یعقوب خان ہیں اور پھر قطعی رائے

رکھنے والے وکیل......ان دو زبردست خصوصیات سے نبرد آزمائی کرنا اس کے بس کی بات نہیں ۔مجھے رات کو اجنبی اور غیر مانوس راستوں سے گزرنا اجنبی اور غیر واقف لوگوں سے ملنا بالکل پسند نہیں۔لیکن یہ سیاحی......اگر ہم دن کی روشنی میں یہاں پہنچتے تو یقیناً میں ایسا کمرہ ڈھونڈتی جس میں ٹی وی بھی ہوتا کہ رات کے نا مختتم طوالت اور تنہائی کو ٹی وی کے رنگس میں بھگو کر قدرے قابل برداشت بنایا جا سکے۔لیکن اس کمرے میں نہ چائے ہے نہ ٹی وی یہ بھی اپنی مالکہ کی طرح غیر دوستانہ رویہ رکھتا ہے۔کسی بھی شخص کا گھر اس کے مزاج کا عکاس ہوتا ہے......نہ جانے اس خاتون پر کیا افتاد پڑی کہ یہ مسکرا بھی نہیں سکتی۔اور پھر رات کے وقت سٹیشن سے نزدیک تر کوئی دوسرا کمرہ تلاشکرنے میں وقت لگتا اور بارش میں نہ جانے کہاں تک بھیگنا پڑتا۔

چھتری خریدتے ہوئے میں دراصل اونچی نیچی جگہوں پر اسے لاٹھی کے طور پر استعمال کرنے کے لیے خریدا تھا......لیکن یہ پچھلے تین دنوں سے برابر کام آرہی ہے۔

خدا ہماری یقیناً مدد کرے گا اور یہ رات بھی تو اسی کے تابع ہے۔میں نے پچھلے کئی دنوں سے شام کی نماز نہیں پڑھی اپنی پاکی کے بارے میں وسوسوں میں گھری رہتی ہوں۔ایک ناپاک چھینٹا سارے بدن کو آلودہ کر دیتا ہے۔اور پھر یہاں موسم بھی تو سرد ہے۔اکثر کئی کمرں کے لیے ایک ہی غسل خانہ ہوتا ہے۔خدا اتنی جلدی مجھے نہیں بھولے گا کیونکہ میں اس کا سہارا لے کر ہی اتنی دور تک چلی آئی ہوں۔

میں نے آیت الکرسی اور چار قل پڑھ کر سب طرف پھونک ماردی ہے۔اور اس آیت کے اثر کا ذکر تو کئی کتابوں میں رقم ہے کہ اس کے کھینچے حصار کو کوئی نہیں توڑ سکتا اور قل مصیبتوں سے محفوظ رکھتے ہیں۔اے رحم کرنے والے مجھ پر رحم کر۔میں پڑھ رہی ہوں......اور رات دروازوں کے...... باہر آگاہ عورت کی طرح بارش میں بھیگی اپنے انگ انگ کا نظارہ کروا رہی

ہے اور اس کے سیاہ بال پریشان ہیں......اور اے خدا تو ہی رحم کرنے والا ہے۔

شلزبری کا قصبہ پرانا تاریخی انداز کا ہے۔تمام شہر کی چھتیں بارشوں اور کائی کی وجہ سے سیاہ پڑ چکی ہیں کہیں کہیں سرخ اینٹیں جھانکتی ہیں۔پہلی بار وہاں گندی وردی والے ریلوے ملازمین پھر رہے ہیں لفٹ سے سامان لاتے ہوئے میں نے پہلی بار کسی ریلوے سٹیشن پر سنڈاس کی بو محسوس کی تھی۔یہاں مسافروں کو ہیلو کہنے کا بھی رواج کم ہے۔پہاڑیاں ہل چلا کر ہموار بنادی گئی ہیں۔نئی فصلیں اگانے کے لیے۔

گاڑی آگے بڑھ رہی ہے اب زمین پنجاب کی زمین کی طرح ہموار ہے۔لیکن یہاں کے دیہات پختہ مکانوں اور صاف ستھری سڑکوں کی وجہ سے خوبصورت تصویر نظر آتے ہیں۔سورج پوری جولانی سے آسمان کے بیچ آن ٹکا ہے۔لیکن سردی میں کاٹ بڑھ گئی ہے۔پہاڑیاں دور ہٹتی جارہی ہیں۔لیکن یہ اندازہ زیادہ دیر قائم نہیں رہا۔فطرت کی فیاضی قابل داد ہے چرچ سٹریٹن کا قصبہ آگیا۔چند مسافر اترے ہیں چند سوار ہوئے ہیں۔کریورن ڈرمز ٹونگ بردرز لیوفسٹرز زمین اب ہلکی پلیٹو کی شکل اختیار کرتی جارہی ہے۔زرعی زمین گائیوں کے ریوڑ گاڑی ایک لمبی سرنگ سے گزر کر سورج کے سامنے آگئی ہے۔شفاف نیلے آسمان پر چاند دن کے دس بجے بھی ہلکے سفید بادل کے ننھے سے ٹکڑے کی رنگت نظر آرہا ہے۔دور افق کے کنارے چند سفید فام گائیں ہیں۔اون کی تجارت کے فروغ دیتی بھیڑیں ہیں۔ہم ویلز کے نیچے کی طرف سفر کررہے ہیں۔جس سٹیشن پر ہم اترے ہیں اس کا نام ہیرفورڈ ہے۔ایک جگہ سے مختلف علاقوں کی بسیں جاتی ہیں۔میں سامان گھسیٹتی وہاں آکر بنچ پر بیٹھ گئی ہوں۔پہلی بار میں نے ٹوٹے بنچ اور بوسیدہ شیڈز دیکھے ہیں۔گورا جمعدار دستانے پہنے بے دلی سے صفائی کررہا ہے۔بس سٹینڈ ویران سا ہے۔اکا دکا بوڑھے مرد اور عورتیں اپنے اپنے سامان کے ساتھ بیٹھے

ہوئے ہیں۔ایک بوڑھمیاں بیوی کپڑوں میں لپٹے سردیوں کے سواگت کے لیے تیار ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے اپنے لرزاں جسموں کے ساتھ زندگی کی سزا بھگتنے کی کوشش کر رہے ہیں۔یہ بھی تو خوش بختی ہے کہ وہ اس وقت تک ایک دوسرے کا ہاتھ تھامنے کو موجود ہیں۔

نئی بس ہمیں ہے اینڈ وائے کی طرف لے جانے کے لیے بازاروں کی موڑ بڑی مہارت سے مڑ رہی ہے۔حالانکہ مجھے کئی بار لگا کہ وہ ضرور کسی کو اپنے نیچے کچل ڈالے گی یا کوئی خون میں لت پت تڑپنے لگے گا۔لیکن ڈرائیور کی مہارت قابل داد ہے۔میوزیم اینڈ آرٹ گیلری ایک پرانا قلعہ...... پرانی ندی کے عبور کرنے کے لیے بنا ایک پرانا پل۔

میوزی اینڈ آرٹ گیلری کو اندر سے دیکھنے کے لیے ہمارے پاس وقت نہیں تھا......ہمیں رات ہونے سے بہت پہلے اس قصبہ میں پہنچ جانا ہے جو ہماری منزل ہے۔لیکن گیلری کے باہر کا چہرہ بڑا ہی تاریخی ہے۔پرانے طرز کی چھت کی گگر پر مختلف جانوروں کے چھوٹے چھوٹے بت بنے ہوئے ہیں۔شاید یہ بھی ان کی میتھولوجی میں شامل دیوتا ہوں۔میں تاریخ کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی۔تاریخ واقعات کو میں فرفر دہرا نہیں سکتی......لیکن میں اسے سراہ سکتی ہوں۔اس کی تعریف کر سکتی ہوں۔یہ آواز کیسی ہے۔ارے بچہ رو رہا ہے...... انسان احتجاج کر رہا ہے دنیا سر سے بھر گئی ہے۔لیکن ماں نے سیٹ پر بیٹھتے ہی اس کے منہ میں دودھ کی بوتل دے دی ہے۔نیلی شفاف آنکھوں والا بچہ بوتل کو ہاتھوں سے تھامے چسر چسر دودھ پی رہا ہے۔سر تھم گئے ......کائنات کے پردے پر ایک ہی نظارہ ٹھہر گیا ہے......سکرین ابھی آگے کو سرکے گی۔اللہ نے زمین کو تخلیق کیا اور اس پر خوب صورتی کے لیے رنگ بکھیرا دیئے۔اس نے آسمانوں کو بنایا اور چاند ستاروں سے مزین کر دیا......اس نے انسانوں کو بنایا اور انہیں مختلف نسلوں اور رنگوں میں بانٹ دیا تا کہ وہ ایک دوسرے کو پہچان سکیں......لیکن سوچوں

کے اختلافات نے دوریوں کو وسیع خلیج بنا ڈالا جو پاٹی نہ جا سکیں۔خون آہیں ہتھیار تجارت روپیہ...... پونڈ ڈالر روبل ریا...... انسان نے خدا کی مصلحتوں کو سمجھنے کی بجائے انہیں اپنے لیے وجہ افتخار بنا ڈالا اور پھر کوئی گورا کہلایا کوئی کالا۔لیکن اسلام نے ان فرقوں کو تسلیم نہیں کیا۔محمود و ایاز کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا۔

لیکن محمود و ایاز بھی تو اسی زمانے کے انسان ہیں...... محمود کو اپنی بڑائی کا شدید احساس ہے۔ایاز اپنی غلامی اور فرماں برداری کی زنجیریں کاٹ ڈالنے کے لیے بے چین ہے...... اور رشتوں میں روپے کی کمی بیشی زبردست فرق ڈالتی ہے...... بھائی بھائی کو نہیں مانتا...... پہچانتا...... ہماری زندگی میں کچاؤ ہی کچھاؤ ہے...... ہارٹ اٹیک بلڈ پریشر نفسیاتی اور ذہنی بیماریاں...... ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی تگ و دو......۔

لیکن خدا کی زمین ایک ہے...... تخلیق کرتی پرورش کرتی پھل پھول دیتی رنگ بکھیرتی خوب صورتیوں کی پروردہ...... آنکھوں کی تراوٹ جان کی ٹھنڈک۔

اب کھیتوں کی سرخ نم دار مٹی کو ہل چلا کر فصل بونے کے لیے تیار کیا گیا ہے۔چھوٹے چھوٹے پھلوں کے باغ درختوں کی شاخوں پر سرخ سیب اور ناشپاتیاں لٹکی ہوئی ہیں۔لان پھولوں سے بھرے ہوئے ہیں۔سارا ویلز ایک سرسبز پلیٹو ہے جہاں ڈیری فارمنگ کی جاتی ہے۔اون کی صنعت کو ترقی دی گئی ہے۔

سورج سرسبز چراگاہوں پر چمکتا جا رہا ہے۔بالکل پنجاب کے سورج کی طرح۔مجھے یہ سورج اپنا اپنا سا لگ رہا ہے۔جیسے مجھ سے ملنے کے لیے آیا ہو۔ابر آلود آسمان بہت دور رہ گیا ہے۔بارش لیمبیرس کے پہاڑوں پر بھی گر رہی ہوگی۔لیکن یہاں روشن چمکیلا دن سب طرف بازو پھیلائے انسانوں کی آنکھوں میں جھانک رہا ہے۔کتابوں کا شہر "ہے اینڈ وائے"۔

''ہے اینڈ وائے'' پہلے جیسا ایک چھوٹا سا شہر...... لیکن اس کی خوبی کسی دوسرے میں نہیں...... اسے پرانی کتابوں کا شہر کہا جاتا ہے۔ دنیا کی تمام کتابیں آپ کو سستی مل جائیں گی...... یہ اور بات ہے کہ وہ پاکستانی روپے کے حساب سے ابھی بھی مہنگی ہیں...... لیکن علم سے محبت رکھنے والے دور دور سے آتے ہیں.......... دن کے ڈھائی بجے ہیں اور ہمیں رات کے ٹھکانے کا بندوبست پہلے کرنا ہے...... اونچی نیچی گلیوں میں لوگوں سے پوچھتے پوچھتے میں ایک دروازے پر رک کر بیل دے رہی ہوں...... بوڑھی عینک والی خاتون نے دروازہ کھولا ہے...... اس کے چہرے پر استفسار ہے......

اور ہمیشہ کی طرح کمرے میں سامان رکھ کر باہر آ گئی ہوں...... تین ہی تو بجے ہیں...... بہت دن باقی ہے...... عاشی بہت سی کتابیں خریدنا چاہتی ہے......

میں ایک دوکان میں گھس گئی ہوں۔ تین منزلہ دکان۔ کتابیں ہی کتابیں ہر موضوع کا ایک الگ سیکشن ہے...... بورڈ لگے ہیں ملٹری پر...... بحری فوج پر لٹریچر اخلاقیات نفسیات جغرافیہ تاریخ...... آپ کسی بھی سبجیکٹ کی کتاب لینا چاہیں...... سیڑھیاں اوپر جاتی ہیں۔ نیچے جاتی ہیں...... شیلف کتابوں سے اٹے پڑے ہیں۔ دیواروں کے ساتھ رکھی ہیں لوگ الماریوں کے سامنے کھڑے کتابوں کو دیکھ رہے ہیں میں بھی کتابوں کو مسلسل دیکھ رہی ہوں...... کیا خریدوں...... کتنے پونڈ باقی ہیں۔ کتنا سفر باقی ہے۔ کون سے جگہیں دیکھنی باقی ہیں۔ جسم میں کتنی جان باقی ہے۔ دل میں کتنا حوصلہ باقی ہے۔ شام پانچ بجے تک کتنا شہر دیکھنا باقی ہے۔ بوجھ بڑھ گیا ہے چند کتابیں ہی ایک بڑا بوجھ بن جاتی ہیں...... لیکن یہ سفر تو کیا ہی کتابوں کے لیے تھا...... یہاں ضرور عالم لوگ آتے ہوں گے جو زندگی کی وجاہتوں میں اضافہ کرنے کے لیے دن رات محنت کرنا جانتے ہیں...... علم ان کا سرمایہ ہے۔ اور وہ اپنے سرمائے کی

حفاظت کرنا جانتے ہیں...... پرانا قلعہ جہاں کبھی بادشاہ جازیں ہوں گے اب کیسل بک شاپ کہلاتا ہے۔ قلم کی کاٹ تلوار کی کاٹ سے کہیں گہری ہے...... انہیں خبر ہے اور باخبر لوگ ہی دنیا پر حکمرانی کرتے ہیں۔ وقت کا زیاں گوارا نہیں۔ سینما میں فلمیں دیکھنا...... اس وقت کو کسی بہتر مقصد میں صرف کیا جا سکتا ہے۔ یہاں کوئی سینما نہیں کیونکہ سینما ایک بک شاپ کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ دیکھا آپ نے...... میں اپنے ملک کے بارے میں پریشان ہو جاتی ہوں...... لوگوں کو پڑھنا چاہیے۔ علم روشنی ہے بقا ہے حیات ہے ہمارے ہاں کتاب زیادہ نہیں بکتی۔ ہوٹل بھر جاتے ہیں۔ بازہ مارکیٹیں پررونق ہیں...... سینما کی ٹکٹ بلیک میں ملتی ہے۔ مارکیٹ میں چھوٹی سی دکان کے قیمت لاکھوں تک پہنچ گئی ہے...... خریدار کی جیب خالی ہو رہی ہے۔ دکاندار کی تجوری بھر رہی ہے۔ ذہن سنسنا رہے ہیں...... اس لیے کتاب کے لیے پیسے نہیں۔ کتاب خریدنا بے کار ہے۔ پڑھنے کے لیے وقت ہی نہیں ملتا۔ خالی وقت ٹی وی کی نظر ہو جاتا ہے۔ اور پروی سی آر پر انگریزی اردو فلمیں دیکھنے کے لیے بھی وت آپ کو وقت کی ضرورت ہے۔ ذہنی تربیت کی ضرورت نہیں۔ ہم اپنا نفع نقصان خوب سمجھتے ہیں...... اور یہ لوگ یہاں یہاں پر آتے لوگ یہاں سے جاتے لوگ...... فضول وقت اور پیسہ ضائع کرتے ہیں۔

لیکن میں جانتی ہوں کہ یہاں پر کتابیں خریدنے والے لوگ علم کے جویا ہیں۔ بوڑھے عمر رسیدہ لوگ بڑے بڑے سکالر...... پڑھا کو طالب علم کچھ بننے کی خواہش رکھنے والے نوجوان...... ایک کتابوں کی دکان کی مالکہ نے بتایا کہ یہ سارا علاقہ مشر جونز نے خرید کر لیا ہے۔ وہ کتابوں کا عاشق ہے آج کل وہ امریکہ گئے ہوئے ہیں تاکہ ایک بکتی لائبریری کو خرید کر لایا جائے۔ وہ اپنے آپ کو یہاں کا فرانروا کہلاتا ہے۔ اپنی جوبلی مناتا ہے۔ بی بی سی نے دو گھنٹے تک ٹیلی ویژن پر اس کا پروگرام دکھایا تھا۔ وہ چار سال میں اس دن آنے والوں کو

پاسپورٹ کی پابندی لگاتا ہے۔

ایسے ہی جنونی اور دیوانے کتابوں کے پیچھے بھاگ سکتے ہیں۔ایک لگن ایک ماروائی جذبے کے ساتھ اور جونز ایسے ہی دیوانے کا نام ہے۔

میں کتابوں میں مختلف موضوعات کو پڑھ رہی ہوں۔اتنے بڑے انبار سے اپنی پسند کی کتابیں چننا بھی وقت طلب کام ہے۔

حالانکہ ہر مضمون پر الگ الگ سیکشن ہے۔کتابوں کے انبار لگے ہوئے ہیں۔دکانوں کے باہر ایک پونڈ میں 5 کتابیں خریدنے کا بورڈ لگا ہوا ہے۔لیکن ایک بھی کام کی کتاب نہیں ملی۔میں کیس بک شاپ کے اندر چلی گئی ہوں۔یہاں تو میڈیکل کی کتابوں کا ایک سیکشن ہے۔میں نے اپنی بڑی بیٹی کے لیے گھنٹہ بھر کی کوشش کے بعد دو کتابیں اپنی عقل کے بھروسے پر خرید لی ہیں۔شائد وہ اس کے کام آجائیں۔دو کتابیں مختلف نوعیت کی خرید لی ہیں۔بوجھ اور بڑھ گیا ہے۔مجھ سے تو پہلا بوجھ نہیں اٹھ رہا......اور اب مزید بوجھ جسم کی تھکاوٹ دور کرنے کے لیے ہم ایک ریسٹوران کا بوسیدہ سا گیراج جیسا لکڑی کا دروازہ کھول کر اندر چلے گئے ہیں۔گول پہیہ......پاس پڑا کسی ریانے زمانے کے سیلر کا بت جس نے رانے زمانیکے کپڑے پہن رکھے ہیں۔لکڑی کے بے رنگ ستونوں والی چھت......جس پر مختلف چیزیں لٹکی ہوئی ہیں......پلاسٹک کے پھولوں کی بیلیں دیواروں سے چمٹی ہوئی ہیں اور کرسیاں میزیں بھی وقت کو دھوکا دے کر گذرے زمانے کے لمحوں میں قید ہو گئے ہیں......بند دروازے کے اندر بیٹھ کر لگتا ہے جیسے پرانے زمانے کے لوگ سمندروں کے سفر کے تھکے ماندے مسافر میرے چاروں طرف بیٹھے ہوں اور میں بھی گذرے وقت کو پامال کرتی ان میں سے ہی ایک بن گئی ہوں......

بڑے بڑے برتنوں کے نیچے آگ جل رہی ہے اور سبزی کا گھاڑا سوپ ابل رہا

ہے۔شاید رپ وین ونکل نے کسی ایسے ہی برتن سے گہری نیند لانے والی شراب پی ہو گی......اور اب میں......نیند کا وقفہ نہ جانے کتنا لمبا ہو......اور جب میں جاگوں تو......میرا تخیل سوچ کے گھوڑے کی باگیں تھامے بگٹٹ بھاگ رہا ہے۔......اس بوسیدگی اور کمینگی میں ایک خوبصورتی ہے۔ایک کشش ہے۔جیسے وقت تھم گیا ہو......دیدزمانے کی موجودگی کا احساس نہیں ہو رہا......ہاں ویٹرس جوان اور خوبصورت ہے۔لوگ خاموشی سے لائن میں کھڑے اپنی باری کا انتظار کر رہے ہیں۔

سوپ کے پیالے سے بھاپ اٹھ رہی ہے۔اور میں بن پر مکھن لگا کر کھاتے ہوئے اپنے اردگرد ہمیشہ کی طرح دیکھ رہی ہوں۔کتابوں سے بھرے تھیلے......یہاں بیٹھے لوگ جوان نہیں......ان کے چہروں پر سنجیدگی اور ٹھہراؤ ہے......سوچ کی روشنی اور عقل کی جلا ہے۔اور یہ روشنی وہ یہاں سے جا کر اپنے اردگرد پھیلائیں گے۔اور آنے والی نسل اس سے مستفید ہو گی اور انسانی شعور الجھی گتھیوں کو سلجھائے گا۔اور دنیا کو جینے کا ڈھنگ آئے گا......سورج مغرب کی طرف جھک رہا ہے۔پانچ بج چکے ہیں۔چوک کے کنارے کھوکھوں میں لگی دکانیں سمیٹی جا چکی ہیں......لوگ کیا ہوئے......میں خالی سڑکوں پر پھر رہی ہوں۔جیسے کہتی پھر رہی ہوں آدم بو......آدم بو......اور انسان خوف زدہ ہو کر چھپ گئے ہیں......کتابیں کمرے میں رکھ کر ہے اینڈ وائے کو دیکھنے کے لیے میں واپس آ گئی ہوں......صرف ایک دکان کھلی ہے۔میں نے پہلی بار اسقصبے میں وڈیو کی ایک دکان دیکھی ہے۔اگر یہ لوگ وقت کا زیاں نہیں کرتے تو میرے ملک کے لوگ کس جدیدیت کے نقش قدم پر چل کر وڈیو کی لاعلاج بیماری میں مبتلا ہو گئے ہیں میں نے کوک اور کیلے خریدے ہیں۔اور سامنے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے دور آسمان کی دلربا نیلاہٹ کو دیکھتے ہوئے کھڑی ہوں۔رات کی لمبائی میرے ذہن کے گرد لپٹنے والی ہے۔رات

جس میں میں تنہا ہو کر ناخوشگوار باتوں کے عذاب میں مبتلا ہو جاتی ہوں۔ میں جو ایک عورت ہوں اپنے آپ کو بڑا بے بس پاتی ہوں...... کیا مجھے واپس چلے جانا چاہیے...... میں اس ناکردہ غلطی کا خمیازہ بھگت رہی ہوں۔ رشتوں کے بندھن کچے ہیں۔ دولت میں طاقت ہے اور کوئی طاقت دولت کی طاقت سے بڑی نہیں...... لیکن میں خاموش رہتی ہوں...... بوجھ بڑھ رہا ہے دل پر جسم پر روح پر اور جب انسان کے لیے یہ بوجھ ناقابل برداشت ہو جاتا ہے تو اسے خدا یاد آتا ہے...... اور میں خدا سے مدد مانگ رہی ہوں۔ سامنے ہی ایک پرانے طرز کا گرجا گھر ہے۔ اس کے صحن میں قبروں پر کتبے لگے ہوئے ہیں۔ سیاہ سرمئی پتھروں سے بنائے گئے چھوٹے چھوٹے مقبرے۔ میں زرد پتوں پر پاؤں رکھتی اندر جا رہی ہوں۔ وسیع ہال پالش شدہ بنچ۔ حضرت مسیح کے بت کے قدموں میں پھل۔ سبزیوں کا چڑھاوا چڑھا ہوا ہے۔ دیواروں پر مینا کاری سے نقش و نگار بنائے گئے ہیں چرچ کی دیکھ بھال کرنے والی خاتون ہر چیز کی ترتیب کو بار بار چیک کر رہی ہے...... میں اپنے خدا کو کہاں پکاروں اتنے بڑے وسیع علاقے میں ایک بھی مسجد نہیں۔ پچھلے تمام گذرے دنوں میں اذان کی آواز ایک بار بھی میرے کانوں سے نہیں ٹکرائی...... اتنے بڑے حصے میں مسلمانوں کی اپنی کوئی پہچان نہیں...... میں آگے بڑھ کر حضرت عیسیٰ کے مصلوب جھکے غم زدہ سر والی شبیہہ کو دیکھ رہی ہوں...... اور اللہ نے ہر مذہب کو اسلام کے طور پر اتارا...... اور ہر نبی صرف اس کی ہی تبلیغ کرتا تھا۔ اس کی ذات کی ہی گواہی کے لیے بھیجا گیا تھا...... اسی کے نام کی پکار کا ڈنکا بجتا تھا...... اور حضرت عیسیٰ کے پاکیزہ ہونے کی گواہی اسلام نے ہی تو دی ہے...... پھر اس بلند مرتبت پیغمبر کو یہاں اس نیم تاریک گرجا گھر میں کیوں قید کر دیا گیا ہے۔ میں بنچ پر بیٹھی خدائے واحد کی حمد کر رہی ہوں...... میرے دل کے اندر کسی دوسرے خدا کی کوئی گنجائش نہیں...... اور خدا واحد ہے۔ اور وہ نہ کسی سے جنا گیا ہے نہ اس سے

کوئی جنا گیا......اور اس کے برابر کوئی نہیں.......

کس قدر خاموشی اور تنہائی ہے۔ اور وقت کے اس لمحہ میں میں نے اپنا سر اس واحد ہستی کے سامنے جھکایا ہے۔ اور باہر سرمئی شام کی ہوائی چل رہی ہیں۔ اور انسانوں کو آج کے زمانے میں خدا کی ضرورت نہیں۔ نہ مسجد میں نہ گرجا میں کوئی تیرسا حضرت عیسیٰ کا حواری نہیں آیا......لڑکے نے بڑے سے پیانو کے سامنے بیٹھ کر میوزک کی کتاب کھولی ہے اور میں سر اٹھائے اسے دیکھتے ہوئے لے کو اس بلندی طویل ہال کی خالی کرسیوں پالش شدہ بنچوں بند کتابوں اور آلٹر کے سامنے پڑے ہوئے پھلوں کے اوپر ہوئے ہولے تیرتے محسوس کر رہی ہوں۔ لے میری طرف میرے دل کے اندر قدم قدم سرک رہی ہے......اور قبروں کے کتبوں کے اوپر زمانوں کی گرد پڑی ہوئی ہے۔ اور شاید ان قبروں میں کبھی ایک قبر کا اضافہ ہوگا۔ جس پر لکھا ہوگا یہاں مسٹر جونز دفن پڑی ہوئی ہے۔ جو کتابوں سے بہت محبت کرتی تھی۔ انہوں نے اپنی ساری دولت کتابوں کو خریدنے میں صرف کر دی......اور خدا اس کتابوں کے عاشق کو شاید جنت میں جگہ دے......لیکن......لیکن وہ تو مسلمان نہیں......وہ جنت میں کیسے جائے گا......اور میں......میں جو مسلمان ہوں......جنت میں کیسے جاؤں گی......صرف اس لیے کہ میں نے حلالا گوشت کھایا......اور اپنے نفس کی پرورش کی......اور اپنی ذات کو چاہا......اور باقی سب کو اپنے سے کمتر اور حقیر جانا۔ اور دولت کے انبار کے اوپر اپنی ذات کی نمائش کے لیے رنگ محل بنوائے......میں موت سے زیادہ اپنے آنے والے انجام سے خوف زدہ رہتی ہوں...... کتبے خاموش ہیں۔ پتوں کے ڈھیر قبروں کی دیواروں کا سہارا لے کر استراحت کر رہے ہیں۔ صدیوں پرانا درخت شاخوں پر ہاتھ رکھے خمیدہ کمر قبروں پر جھکا ہوا فنا کا فلسفہ سمجھ رہا ہے......لڑکیاں دکان میں داخل ہو کر چیزیں خرید رہی ہیں۔ نیلا آسمان خاموش ہے۔ یہاں

کے لوگ اپنے گھروں میں بھی شاید چپ ہی رہتے ہیں۔اور اسی قصبے کے ایک بچے نے مجھے بلکیکی کہا ہے۔میرا جی چاہتا ہے اس کو پاکستان کے بارے میں بتاؤں۔اس کی خامیوں کا اعتراف کروں۔اس کی خوبیوں کو سراہوں......میں پاکستان کے خلاف بات کرنے والوں کو پسند نہیں کرتی......میں رشتوں کو قطع کرنے والوں کو انسان نہیں سمجھتی۔میں غداروں کے زندہ رہنے کا حق تسلیم نہیں کرتی......

میں واپس جاتے ہوئے آخری بار گرجا گھر کو مڑ کر دیکھتی ہوں۔اس کی تاریخی چہرہ اداس ہے۔اس کا باطن اداس ہے۔قصبہ اداس ہے۔

خدا کرے ہمارے ملک کو کوئی ایسا رہبر ملے جو ہمارے قصبوں اور شہروں کو ایسا ہی خوبصورت بنا دے ہماری زراعت کو اتنی ہی ترقی دے کہ چپہ چپہ سرسبز ہو جائے۔میں بہت سی دعائیں مانگنا چاہتی ہوں۔بہت سی دعائیں جو میرے وطن کے لوگوں کے دکھ دور کر کے ان کی خوشی اور خوشحالی کی طرف لے جائے۔معلوم نہیں میرے جذبوں میں سچائی ہے یا نہیں عا کی قبولیت کا وقت نہ جانے کون سا ہوتا ہے......میرا وطن بھی سرسبز ہے وہاں بھی نالے ندیاں اور دریا ہیں۔پہاڑ وہاں بھی سروں کو اٹھائے بڑی آن بان سے آسمان سے باتیں کرتے ہیں......صرف ان کو سر کرنے والے جذبے اور طابع کرنے والے ہاتھ چاہئیں۔

رات گزر گئی......ایک اور رات اجنبی سرزمنی پر میرے وجود پر سے گذر گئی۔کھڑکی سے سٹریٹ لائٹ ملگجے اندھیرے میں جھانکتی رہی تھی......لیکن مجھے یہاں کبھی گہری نیند نہیں آتی ۔یادوں کا میلہ سا جگائے رکھتا ہے۔سارے دن کی روداد ذہن میں ہلچل سی مچائے رکھتی ہے......اکیلے پن کا کانٹا دل میں چبھتا رہتا ہے۔

نامعلوم خوف میرا تعاقب کرتا رہتا ہے۔

بوڑی لینڈ لیڈی تیز تیز قدموں سے چلتی اپنے مہمانوں کو ناشتہ دے رہی ہے۔ڈرائنگ کم ڈائننگ روم کا ہیٹر جل رہا ہے۔ٹیلی ویژن پر سیول کی کیلیں دکھائیں جا رہی ہیں۔کھلاڑیوں کے نشہ پر تحقیقاتی رپورٹ پیش کی جا رہی ہے......اس گھر کے کونے کونے میں پرانی خوبصورت کراکری کو سجاوٹ کے طور پر رکھا ہوا ہے۔بڑے بڑے چینی کے منقش جگ اور چاپیچیاں......پیتل کی خوبصورت کیلوں سے جوڑی ہوئی پلیٹیں......میں نے لینڈ لیڈی سے اس کے گھر کی تعریف کی ہے۔وہ بے حد خوش نظر آ رہی ہے......ایک لانبے قد کا آدمی جو یقیناً اس کا بیٹا ہوگا۔بڑے فخر سے کہتا ہے کہ ہمارا گھر تمام بستی کے گھروں سے زیادہ خوبصورت ہے اس کے چہرے کا غرور بچگانہ سنجیدگی لیے ہوئے ہے۔ایک انگریز میاں بیوی بھی کتابوں کے سلسلے میں آئے ہیں۔ہم سب باتیں کر رہے ہیں......زندگی کے ماہ وسال گذر رہے ہیں۔عورت کے چہرے پر گہری طمانیت ہے۔اسے اپنے گھر پر فخر ہے۔پرانی چائے دانی پیتل کی چیزیں......اس کی ساتھی اس کی ہم عمر چیزیں اس کو دوسرا تھ دینے کے لیے اکٹھا خواب دیکھنے کے لیے...... یہاں کا دریا خاصا خودسر نظر آتا ہے شاید وہ قدرے میدانی علاقہ دیکھ کر پاؤں پسار رہا ہے۔وہ کھلی جگہ دیکھ کر سمٹے سکڑے بہتے رہنے کی تھکن اتار رہا ہے۔میں نے بوڑھی عورت کو اور دوسرے ساتھی مسافروں کو خدا حافظ کہا ہے۔او بھاری سامان کو گھسیٹ کر باہر لے آئی ہوں۔بس سٹاپ مین روں پر ہے اور اونچی نیچی گلیوں سے گزر کر میں بس سٹاپ پر رک گئی ہوں۔بس سٹینڈ پر بجی سجائی بوڑھی عورتیں ہاتھوں میں تھیلے پکڑے کسی اگلے بڑے قصبے میں خریداری کے لیے جا رہی ہیں۔یا کسی کو ملنے کے لیے......تجدید ملاقات۔دکھ سکھ کی باتیں ......تنہائی دور کرنے کی خواہش......

ایک مسافر جوان جوڑا ہمیشہ کی طرح جذبات کو ٹھنڈا کر رہا ہے۔لڑکی نہ جانے کیوں رو

رہی ہے......شاید جدائی کا وقت ہو......فراق کی گھڑی ہو۔اور محبوب سے الگ ہونا قیامت سے کم تو نہیں ہوتا......تڑکا اس کی نم آنکھوں پر بوسے ثبت کرتے ہوئے اسے تسلی دے رہا ہے......لڑکی اپنی ہاف پینٹ اور بوسیدہ سیٹر میں ملبوس عام سا تاثر دے رہی ہے۔لیکن محبت تو دلوں کا سودا ہے......اور میں جانتی ہوں یہ دونوں یہاں کتابوں کی خریداری کے لیے ہی آئے ہوں گے کسی دوسری جگہ سے۔میں ہمیشہ کی طرح ڈبل ڈیکر کے اوپر کے حصہ میں جا کر بیٹھ گئی ہوں۔واپس جاتے ہوئے ان نظاروں کو دیکھنا ویسا ہی پرکشش جیسا کہ پہلی دفعہ تھا......شاید میں یہاں دوبارہ نہ آسکوں......وقت فرصت......روپیہ......نہ جانے کس کی کمی ہو......لڑکا اور لڑکی بھی بس کے اوپر کے حصہ میں آکر کونے میں بیٹھ گئے ہیں۔تو یہ آنسو......آہ دل نادان ......آنسو تو خوشی پر بھی بہہ سکتے ہیں......میں ان کو دیکھنا نہیں چاہتی۔یہ نظارہ غیر معمولی نہیں......لیکن اس کے باوجود بہت عام نہیں۔میں کبھی کبھی ان کو دیکھ لیتی ہوں۔یہاں کے لوگ زندگی میں ایک بار ضرور ان شوریدہ سر جذبوں کا شکار ہو کر یہی کچھ کر چکے ہوں گے......وہ دونوں ایک دوسرے میں کھو گئے ہیں۔اور میرے اندر کا افسانہ نگار کہانی بننے میں مصروف ہو گیا ہے......میں اس کہانی کو یوں بھی شروع کر سکتی ہوں۔جیک اور جل کتابوں کی ایک دکان میں ملے۔وہ ایک ہی کتاب کی تلاش میں تھے۔وغیرہ......وغیرہ......مجھے کردار چاہیں زندہ اور دھڑکتے دلوں والے......آنسو چاہئیں جو خون جگر بہائیں۔اور پھر میرا اپنا دل ان کی تمام وار دات کے ساتھ دھڑکنے لگتا ہے......میں ان میں بسنے لگتی ہوں......نہ جانے میں انہیں زندہ بھی کر پاؤں گی یا نہیں۔

تصویراتی تصویری خوبصورتی......نظارے......اوپر سامنے کی سیٹ پر ایک نوجوان دیہاتی لڑکی اپنے دو بیٹوں کے ساتھ بیٹی عورت کی ماستا کی مکمل تصویر لگ رہی ہے۔اس کے

دونوں بیٹے سرخ وسفید چہروں والے بچے ہیں۔ اگر ہمارے ہاں کسی کے اتنے خوبصورت بچے ہوں تو وہ یقیناً اپنے آپ کو فخر سے دوسری ماؤں سے بلند تر سمجھے......۔

اور یہ بات مجھے کبھی سمجھ نہیں آئی کہ ہم اس چیز پر مغرور ہو جاتے ہیں جس کا خالق ایک عظیم مصور ہے......اس خوبصورتی میں ہمارا فن ہمارا کمال ہمارا شعور کچھ بھی تو کام نہیں آتا۔ پھر بھی ہم اسے وجۂ افتخار بنا لیتے ہیں......تبھی تو اللہ نے انسان کو ظالم و جاہل کہا ہے......اور ہم خدا کی خدائی کی تعریف کرنے کی بجائے صرف صنعت کو سارا کریڈٹ دے دیتے ہیں۔

یہاں پر سب کے چہروں پر بکھری لالی اور صحت عام ہے۔ دہکتے سرخ وسفید چہروں والی دوشیزائیں......(اگر وہ دوشیزہ ہوں تو) بڑا انچیس تین برس کا سنجیدہ چہرہ کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔ چھوٹا ضدی اور خودسر سا ہے۔ وہ بار بار ہاتھ میں پکڑے سکے کو گرا دیتا ہے جسے ماں یا بڑا بھائی اٹھا کر پکڑاتے ہیں۔ ماں سادہ معصوم دیہاتی عورت ہے......ہم لندن واپس جانے کے لیے ہیر فورڈ کے سٹیشن پر اسی بوسیدہ بس سٹینڈ پر اتر پڑے ہیں۔ بس سٹینڈ ویسا ہی اداس اور اکیلا ہے وہ لڑکا اور لڑکی بھی لندن جا رہے ہیں۔ لندن یہاں کے جوان لوگوں کا بھی سہانا سپنا ہے......اور تعبیر......وہ یقیناً ہے اینڈ وائے میں کسی کتاب کی تلاش میں آئے ہوں گے۔ جستجو اور کوشش زندگی اور خوشی مقصد میں لگن اور سچائی یہ ساری اچھی باتیں یقیناً خدا نے انسانوں کے لیے اتاری ہوں گی لیکن جنتے ہوئے فیصلہ کرتے ہوئے میرے وطن کو لوگوں نے دینا داری کے گہرے رنگوں سے اپنے آپ کو رنگ لیا ہے۔ ہم پیسے کی دوڑ میں شامل ہو چکے ہیں۔ اور یہ دوڑ بلندیوں کیطرف نہیں ذہنی پستیوں کی طرف انسانی قدموں کو گھسیٹتی ہے یہ رنگ دھل بھی سکتے ہیں ان کچے رنگوں کو چھٹایا بھی جا سکتا ہے لیکن ان کو کون دھوئے گا۔ کون ہماری مدد کے لیے آئے گا۔ شاید خدا ایک عاقل آدمی کو ہماری راہبری کے لیے بھیج دے......دعا مانگتے رہنا

چاہیے...... ٹرین چل رہی ہے۔لندن کا تصور بوجھ بن کر میرے دل پر اتر رہا ہے۔ایسکلیٹرز زمین کی تہوں میں اترتے راستے بھاگتے قدم...... تیز چلتی بسیں...... میلوں لمبی رکی موٹروں کی لائنیں نیو ٹاؤن سے پھر ٹرین کو بدلنا پڑے گا۔اور نیو ٹاؤن کا سٹیشن آ گیا ہے۔ٹرین کے کسی دوسرے کمپارٹمنٹ سے پیاری سی لڑکی کوک اور چاکلیٹ کی ٹرالی اتار کر جا رہی ہے۔"مہربانی سے ایک چاکلیٹ دیں" میں نے پونڈ کا سکہ آگے بڑھاتے ہوئے کہا ہے۔اور میں کوک بھی خریدنا چاہتی ہوں۔ایک بج چکا ہے اور مجھے پیاس لگی ہے۔لیکن لڑکی نے معذرت کرتے ہوئے کہا ہے۔سوری ہم پلیٹ فارم پر نہیں بیچتے۔وہ میرے لیے اور چند پینی مزید کمانے کے لیے اصول نہیں توڑ سکتی۔

میں نے یہاں کسی پلیٹ فارم پر گرم چائے چنا چورم گرم نان چھولے...... گوشت مرغ کو بیچتے کسی کو نہیں دیکھا...... بس ٹرین اور مسافر ہوتے ہیں۔توبہ ہے یہ لوگ کتنی بور زندگی بسر کرتے ہیں آوازوں سے تو جیسے انہیں چڑ ہے میں اندر سے الجھ رہی ہوں۔میری پیاس کیسے بجھے گی۔میں پچھلے ایک گھنٹے سے بے مزہ چیونگم کو چبا رہی ہوں میں نے تو سوچا تھا یہ سفر میرا وزن کم کر دے گا۔میں خوب چلوں گی۔کم کھاؤں گی۔لیکن زیادہ چلنے سے زیادہ بھوک لگتی ہے۔اور پھر فرصت کے وقت کو کھانے پینے کی چیزوں سے ہی تو ہم لوگ حسین اور حسین تر بناتے ہیں۔اور میں تفریح کر رہی ہوں۔ٹورسٹ بنی سڑکیں ماپتی پھرتی ہوں۔میں روزانہ برگر اور دو تین کوک پیتی ہوں۔

میں نے بہت چیزیں تو نہیں خریدیں لیکن خاصی رقم خرچ ہو چکی ہے۔لمبے لمبے سفر۔راتیں بسر کرنے کا کرایہ۔رات سوتے سوتے میری آنکھ کھل گئی تو روپے کی جوڑ توڑ میں مجھے نیند ہی نہیں آ رہی تھی...... پچھلی چند راتوں سے میری نیند اچاٹ سی ہو گئی ہے۔شاید میں کافی

زیادہ پی رہی ہوں۔ لیکن میرے جاگنے میں بہت سی فکریں اور باتیں شامل ہیں۔ میں اپنے آپ کو سمجھانا چاہتی ہوں۔ لیکن میں زندگی کی فراخدلی کی عادی ہو چکی ہوں۔ پردیس میں اس فراخدلی سے روپیہ خرچ نہ کرنے پر میں پریشان ہوں۔ دن مجھے ان تفکرات سے جھٹکارا دلا دیتا ہے اور میں چاہتی ہں کہ رات نہ آئے...... لیکن رات بھی آتی ہے ایک نئی جگہ بھی جس سے میں مانوس نہیں ہو پاتی۔ اس بستروں میں نہ جانے کون کون سو چکا ہے یہ خیال بھی مجھے ناپسندیدہ لگتا ہے۔ لیکن مجبوری ہے...... مرغ کو کون ذبح کرتا ہوگا...... گائے کی گردن پر چھری رکھنے والا کوئی مسلمان تو نہیں ہوگا۔ اور یہاں تو کوئی مسلمان ہندو سکھ نہیں رہتا۔ یہ سب انگریزی بولنے اور پونڈ کمانے والی مشینیں بن جاتے ہیں۔ اور مشین کبھی اپنے موجد کا شکریہ تو ادا نہیں کرتی۔ اسے پاکیزگی اور مذہب کی ضرورت نہیں ہوتی...... پھر کیا ہے اگر گوشت قدرے سرخ ہے اور اللہ نے اسے کھانا حرام قرار دیا ہے...... مسلمان ہونا کوئی وجہ فخر نہیں...... اور پھر جب انسان انگریزی ہی بولنے لگے تو مزید ماڈرن بننے کے لیے لا۔ مذہب ہونا ہی فیشن ہے۔ اور پھر پاکستانی تو پاکسان کو گالی یدنے میں عجیب سرور آمیز لذت محسوس کرتے ہیں...... زیادہ جدید...... زیادہ فراخ دل۔ زیادہ انٹرنیشنل سوچ کے حامی۔ لیکن ایسا نہیں...... اب چند لوگ اپنے اور اپنی اولادوں کے لیے مذہب کی تعلیم ضروری سمجھنے لگے ہیں۔ میلاد کی محفلیں ہوتی ہیں۔ محرم کی مجالس بچوں کو قرآن شریف پڑھانا۔ لڑکیوں کے جنس کے بارے میں سوالات کے جواب دینا۔ بوائے فرنڈ کی غیر ضروری افادیت کے بارے میں ان کے خیالات کو تصحیح...... مرد عورت کی تخلیق کا سبب۔ ہوموہونے میں کیا حرج ہے۔ سکولوں میں جنسی تعلیم کیوں غیر ضروری ہے۔ سوال ہی سوال۔ الجھے جواب جو بچوں کی آزاد طبیعتیں نہیں مانتیں۔ قبول نہیں کرتیں۔ لیکن قطرہ قطرہ دریا مے شود۔ کچھ تو مسلمانوں کے بچے بھی سمجھیں گے۔ خدا اور رسول کے بارے

میں معلومات حاصل ہوں گے۔ بیچارے مسلمان۔ ان کا مذہب انہیں ماڈرن ہونے ہی نہیں دیتا۔ کیا کیا جائے۔

ٹرین لندن کے وسیع پھیلے ہوئے انٹرنیشنل شہر کی طرف بھاگی جا رہی ہے۔ بڑے بڑے شہر۔ دور دور تک آباد۔ سڑکوں کے دو رویہ کھڑی کاریں۔ بجلی کے بلند پول۔ ان پر کھنچی تاریں۔

برسٹل پارک وے ریلوے سٹیشن پیارا سا صاف ستھرا شہر۔ ٹرین میں سیٹوں کے مطابق لوگ ہیں لندن کی طرف آتے ہوئے بھیڑ زیادہ ہو گئی ہے۔ زندگی کا محور یہی شہر تو ہے۔ جس طرح بڑے شہر زندگی کی شاہ رگ ہوتے ہیں۔ ٹرین میں سوار ہونے والی لڑکیاں پھر سجی بنی طرح دار نظر آنے لگی ہیں۔ سفید بادلوں کے بلند پہاڑ لیکن سورج ابھی تک ان کے اوپر سے ہمیں دیکھتا ہوا چمک رہا ہے۔ سورج زندگی اور توانائی کا منبع زمین زیادہ جاندار اور جاگی جاگی لگ رہی ہے۔ تو ویلز کی سرسبز روشن وادی ہم سے بچھڑ گئی۔ سادہ پر کار لوگوں کی وادی ...... یہاں ایشیائی لوگ نہ ہونے کے برابر تھے۔ سیر کرنے کے لیے ہزاروں روپیہ چاہیے۔ اور یہاں لوگ روپیہ خرچ نہیں جمع کرنے کے لیے آتے ہیں۔ اتنی محنت سے کمایا ہوا روپیہ سیر پر کیونکر خرچ کیا جا سکتا ہے۔ آخر انہیں واپس بھی جانا ہے اور وطن میں تو صرف روپے والے کی عزت ہے۔ انہوں نے بہت کچھ جھیلا ہوتا ہے دن رات اپنے جسم کو اس کی طاقت سے زیادہ صرف کیا ہوتا ہے صرف ایک تمنا کے لیے ایک خوشی کے لیے کہ وہ بھی وہ یہ سب کچھ حاصل کر سکیں جو ان کے وطن میں ان کے لیے ناممکن تھا۔ وہ محنت کے چراغ سے الہ دین کے جن کو قابو کرنے کا گر سیکھنے کے لیے برسوں انتظار کے کرب میں گذار دیتے ہیں۔

میں بہت کچھ سمجھ سکتی ہوں۔ لیکن یہاں رہنے والوں کی ذات کے گورکھ دھندے کو

پوری طرح سمجھ نہیں پائی۔

ایک پونڈ = بتیس پاکستانی روپے۔

لیکن وہاں پر بتیس روپے کمانا آسان نہیں لیکن یہاں ایک پونڈ کمانا آسان ہے۔

سویڈن کا شہر آ گیا۔ ٹرین رک گئی۔ ٹرین میں بہت ہی محبت بھری آواز میں بتایا جاتا ہے کہ اگر آپ لنچ کھانا چاہتے ہوں تو ٹریان کے ساتھ بوفٹ کار ہے اس میں آپ کو چائے کافی اور کھانے کی چیزیں مل سکتی ہیں۔ اس کے بعد نہیں ملیں گی۔ وہ مسافروں کو سفر سے لطف اندوز ہونے کی دعا بھی دیتا ہے۔ خوشگوار احساس رگ وپے میں دوڑنے لگا ہے۔ ہمیں اہمیت دی جا رہی ہے۔ یہ کائنات انسان کے لیے ہی تو تخلیق کی گئی تھی۔ سب انسانوں کے لیے۔ ابھی تک کسی ایک نفس نے بھی ہمیں تکلیف پہنچانے لوٹنے یا ہراساں کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہاں کوئی اونچی آواز بھی نہیں نکالتا۔ مبادا آپ کو برا لگے۔ یہ ساری ہدایات تو ہمارا ورثہ ہیں۔ لیکن اب میں ماضی کے بارے میں سوچ کر خوش ہونے کی کوشش کر رہی ہوں۔ ہم مسمانوں نے بہت کچھ دیتا کو دیا۔ شاید ہماری روایات اپنے دائرے کا چکر پورا کر چکی ہیں۔ اور اب وقت کا پہیہ تیزی سے نیچے کی طرف گھوم رہا ہے۔ میں مایوس نہیں ہوں۔ لیکن ناخوشی کا احساس گلے کو کڑوا کر دیتا ہے۔ کبھی تو تاریخ کی کتاب میں وہ ورق لکھا جائے گا جب دوسری قومیں ہماری طرف تحسین بھری نظروں سے دیکھیں گی۔ میں نہیں ہوں گی۔ لیکن میرے بچے یا ان کے بچے تو ہوں گے۔ نسل انسانی خواب دیکھتی رہے گی۔ اور خواب کی تعبیر کے لیے کوئی نہ کوئی ضرور کوشش کرتا رہے گا۔ اور پھر......

میرے بچے کہتے ہیں امی آپ جذباتی ہو جاتی ہیں۔ میں ان کو کہتی ہوں میرے بھی اپنے تصورات ہیں۔ ان تصورات سے میرا گہرا لگاؤ ہے اور محبت کرنے والے دل جلدی

مجروح بھی ہوتے ہیں۔میرے اندر خوابوں میں رنگ بھرنے کی بصیرت اور طاقت نہیں۔صرف الفاظ ہیں لیکن الفاظ بھی بغیر سچائیوں کے بے رنگ اور بے بو ہوتے ہیں۔

پرانی سیاہ چھتوں والے قصبے پیچھے چھوٹ گئے ہیں۔ٹرین کا پہیہ گھوم رہا ہے۔وقت کا پہیہ گھوم رہا ہے لاتعداد کاریں ٹرین لائن کے اطراف میں پارکنگ جگہوں میں کھڑی ہیں بڑے بڑے دھانوں والی چمنیاں منہ کھولے سفید دھواں اگل رہی ہیں۔

میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے چند جوان لڑکے عریاں پستانوں اور چھوٹی چھوٹی بکنی پہنے عریاں عورتوں کی تصویروں والے رسالے دیکھ دیکھ کر اب آنکھیں بند کئے اونگھ رہے ہیں۔ان کے سامنے کی سیٹ پر بیٹھا ایک سنجیداور خوبصورت مرانہ چہرے والا لڑکا اپنے سامنے کی میز پر فائلوں کا انبار کھولے مسلسل کچھ لکھ رہا۔پڑھائی میں مصروف ہے۔اس کے چہرے پر لاپرواہی کی کوئی رمق نہیں۔اور وہ سامنے بیٹھے لڑکوں کی طرف آنکھ بھی نہیں اٹھاتا......اس کے بال ڈھنگ کے کٹے ہوئے ہیں۔میں نے لندن میں رنگین بالوں اور عجیب وغریب لباس پہنے پنک لڑکوں اور عریانی کی حد تک جسم کو اجاگر کرنے والے سیاہ لباس میں ملبوس لڑکیوں کو دیکھا ہے ان کے چہرے گہرے میک اپ تلے چھپے ہوتے ہیں۔وہ بڑے بڑے منکوں کی کئی کئی مالائیں پہنے انڈر گراؤنڈ ریلوے کسی لفٹ میں یا کنز نگٹن کے پوش علاقے میں گروہ کی صورت میں پھر رہے ہوتے ہیں۔عام انگریز ان کو دیکھ کر ایک طرف ہٹ کر چلنے لگتے ہیں۔ان کے چہرے سرخ سیاہ یا تیز عنابی رنگوں والے میک اپ اور آنکھوں کے گرد تیز چیختے رنگوں سے رنگے ہوتے ہیں۔انہیں دیکھ کر مجھے اکثر لگتا ہے کہ وہ ابھی مانس گند مانس گند کہتے ہوئے اپنے رنگین لمبے لمبے ناخن کسی نا کسی کے نرخرے میں گڑ کر خون پینا شروع کر دیں گے"۔لیکن وہ بھی دوسرے لوگوں کی طرح آپس میں مگن کھڑے رہتے ہیں۔ہاں ان کی موجودگی فضا کو ایک دم

کچھ خاموش بنا ڈالتی ہے۔اور جاتے ہوئے لوگ خوف زدہ ہو کر ایک طرف ہٹ جاتے ہیں۔میں بھی خوف زدہ ہو جاتی ہوں۔اس لیے دور کھڑی آنکھیں جھکا لیتی ہوں۔

ٹرین چلنے کی آواز آ رہی ہے۔پٹری اور پہیوں کی رفاقت ٹرین کو چلنے میں مدد دے رہی ہے...... ریڈنگ کا سٹیشن آ گیا۔مسافر تعداد میں زیادہ نظر آ رہے ہیں۔عمارتیں بلند ہوتی جا رہی ہیں۔گاڑیوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی ہے۔یہاں گھروں میں گیراج نہیں ہوتے۔سب گاڑیاں لائن میں بڑی ترتیب سے کھڑی ہیں۔سب بڑے شہروں کا یہی چلن ہے۔ریلوے لائن کے دونوں اطراف بڑی بڑی کرینیں اور وسیع شیڈ ہیں۔تفریح گاہوں کے بورڈ نظر آ رہے ہیں۔

سیٹرن کا شہر پیچھے چھوٹ گیا۔حالانکہ وہاں بھی گاڑیوں موٹروں کی تعداد گنی نہیں جا سکتی۔لوہے کے بلند گارڈ روں والے پل گذرتے جا رہے ہیں......صنعت و حرفت کا مرکز۔بلند عمارتیں اور دھواں اگلتی چمنیوں کی تعداد زیادہ ہو گئی ہے۔انسان کو وسیع چراگاہوں اور سرسبز وادیوں سے نکال کر فلیٹس کی بلند اور تنگ دنیا میں قید کر دیا گیا ہے۔یہاں انسان پاس آ کر دور ہٹ گیا ہے۔وہ بھاگ رہا ہے وہ دولت کما تا ہے۔وہ ہیلو اور تھینک یو جیسے بے ضرر الفاظ بھی استعمال کرنا ضروری نہیں سمجھتا۔ہر ایک نے روپے کی دیوار میں اپنے آپ کو بند کر لیا ہے۔میرا دم گھٹتا ہے یہ زندہ انسانوں کی دنیا نہیں۔ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں سانجھ کی دنیا نہیں پھر بھی ہمارے جوان اس کی خوابوں کی دنیا سمجھ کر دوڑے چلے آتے ہیں۔سفید رنگ ایک امنگ اور جذبہ ہے۔جس تک پہنچنا ضروری ہے۔شراب کی فراوانی ایک آزادی ہے۔اور پھر پاکستانی مرد شراب اور ایک عدد گرل فرینڈ کے جادو کے اسیر وطن کو برا کہتے اور سارے نظام کو گالیاں دیتے ہیں۔وہ دو تین بیڈ رومز کا گھر خرید کر ہمیشہ کے لیے انگریز کے ذہنی غلام بن جاتے

ہیں۔انڈر گراؤنڈ ریلوے کی کئی کئی منزلہ گہری کھائیوں میں بھٹکتے رہتے ہیں......دوڑو......
دوڑو......نہیں تو وقت سے پیچھے رہ جاؤ گے۔بھوکے رہ جاؤ گے پونڈ تمہاری بند مٹھی سے پھسل
رجائے گا......پھر کیا ہو گا......شراب نہیں ملے گی......گرل فرینڈ رروٹھ جائے گی اور زندگی بے
مزہ ہو جائے گی......

کنوائے کے قصبے سے ایک دن ہم لینڈ وڈنوں کے شہر کی سیر کو گئے تھے۔اتوار کا دن
تھا۔چند دکانیں کھلی تھیں جن میں کلیرنس سیل لگی ہوئی تھی۔چند لوگ خریداری کر رہے تھے۔ہم
نے بھی چند چیزیں خریدیں اور پھر خاموش شہر میں پھرتے رہے۔لگتا تھا جیسے کائنات سکون سے
آنکھیں بند کئے استراحت فرما رہی ہے۔ذہنی فکر اس شہر کے دروازوں سے دور رہی رہ گیا
ہو......خزاں خاموش سڑکوں پر زرد پتوں کی مالا پہنے رقصاں تھی۔ایلس ان ونڈر لینڈ نامی دکان
کے اندر دکاندار نے دکان کے پچھلے حصے میں جانوروں اور روشنیوں کے ذریعے ونڈر لینڈ بنایا
ہوا تھا۔ہر چیز کے لیے آپ کو اپنی جیب پر خود ہی ڈاکہ ڈالنا پڑتا ہے۔اور وہ بھی آپ کے شوہر کا
دیانتدار اور محنت سے کمایا ہوا روپیہ۔میرا جی چاہتا ہے کہ ڈھیروں چیزیں خرید لوں۔خوبصورت
پینٹنگ دلکش گلدان جاذب نظر سویٹر۔اور بھی نہ جانے کیا کیا۔اتنا روپیہ کہاں سے لاؤں۔پنسل
پچیس روپے کی۔اور جراب کی جوڑی سو روپیہ کی ہے۔ہم جو اپنے وطن کی شکایتیں ہی شکایتیں
کرتے رہتے ہیں۔یہاں آ کر وطن کی قدر آ رہی ہے۔

پھر ویران سٹیشن پر ٹرین کا انتظار کرتے ہوئے میں نے اپنے وطن کے یے دعا کی
تھی......وہ وطن جو میرے ماں باپ کا ہے جو میرا ہے میرے بچوں کا ہے۔

حضرات لندن آ گیا۔ارے یہ لندن تو نہیں۔یہاں تو پیڈنگٹن لکھا ہوا ہے ارے میں
بھی کتنی بے خبر ہوں۔یہ لندن کا ایک جنکشن ہے۔میں جو ویلز جاتے ہوئے سرسبز وادیوں سے

گذری تھی اصل لندن سے آشنا نہیں ہوئی تھی۔ بلند عمارتوں کے سائے تلے چلتا ہوا انسان
بہت چھوٹا لگتا ہے خوبصورت طریقے سے سجائی گئی دکانیں جن کی سجاوٹ کا انداز ہر اتوار کو تبدیل
کیا جاتا ہے۔ بڑے بڑے ملٹی پرپز سٹور لیکن میں ان بلند عمارتوں خاموش بستیوں اور تاریک
راہداریوں میں گم ہونا نہیں چاہتی۔ روشن لان چمکتا سورج پھولوں کی خوبصورتی یہ صرف آپ کی
زندگی میں ہفتہ کے ایک دن کے لیے آسکتے ہیں۔ اس صورت میں جب آپ پونڈ خرچ کر کے
شہر سے دور نکل جائیں۔ تب آپ کا اپنا آپ بڑا ہو جائے گا۔ آپ خود کو بھی نظر آنے لگیں
گے...... اسی لیے تو آدھا لندن چھٹی کے دنوں میں باہر کو امنڈ پڑتا ہے۔ بسیں بھر جاتی
ہیں۔ ٹرینیں مسافروں کے بوجھ تلے ہانپنے لگتی ہیں اور تھکاوٹ بھرا ست سمندر چونچال ہو جاتا
ہے۔ لیکن لندن سے بھاگنا ممکن نہیں۔ یہ شہر تو صنعتی لحاظ سے بھی دنیا کو کنٹرول کرتا ہے۔ اس کی
مصنوعات کے ہم شائق ہیں۔ لوگ بھاگتے ہیں۔ ٹرینیں بھاگتی ہیں۔ اور تیز چلنے لوگوں کے
ساتھ قدم ملانے میں مجھے بھاگنا پڑتا ہے۔ مجھے چلتے ایکسکلیٹر کی سیڑھیوں پر ڈھنگ سے قدم
جمانے ہیں۔ آج میں وکٹوریہ سٹیشن پر جا کر بچوں سے بات کروں گی۔ میں شروع دنوں میں
بھاگ دوڑ سے تھک جاتی تھی اور گھر والوں کو خط نہیں لکھ سکتی تھی لیکن اب میں کوشش کرتی ہوں
کہ ہر رات ایک کارڈ لکھ رکھوں اور صبح اس پر ستائیس پنی کی ٹکٹ چسپاں کر کے ڈاک کے سپرد کر
دوں۔ میں بہت سی باتیں سیکھنا چاہتی ہوں یہ کہ کون سے سٹیشن پر اتر کر کتنی منزلیں نیچے یا کتنی
منزلیں نیچے یا کتنی اوپر جا کر کون سی ٹرین میں سوار ہونا ہے۔ میں ایک بے خبر بچے کی طرح عاشی
کے پیچھے چلتی رہتی ہوں اور وہ مجھے اپنی پسند کی جگہوں پر لے جاتی ہے۔ میں احتجاج بھی نہیں کرتی
کیونکہ میں راستوں سے ناواقف ہوں۔ مجھے اسی کی بتائی ہوئی راہ پر جانا ہے لیکن اب میں ٹرین
کے کمپارٹمنٹ میں دیوار پر بنے نقشے سے گذرتے سٹاپس کو گنتی رہتی ہوں۔ ہاں اب میں سنٹرل

لائن پر جاتی گاڑی میں سوار ہوں۔ سنٹرل لائن جو نیلے رنگ سے واضح کی گئی ہے جہاں جہاں یہ لائن کھچی ہوئی ہے وہاں وہاں سنٹرل لائن کی ٹرین جاتی ہے۔ نیلی لائن ہلکی نیلی لائن سرمئی لائن۔ لندن کا سرا شہر نیچے سے بڑی بڑی سرنگوں میں گھرا ہوا ہے یہاں دو تین پلیٹ فارم اوپر نیچے بنائے گئے ہیں۔ یہاں روشنیاں ہیں۔ راستے ہیں۔ تیز ہوائیں ہیں...... اپنے راستے پر جانے والی ٹرین کا انتظار کرتے لمبے لمبے ویران سٹیشن خوف زدہ کرتے ہیں لیکن سنہری بالوں اور خوبصورت چہروں والی دوشیزائیں (توجہ طلب لفظ ہے) کندھوں پر سامان رکھے اونچی ایڑیوں سے کھٹ کھٹ کی آواز پیدا کرتیں راستوں میں غائب ہو جاتی ہیں۔ غیر ملکی لوگ ہاتھوں میں انڈر گراؤنڈ ریلوے کا نقشہ پکڑے بڑے دیواری نقشوں سے راہیں تلاش کرتے مل جائے گا۔ چینی جاپانی ہندوستانی پاکستانی ہر ملک کا چہرہ آپ کو اپنے پاس کسی نہ کسی گاڑی کا انتظار کرتے مل جائے گا۔ مائیں بچوں کی پراموں کو سیڑھیوں پر سے لاتی لے جاتی نظر آتی ہیں۔ ٹرین آنے پر بچے کو کندھے سے لگائے پرام کو سمیٹ کر ڈبے میں رکھتے وہ سوار ہو جاتی ہیں۔ میں بہت دنوں بعد مانوس ہو رہی ہوں۔ ہاں مجھے ادھر ہی تو جانا ہے۔ انہیں سیڑھیوں پر ہی تو کھڑا ہونا ہے۔

گاڑی فاصلوں کو بانٹنے کے لیے ہی تو بنی ہے۔ گاڑی ایک سٹیشن پر رک گئی ہے۔ خود کار دروازے سوں سوں کی آواز پیدا کر کے کھل رہے ہیں۔ صرف ایک منٹ...... دروازہ پھر بند ہو جائے گا۔ آپ اپنی منزل سے بچھڑ جائیں گے۔ صرف ایک قدم اور زندگی میں بھی تو انسان اس ایک صحیح قدم کو اٹھانے میں دیر لگا دے تو منزلیں بچھڑ جاتی ہیں۔ راہیں کھوٹی ہو جاتی ہیں اور آپ کے بھٹکنے میں کوئی شک نہیں رہتا...... تعلیم کی منزل اقتصادیات کی منزل روحانی منزل یہ ایک قدم کتنا اہم ہے۔ قوموں کی زندگی میں ایک شخص کی اپنی زندگی میں فیصلے کا وہ لمحہ کتنا

ضرور ہے۔آپ کی عقل کتنی اہم ہے۔

اب میں تھوڑی دیر کے انتظار کے بعد بس میں بیٹھ گئی ہوں۔ایک اور سفر کے لیے تیار ......سٹیشن کے باہر پھول والے کا سٹال تھا جہاں لوگ اپنے ملنے والوں محبوباؤں بچھڑوں کو منانے کے لیے پھول خرید رہے تھے۔......پھول صلح آشتی مزاج پرسی محبت اور چاہت کی نشانی کے طور پر خریدے جاتے ہیں۔اف کولن ڈیل کا علاقہ کتنی دور ہے بس بڑے بڑے بازاروں میں سے گذر رہی ہے اور فاصلہ کم نہیں ہوتا۔آپی جمیلہ ہاشمی کی دوست امیر زہرہ کا گھر اس علاقے میں ہے۔ولز جانے سے پہلے ہم کچھ سمان ان کے گھر رکھ گئے تھے۔اب اسی سامان کو لینے اور ان سے ملنے جا رہے ہیں۔فاصلہ بہت ہی زیادہ لگ رہا ہے۔بارش دھند کی صورت میں سڑکوں بازاروں میں اتر رہی ہے۔ہمیں ایج ویئر روڈ پر چرچ سٹریٹ کے بازار میں گھومتے دیر ہوگئی تھی۔میرے پاس پونڈ کی شکل میں روپے ختم ہو چکے تھے۔اور روپوں کے بغیر بازار میں آنا ایسی ہی کہاوت ہے کہ "پلے نہ دھیلا اور کردی میلہ میلہ" یہاں سڑک کے دونوں طرف انگریز عورتوں مردوں نے مختلف اشیاء کے سٹال لگا رکھے ہیں بالکل اسلام آباد میں جمعہ بازار یا منگل بازار کی طرح۔سیاہ فام لوگ سفید فام لوگ بوڑھی عورتیں نوخیز لڑکیاں شلوار قمیض پہنے مسلمان اور ہندو عورتیں سرخ ہونٹ کیے مینڈ گوندھے سیاہ فام حسینائیں مصروف خواتین سروں پر رومال باندھے اور لمبے لمبے سایوں میں ملبوس و مستور ایرانی عورتیں جاپانی گڑیوں جیسی لڑکیاں اور اس ہجوم میں میں بھی شامل ہوں۔میں خریداری سے زیادہ اس بازار کو دیکھنے آئی تھی۔قیمتوں میں زیادہ فرق نہیں۔یہاں پر تو معمولی کپڑے کی قیمت بھی معمولی نہیں۔تین ساڑھے تین سو میں معمولی سویٹر آتا ہے۔لیکن ساری دنیا کی عورتوں کی طرح یہاں بھی بھیڑ زیادہ ہے۔عورتیں خریداری کر رہی ہیں دکاندار آوازیں لگا رہے ہیں۔معمولی سا بٹوہ جو

پاکستان میں زیادہ سے زیادہ پانچ روپے میں آئے یہاں بتیس روپے سے کم نہیں آتا۔ یہاں ایک پونڈ کی قیمت ایک روپیہ کے برابر بھی ہے لیکن میں نے اس کے یہ بتیس پاکستانی روپے ادا کیے ہیں۔ میں نے بچوں کی پسند کی چیزیں خریدی ہیں۔

اے میرے قاری پونڈ کو پاکستانی روپے میں ضرب دینے سے جتنا مزہ میرا کرکرا ہوتا تھا۔ یقیناً آپ کو بھی ہوگا۔ اور آپ کہیں گے کہ بھئی عجب کنجوس خاتون کا سفرنامہ پڑھ رہے ہیں۔ لیکن میں یہ اطلاع ان لوگوں کو دے رہی ہوں جو لندن کے خواب دیکھتے رہتے ہیں۔ اور بے خبری میں مارے جاتے ہیں۔ میں ان سچائیوں کا ذکر کرنا چاہتی ہوں جو میں نے کبھی کسی سفرنامہ میں نہیں پڑھیں۔ میں نے تو یہ بھی نہیں پڑھا تھا کہ یہاں بھی لوگ روایات کی پاسداری کرتے ہیں۔

بارش برس رہی ہے اور ہم مکانوں کے سامنے بنے فٹ پاتھ پر چلتے جا رہے ہیں۔ ہمیں تیسرے بلاک کے مکان نمبر ۲ اسی میں جانا ہے۔ اور میری چھتری بار بار تیز ہوا میں الٹ رہی ہے اور میں بھیگ رہی ہوں۔ لیکن ایسا مزہ زندگی میں پہلے کبھی نہیں آیا تھا کہ آپ کی حال تیر ہنسنے والا کوئی نہیں اور آپ جس طرح مرضی چلیں آپ کو سنسان سڑکوں پر کوئی نہیں دیکھے گا۔ یہ نہیں کہے گا عمر تو دیکھو اور صاحبہ ہیں کہ بارش میں گھومتی خوش ہو رہی ہیں۔

۲ اسی نمبر کا گھر آ گیا۔ میں نے خالی کوک کا ٹن سامنے درخت کے تنے کے پاس رکھ دیا...... میں یقیناً ایک بھیگی ہوئی مرغی کی مانند لگ رہی ہوں گی...... اپنی مرضی اور خواہش کے بالکل الٹ حالت میں...... اوہ امیر زہرہ کی ساس ہندوستان میں انتقال کر چکی ہیں ان کی کامیاں اور وہ ڈرائنگ روم میں چادر بچھائے غمزدہ روتی سرخ آنکھوں کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ لیکن وہ پھر بھی ہماری خاطر داری کر رہی ہیں۔ پرانی روایات کو خوشبو۔ وہ ان کے یے

دکھ کی رات تھی۔ پریانی کی رات تھی کیونکہ لکھنو کی لائن پچھلے اڑتالیس گھنٹوں سے نہیں مل رہی تھی۔ ہر لمحہ انتظار کر کے کرب میں گذر رہا تھا۔

ان کی چھوٹی بیٹی اپنے ابو سے باتیں کئے جا رہی ہے۔ ابو وہاں پر تین خواہشیں پوری ہوتی ہیں۔ میں وش کروں گی کہ ایک وش میں سو ویشنز پوری ہو جائیں اور دوسری وش میں بھی سو اور تیسری وش میں بھی۔ اس طرح میری تین سو خواہشیں پوری ہو جائیں گی۔ میں ملکہ بننا چاہتی ہوں۔ وہ مسکرا رہی ہے۔ باتیں کئے جا رہی ہے۔ اسے اس بات کا ادراک نہیں کہ اس کا باپ اپنی ماں کے نہ ہونے سے غم زدہ ہے۔ اسے صرف زندگی کا خوبصورت چہرہ نظر آ رہا ہے۔ اور وہ اسی کی طرف دیکھ رہی ہے۔ اسے اپنا الگ ٹیلی ویژن چاہیے الگ کمرہ چاہیے وہ اپنی الگ پہچان سے ابھی سے آگاہ ہے ایک مکمل انسان......

اور یہ آگہی قوموں میں غلامی سے نفرت اور آزادی سے محبت بن کر پھوٹتی ہے غلام بغاوت کرتے مظلوم ظالم سے ٹکرا جاتے ہیں۔ زنجیریں ٹوٹتی تلواریں چلتی خون بہتا اور آزادی کی صبح طلوع ہوتی ہے......انہوں نے اصرار کر کے ہمیں ٹھہرا لیا ہے۔ صوفہ کم بیڈ پر نرم کمبلوں میں رات گذارتے ہوئے مجھے کئی راتوں کے بعد گہری نیند آئی ہے۔ حفاظت کا احساس ہوا ہے۔

میں نے سونے سے پہلے رات کو جھانکا ہے وہ گیلی زلفیں پھیلائے سرمئی لبادہ اوڑھے آسمان کے بیچوں بیچ کھڑی ہے۔ لیکن میں مطمئن ہوں۔ لیکن ایک رات کمروں کے اندر ہیٹر کی گرمی سے آسودہ اونگھ رہی ہے۔

ناشتہ کرنے کے بعد ہم سامان کو اٹھائے لئیق صاحب یعنی بہن امیر زہرہ کے میاں کے ساتھ ان کی گاڑی میں بیٹھے انڈر گراؤنڈ ریلوے سٹیشن کی نیچے جاتی سیڑھیوں کے پاس اتر گئے

ہیں......وہی ٹرین وہی سفر ویسے ہی طریقہ سے اترتے چڑھتے لوگ......اس ساری زندگی میں
بھلا کیا خوبصورتی اور طمانیت ہے......اور......خدا کا شکر ہے میں ہالینڈ پارک اپنے کمرے میں
پہنچ چکی ہوں۔لیکن میں کمرے میں بیٹھنے کے لیے نہیں آئی کوئی اور منزل کوئی اور نظارہ فطرت کا
کوئی نیا جلوہ......دید کی کوئی نئی جہت مجھے ساؤتھ ہال بھی دیکھنا ہے جسے لندن کا امرتسر کہا جاتا
ہے۔یعنی سکھ برادری......میں پھر سیڑھیاں اور ٹرینیں اترتی چڑھتی ساؤتھ ہال کے بازار میں
کھڑی ہوں۔بازار کھلا ہے سکھ عورتیں مرد پگڑیاں مونچھیں شلوار قمیض جھلملاتے لباس شاید انہیں
کسی شادی میں جانا......نہیں یہ لوگ ہمیشہ زندگی کی خوشیوں کو سمیٹنے کے لیے خوش لباسی کو اولیت
دیتے ہیں۔چمکیلے کپڑے......میک اپ شدہ چہرے جسمانی آگہی کا اظہار کرتی جوان لڑکیاں
اور سب سے اہم انگریزی بولنے کا انگریزوں جیسا لہجہ پردیس میں رہنے کی قیمت وصول ہو
گئی......لیکن میں نے اکثر بوڑھے سکھ مردوں کے چہروں پر اداسی دیکھی ہے۔شاید ان کے
بیٹے اپنی انگریز گرل فرینڈ کے ساتھ رہتے اور انہیں اپنے فائدے کے لیے استعمال کرتے
ہیں۔واپس وہ کس کے پاس جائیں گے۔بیٹے بڑھاپے کا سہارا ہوتے ہیں اور وہ تو یہاں پر
ہیں۔کون ان کی دیکھ بھال کرے گا......زندگی کا جبر کتنا زبردست ہے......سانس کے تار
توڑنے کو کسی کا دل نہیں چاہتا دکانیں ہندو ماڈلز سے بھری پڑی ہیں......ساڑھیاں......کپڑے
......فٹ پاتھ پر رکھے میزوں پر پڑے سویٹر......یہاں قیمتیں اور بھی زیادہ ہیں اپنے بے وطن
ہونے کا ٹیکس بوڑھی عورتیں سروں پر رومال باندھے ساڑھی پہنے سبزی اور پھل کی خریداری کر
رہی ہیں۔دکاندار بھی اکثر ہندو یا سکھ ہی ہیں۔میں نے پہلی بار یہاں ہارون کی آواز سنی اور ان
کا استعمال دیکھا ہے۔گاڑیوں کی لمبی قطاریں۔اندر بیٹھی ایشیائی عورتیں کھلے بال میں نے
یہاں ایشیائی کو اپنے ہی ڈھنگ سے یورپی لباس پہنے دیکھا ہے جوان پر بالکل نہیں سجتا۔لیکن

یہ لباس یہاں کی ضرورت اور مجبوری ہے اور پھر مالی طور پر بھی سستا رہتا ہے۔صرف ایک سکرٹ...... ہر لباس شلوار اور دوپٹے کی قید سے آزاد ہو کر ارزاں ہو گیا ہے......واہ بھئی ......واہ......لیکن یہاں کے باتھ روم گندے صابن غائب......اور کوڑے کے کھلے ڈھیر ہیں...... بیچارے ایشیائی وطن میں سر بلند ہونے کے لیے کیسے کیسے جان کو جوکھوں میں ڈالتے ہیں۔

اسی علاقے میں کہیں ڈاکٹر پروین شاہ بھی تو رہی ہیں وہ سرائیکی زبان بولنے والی خاتون ہیں۔اور اکثر ایک برس کے آٹھ ماہ اپنے آبائی شہر میں بسر کرتی ہیں۔وہ باقی مہینے یہاں رہ کر ڈیمانڈ جاب کرتی اور دگنی دولت کماتی ہیں۔

ہم ڈاکٹر پروین کے دروازے کو کھٹکھٹا رہے ہیں اوہ وہ عاشی سے سرائیکی میں باتیں کر رہی ہے۔اس نے بتایا ہے کہ یہاں رہنا بڑا آسان ہے۔یہاں کوئی یہ جاننے کی کوشش نہیں کرتا کہ آپ کون ہیں اور کیوں ہیں۔لیکن وطن میں اف خدایا وہاں رہنا ناممکن ہے ہر کوئی آپ کے بارے میں ٹوہ میں لگا رہتا ہے۔اس لیے میں گھبرا کر یہاں چلی آتی ہوں۔وہاں تو ہر عورت میرے بارے میں قصے گھڑنے میں مصروف رہتی ہے۔میں نے شادی کیوں نہیں کی۔کیا بات تھی کیا وہ اب میرے لیے کوئی مرد ڈھونڈے......اور سچ بات تو یہ ہے کہ آج تک کوئی مرد میرے سٹینڈرڈ پر پورا ہی نہیں اترا۔جن کے بارے میں میں نے خواب دیکھنے سیکھے ہیں۔کم از کم پاکستان کی سرزمین پر تو کوئی نہیں تنگ دل ذلیل مرد“...... ہاں پروین شاہ ایسے خواب دیکھ سکتی تھی اور ابھی بھی وہ اپنے خوابوں کی زندگی میں بس رہی ہے......وقت تو کسی کو بھی نہیں بخشتا......اور پھر اپنی اپنی ترجیحات ہیں۔میں اسے دیکھتے ہوئے اس کے خلالات سن رہی ہوں۔ٹی وی چل رہا ہے۔ہوا چل رہی ہے۔شفاف آسمان پر سورج چل رہا ہے......لیکن ایک

لمحہ ایسا آئے گا جب بہت کچھ تھم جائے گا۔ پھر کیا ہو گا۔ پھر ہم نے مل کر کھانا گرم کیا اور کھایا ہے...... میں اپنی اکیلی میزبان کو تکلیف دینا نہیں چاہتی۔ میں نے اپنے حصے کے برتن دھو دیئے ہیں۔ اور پھر ہمارے ملکوں میں صدیوں پرانی زنجیر کو تھامے دوسروں کے گھر مہمان بنے رہنے کی روایت یہاں نہیں ہے...... ہلکا پھلکا خوشگوار احساس میرے ذہن پر چھا رہا ہے۔ یہاں مہمان آپ پر بوجھ نہیں بنتا۔ جس کے جانے پر خدا کا شکر کیا جائے۔

یہ روایات سے انحراف تو ہو سکتا ہے۔ لیکن ایک زبردست میزبانی کے بوجھ سے آزادی بھی تو ہے...... ٹیلی ویژن پر ڈیموکریٹ پارٹی کا کوئی ممبر تقریر کرتے ہوئے کہہ رہا ہے۔

"یہاں مارگریٹ تھیچر نے سگریٹ پر پابندی لگا کر زندگی کو ناخوشگوار بنا دیا ہے۔ لیکن ہم چاہتے ہیں کہ ہر کوئی ذاتی آزادی سے زندگی گذارے ہم جنسی کوئی گناہ نہیں۔ ہم جنس پرستوں کو بھی اپنی مرضی سے زندگی بسر کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ وہ ملک کی ترقی میں حصہ لیں کوئی غیر قانونی کام نہ کریں۔ یہی ان کی ذمہ داری ہے۔"

مقرر کے سامنے بیٹھے لوگ زور زور سے تالیاں بجا رہے ہیں۔ شاید وہ سگریٹ پر سخت پابندی کو ناپسند کرتے ہیں۔ دفاتر میں انڈر گراؤنڈ۔ بسوں میں سگریٹ پینا منع ہے۔ خلاف ورزی کرنے والے کو پچاس پونڈ جرمانہ ہوتا ہے۔ اور پچاس پونڈ کی رقم بہت زیادہ ہے جو کوئی بھی دینا افورڈ نہیں کر سکتا۔ میں نے یہاں بہت کم لوگوں کو سگریٹ نوشی کرتے دیکھا ہے۔ یہ لوگ صحت کے اصولوں کی پابندی کا برا نہیں مانتے۔ لیکن مارگریٹ تھیچر کے مخالف انہیں پابندیوں کو ہدف تنقید بنائے ہوئے ہیں۔ ہزاروں بے گھر اور بے روزگار لوگ وظائف پر گزارہ کرتے ہیں۔ زندگی کو آسانی سے بسر کرنے کے خواہشمند بیکار نوجوان اس وظیفے کو پانے کے لیے ایک، اس جگہ پر جا کر وقت گزارتے ہیں۔ انہیں سارا دن وہاں بیٹھنا پڑتا ہے۔ مارگریٹ

تھیچر کسی آوارہ گرد اور نکمے کو برداشت نہیں کرے گی۔ ایڈز کی بیماری سے ہوموز کو ناپسند کیا جا رہا ہے۔ لڑکے لڑکیاں شادی کرنے لگے ہیں۔ اور مخالف پارٹی انہی اصولوں کو آڑ بنا کر فائدہ اٹھانا چاہتی ہے...... آزادی...... مادر پدر آزادی...... ہر پردے سے آزادی...... جسم سے جسم پیستہ ہونٹ سے ہونٹ...... کتا بھی ویرانہ دیکھتا ہے لیکن یہاں کا انسان جانور کے سطح سے بھی گر چکا ہے۔

ہر ملک میں سیاسی ہتھکنڈے ایک ہی جیسے ہیں۔ ہوموز کو قانونی حیثیت حاصل ہونی چاہیے۔ نکمے بیکاری کا وظیفہ لے کر موج اڑائیں۔ سگریٹ قومی صحت کو تباہ کر دے۔ اور ایڈز کی بیماری بے شک انسانوں کو لقمۂ اجل بنائے...... لیکن جیت ہماری ہونی چاہیے...... چاہے کچھ بھی ہو۔

آزادی...... آزادی...... آزادی زندہ باد......

کھیل جاری ہے۔ لوگ دیکھ رہے ہیں تماش بین سراپا انتظار...... یہاں ساری پارٹیاں ٹیلی ویژن پر خریدے ہوئے وقت میں مختلف لوگوں کو رنگین خوابوں کے تانے بانے میں الجھانا چاہتی ہیں۔

اور ہمارے وطن میں بھی تو الیکشن ہونے والے ہیں۔ وہاں بھی تو نئے نئے خوابوں کے خوش رنگ جال بنے جا رہے ہوں گے۔ دشمنوں کو قتل کی دھمکیاں دی جائیں گی۔ مخالف کو لاکھوں کا لالچ دے کر خرید ا جائے گا۔ سینکڑوں بھولے لوگ جانیں گنوائیں گے اور باقی زندہ رہنے والے فتح کا جھنڈا اٹھائے گلیوں میں جلوس نکالیں گے۔ جیتے ہوئے امیدوار پر پھولوں کی بارش کریں گے اور ہارے ہوئے کے گھر کے سامنے سے گزرتے ہوئے قابل شرم الفاظ میں زخموں پر نمک پاشی کریں گے۔ جیت کا نشہ۔ سیاست بھی دکانداری ہے۔ جتنا گڑ اتنا

میٹھا۔طاقتور ہونا کتنی بڑی نعمت ہے۔

میں پاکستانی شہری ہونے کی وجہ سے ہمیشہ کی طرح صرف دعا کر سکتی ہوں۔اے خدا میرے وطن کو اپنی پناہ میں رکھ۔میری بھی تو کئی خواہشات ہیں۔کیا وہ میری سب باتیں سنے اور مانے گا۔میں تو اس سیاست کے دائرے میں کوئی مقام نہیں رکھتی۔میں تو شاید جھگڑے کے خوف سے ووٹ بھی نہ ڈالنے جاؤں۔لیکن مجھے جانا چاہیے ایک ایک ووٹ مل کر ہی تو سیاست کی عمارت کو استوار کرے گا۔اگر ایک بار ناکامی ہو تو دوسری بار تیسری بار۔یہ سلسلہ قائم رہنا چاہیے یہاں تک کہ جمہوریت کا اصل مفہوم ہمیں حاصل ہو جائے۔ہم بھی دنیا میں سر بلند کر کے چل سکیں۔اور دوسرے ملک ہماری طرف کبھی رحم اور کبھی غصے سے دیکھنا بند کر دیں۔

گاڑی تیزی سے اندھیری تنگ سرنگوں سے گذر رہی ہے۔میں سٹیشن گن رہی ہوں۔آج ہمیں انکل وانیا کا سٹیج ڈرامہ دیکھنا ہے۔ساڑھے بارہ پونڈ کی ٹکٹ میری جیب میں ہے۔اور ہمیں وہاں ساڑھے سات بجے تک ہر صورت میں پہنچنا ہے۔یہاں ٹرین لیٹ نہیں ہوتی لیکن ٹرین لیٹ ہے۔میں بار بار گھڑی کو دیکھ رہی ہوں۔آخر آ ہی گئی......ہم سٹیشن سے باہر آ کر تیز تیز قدموں سے تھیٹر کی طرف جا رہے ہیں ایسا نہ ہو ڈرامہ شروع ہو جائے پچھلی سیڑھیوں سے ہال میں داخل ہونا ہے او سیڑھیاں ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتیں۔میں تیز چڑھتے چڑھتے ہانپنے لگی ہوں۔میں ان چھوٹی سیڑھیوں میں رک بھی نہیں سکتی......آخر ہال آ ہی گیا......چھوٹا سا مستطیل ہال......مجھے گیلری میں جگہ ملی ہے۔زیادہ سیٹیں بھر چکی ہیں۔لوگ مدہم آوازوں میں باتیں کر رہے ہیں۔سامنے سٹیج کا پردہ گرا ہوا ہے۔تین چار منٹ کے بعد پردہ اٹھتا ہے۔اور پھر زندگی کے دکھوں سکھوں چھوٹی چھوٹی بے ضرر خواہشوں مستقبل کی امیدوں اور خود غرضیوں کا قصہ بیان کیا جا رہا ہے۔زندگی میں عام لوگوں کا المیہ بھی عام ہی ہوتا ہے۔یہ زندگی کی معمولی

خوشی کے لیے برسوں انظار کرتے ہیں۔اور پھر غلط وابستگیاں زندگی کو اور بھی ناقابل برداشت بنا دیتی ہیں۔لیکن زندہ تو پھر بھی رہنا پڑتا ہے۔کیونکہ زندگی بہر حال زندگی ہے اور انکل واینا کو اس کی بھانجی کہتی ہے۔

''انکل واینا ہم ایک روز زمین کے بطن میں آرام کریں گے ہمارے لیے آرام کا وقت ضرور آئے گا۔''اور انکل واینا جو اپنے بہنوئی کی نئی خوبصورت بیوی کے لیے اپنے دل میں نرم جذبات رکھتا تھا۔اسے ایک کنوارے ڈاکٹر کی الفت کا اسیر پا کر بھی کچھ نہیں کر پاتا۔اس کی زندگی کی آخری امید خوشی کا آخری لمحہ بھی دم توڑ دیتا ہے اور وہ آنسوؤں کو پونچھ کر اپنے بہنوئی کی جائیداد کا حساب کتاب کرنے میں پھر مصروف ہو جاتا ہے۔زندگی ایک مسلسل اور لگاتار اندھیرا ہے۔بغیر کسی خوشی اور مسرت کے......اور انکل واینا کی بھتیجی جس کی گھر داری میں مصروف زندگی کی رہائی کی آخری کرن ڈاکٹر کی موجودگی ہوتی ہے......وہ بھی اپنے آنسو پونچ کر اسی ٹیبل پر انکل واینا کے ساتھ بیٹھ کر روزمرہ کے کام میں مصروف ہو جاتی ہے۔

یہ عام انسان کی خوشی اور غمی کی کہانی ہے۔لوگ تالیاں بجا رہے ہیں۔ایک مسلسل تال......پردہ گرتا ہے پھر اٹھتا ہے سارے کردار ناظرین کے سامنے جھکتے ہیں پردہ گرتا ہے اور اب دوبارہ اٹھنے پر دونوں طرف سے ایک ایک کردار بھاگتا ہوا آ کر ناظرین کے سامنے دوبارہ جھکتا ہے۔تالیوں کی مسلسل تال گونج رہی ہے۔خوبصورت ہیروئن خوبصورت مردانہ وجاہت کا حامل ڈاکٹر انکل واینا۔اور انکل کی بھتیجی اور دوسرے کردار۔ان کے چہرے تمتما رہے ہیں۔

ڈرامہ نہ جانے کتنے مہینوں سے ہر رات سٹیج کیا جا رہا ہے۔ہر روز تالیاں بجتی ہوں گی۔اور یوں فن اور فنکار کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے ہوگی۔

ہمیں واپس جانا ہے۔سوا دس بج چکے ہیں۔سوا دس بہت دیر ہو گئی کیا ہوگا فکر نہ کریں

کچھ بھی نہیں ہو گا بہت سے لوگ انڈر گراؤنڈ ریلوے سٹیشن کی طرف چل رہےہیں میں بھی ان کے ساتھ ساتھ ہوں زیر زمین پلیٹ فارم پر ایک ادھیڑ عمر موسیقار شہنائی پر نئی اور خوبصورت دھنیں نکال رہا ہے۔لوگ ہاتھ میں پکڑے سکے اس کے سامنے اچھال دیتے ہیں انہیں سروں سے لطف اندوز ہونے کی فرصت نہیں۔ فاصلے لمبے اور ٹرین آخری ہے وہ رک نہیں سکتے ہماری ٹرین ابھی نہیں آئی۔ میں سکون کے ساتھ خاموشی سے لگی اس کی ہر بار بدلتی دھن کو سن رہی ہوں۔شاید کسی دن کسی فلم کا کوئی مشہور موسیقار یہاں کی رہداریوں سے گذرے۔شاید اس کی قسمت بدل جائے۔لیکن مشہور موسیقار بڑی بڑی موٹروں می سوار سڑکوں پر سے گذر جاتے ہیں۔اور انسان کی قسمت تاریکی میں بھٹکتی رہتی ہے اور سر اندھیری غاروں میں اتر جاتے ہیں اور سامنے پڑے سکے اتنے نہیں کہ ان کو گنتے ہوئے کوئی خوبصورت تصویر باندھا جا سکے۔

چھوٹے لوگوں کا چھوٹا المیہ چھوٹی خواہشیں چھوٹی خوشیاں یہ کردار بھی تو انکل وانیا کے ڈرامے کا ہی ہے ہاں یہ بھی ایک روز زمین کے بطن میں آرام کرے گا اس کے لیے بھی آرام کا وقت آئے گا......لیکن یہ چھوٹی خوشیاں اور چھوٹے المیئے ان کی زندگیوں کو بدلنے کی طاقت رکھتے ہیں شہنائی کے سر بھٹک رہے ہیں میں ٹرین کے خودکار بند ہوتے دروازوں میں سے اس کے آخری سروں کو سن رہی ہوں ٹرین چلی جا رہی ہے میرا خوف دور ہو گیا ہے یہاں کچھ نہیں ہوتا فکر کی کوئی بات نہیں۔سرد ویران راہداریوں میں گونج رہے ہوں گے۔فکر کی کوئی بات نہیں......رات سرد اور ویران ہے۔فکر کی کوئی بات نہیں۔

کمرے میں آ کر میں نے گرم گرم چائے پی ہے۔میں نے پچھلے کئی دنوں سے پاکستانی کھانا نہیں کھایا بیف برگر چکن برگر سوپ کافی میٹھا بن۔کوک اور چند بار کون آئس کریم۔میں مکمل ٹورسٹ بن کر زندگی کا لطف لے رہی ہوں۔حالانکہ تھکنے پر مجھے اپنے آپ پر غصہ بھی

آتا ہے میرا چہرہ تھکاوٹ کے مارے مرجھا جاتا ہے میری پنڈلیاں دکھنے لگتی ہیں میں ہر رات اپنے ساتھ لائی پونستان کی دو گولیاں ضرور کھا لیتی ہوں میں یہاں آ کر بیمار ہونا نہیں چاہتی ۔میں نے اپنی دوست جہاں آرا سے پوچھا تو جواب ملا تھا کہ ''آپ ضرور جائیں وہاں جا کر آپ خود بخود ٹھیک ہو جائیں گی۔ وہاں آپ کو بہت پھرنا پڑے گا۔ آپ ضرور جائیں آپ بالکل تندرست ہیں گھبرائیں نہیں۔'' اور میں اس بات کو سچ مان کر لندن آنے کے لیے تیار ہو گئی تھی...... شروع دنوں میں میرا جسم چلتے رہنے کی مشقت کا عادی نہیں تھا۔ اس لیے پتھر کی طرح بوجھل ہو گیا تھا۔ اور مسلسل چلنے سے گھٹنے درد کرنے لگے تھے۔ لیکن پھر میری ٹانگیں ساری مشقت کی عادی ہو گئیں۔ اور اب میں گھنٹوں چل سکتی ہوں۔ یہاں گھر جیسی ایک بھی سہولت میسر نہیں۔ ٹیکسی پر چڑھنے کے لیے بہت امیر بڑا تاجر یا بڑا زمیندار ہونا ضروری ہے۔ اتنی دولت نہ ہونے کی وجہ سے لندن کو دیکھنا ناممکن ہو جائے یہاں پر میرے زیادہ دوست اور ملنے والے بھی تو نہیں جو میں آ کر مجھے اپنی گاڑی میں لیے لیے پھریں۔ لیکن خدا کی یہ مہربانی نہیں کہ میں یہاں روزگار کی تلاش کی بجائے صرف سیر کرنے آئی ہوں۔ اور سوائے خدا کی ذات کے کسی کی بھی مرہون منت نہیں میں کسی کیفے کسی ریسٹوران کسی فیکٹری یا دکان پر جا کر دھڑکتے دل کے ساتھ نوکری کی منتظر نہیں رہتی۔ میں نے کسی سے پوچھا تھا۔ آخر ایشیائی یہاں اتنی تعداد میں کیوں آتے ہیں۔ وطن میں بھی تو محنت کے دروازے کھلے ہیں۔ اس نے جواب دیا تھا۔ وہاں ایک عام مزدور مستری یہ بہت کچھ جواب ان کے پاس ہے حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ یعنی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لیے بنیادی سہولتیں...... لندن جسمانی مشقتوں کا شہر ہے یہاں ہر کوئی آ کر ذہنی اور جسمانی مصیبتوں سے گذرتا ہے۔ صرف ایک بات یہاں مختلف ہے کہ آپ کچھ بھی کریں کتنی بھی معمول نوکری کریں ڈشیں صاف کر رہے ہوں یا باتھ رومز کی صفائی گٹر صاف

کرنے والے محکمے میں ہوں یا کسی ریسٹوران میں لیفٹ اوورز اٹھا رہے ہوں۔کوئی آپ کو کمتر یا بہتر نہیں سمجھتا۔بس آپ محنت کر رہے ہیں۔لیکن پاکستان میں امیر اور وائٹ کالر افسر عزت پاتے ہیں۔یہاں آ کر ایک مزدور بھی خوش رہ سکتا ہے وہ بس اپنے ہم وطنوں کی طرف پردہ تان دیتے ہیں۔پھر مستری انجینئر بن جاتا ہے اور پلیٹیں دھونے والا ہوٹل کا مالک اور یہ آئی ے والے لوگوں کا المیہ ہے چھوٹے لوگوں کی زندگی کی ٹریجڈی ...... کتنے انکل واینا اس دنیا میں ہیں۔کتنی بھتیجیاں آنسو بہاتی ہوئی کاموں میں جت جاتی ہیں۔

کوئی خاتون اناؤنس کر رہی ہے یعنی ٹرین کے سٹاپس......خواتین وحضرات......

لوگ لیور پول سٹیشن سے سوار ہوئے اس میں راستوں......راہداریوں اور بھاگتی دوڑتی ہاتھوں سے پھسلتی دنیا کی عادی ہو گئی ہوں۔ٹرین چلتی جا رہی ہے۔آبادی دونوں طرف بھاگی جا رہی ہے سلیٹ ہاؤسز جن کی اوپر کی منزل سیاہ سلیٹ کی ٹائلوں سے مزین کی گئی ہے۔سیاہی اور خوبصورتی ......کیا ایسا ممکن ہے ہاں......آج کل سیاہ رنگ فیشن میں داخل ہے کردار کا سیاہ رنگ اخلاق کا سیاہ رنگ ......اور فطرت کا سیاہ رنگ ...... بلند عمارتیں......بند دروازے اور اکیلا انسان ......نئے قصبے نئی سڑکیں بڑے بڑے بل ڈوزر مٹی ڈھوتی کرینیں......مکانات دو منزلہ ہیں سفید جالیوں والی کھڑکیاں ہر جگہ آپ کا تعاقب کرتی ہیں۔اور پھر ان میں دھرے سدا بہار پھول...... بلند چمنیاں قطار در قطار......

ویلز کی زمین زرخیز اور ہری بھری چراہ گاہوں سے بھری ہوئی تھی......لیکن ان پھیلتی ......آبادیوں نے بندے کو نگل لیا اور چمنیوں کی فصل اگا ڈالی۔خودرو چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں سے پٹی پڑی زمین ریل کے ساتھ ساتھ دور تک پھیلی ہوئی ہے۔لیکن فطر کے الٹرنیٹ کا اپنا حسن ہے۔لیکن بروکس بوانے قصبے کی چھوٹی سی نہر میں سٹیمر بوٹس قطاروں میں کھڑی سیر کرنے

والوں کی منتظر ہیں۔ نہر کے اونچے کنارے پر خودرو پودے آسمان کی وسعت کو کم کر رہے ہیں۔

4 لوٹاؤن کے سٹیشن پر گاڑی رکی ہے درمیانی عمر کے مردوں کی شکلیں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں مجھے کئی بار لگا کہ اس چہرے کو میں نے پہلے کہیں دیکھا ہے۔ لیکن میرے خون میں سنسنی نہیں دوڑی...... میں مجرم نہیں اور یہ چہرہ جاسوس نہیں میں بے حد بے ضرر پاکستانی شہری ہوں جو زیادتیاں برداشت کرنے اور ظالموں کو طرح دینے میں کوئی باک نہیں سمجھتا۔ میں نے صبر کا تعویذ دانتوں میں دبایا ہوا ہے۔ ہاں میری آنکھیں وا اور کان کھلے ہیں۔ اور پھر میرے ہاتھ میں قلم بھی ہے۔ لیکن پھر بھی میں بے ضرر ہوں۔ چالیس پنتالیس سالہ عورت اپنے سرخ بڑھے ہوئے ناخنوں کو مسلسل دیکھ رہی ہے۔ اس کے ہاتھ نازک اور خوبصورت سفید جلد والے ہیں۔ اس نے سرخ لباس پہن رکھا ہے اور میں بہت آسانی سے اس کے لباس کی قیمت کا تعین کر سکتی ہوں یہ لوگ سو پونڈ کا لباس بھی اسی آسانی سے پہن لیتی ہیں جس طرح ہم سو روپے کا۔

بشپ سٹارٹ موورڈ کے سٹیشن پر جہاں سرخ رنگ کے لوہے کے بنچ رکھے ہوئے ہیں ٹرین تیزی سے گزر گئی ہے۔ یہاں سٹینز سٹڈیڈ ائرپورٹ بھی ہے۔ وہی ڈھلوان کھیتوں چراگاہوں میں ہل چلا ہوا ہے۔ نئی بستیاں آباد کرنے کے لیے زمینوں کو ہموار کر کے سڑکیں پل اور گلیاں بنائی جا رہی ہیں۔ پھر ایک اور قصبہ وجود میں آئے گا...... ایلسن ہیم سٹیشن کے پاس پارک کی ہوئی گاڑیاں۔ لیکن مجھے یہاں سمندر نظر نہیں آیا۔ سمندر سفر کرتا کسی اور طرف نکل گیا ہوگا۔ یہ زمینیں یقیناً اناج اگاتی ہوں گی۔ گندم...... پھر زندگی کے تمام دائرے اس گندم کے گرد گھوم جاتے ہیں۔ ماحول دیہاتی سادگی لیے ہوئے ہے۔ پیارا سا ایک مکان پہرہ دار کی طرح درمیان میں کھڑا کائنات کو انسان کے لیے تخلیق کیے جانے کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ کتنا اچھا ہو جو ہمارے کسان بھی ایسے ہی خوبصورت چھوٹے چھوٹے گھر تعمیر کرتے۔ وہاں

رہتے۔ زندگی کرنے کا سلیقہ سیکھتے۔ اس خوبصورتی کو دیکھ کر ذہن پر بڑا خوشگوار اثر پڑتا ہے۔

نیو پورٹ کے علاقے میں چھدرے درخت اور خودرو جھاڑیاں ہیں عجیب بات ہے انہوں نے ان زمینوں کو کیوں فطرت کی بربادی کے حوالے کر رکھا ہے۔ اور یہ سینری ایک اور قصبے کے کنارے جا کر رک گئی ہے۔ صرف گاڑیاں ہیں۔ ان کے مالک ملک کو ترقی دینے اپنے نام کو مشہر کرنے اور اپنے خاندان کے لیے روزی کمانے میں جتے ہوئے ہیں۔ محنت......اور محنت ان کے پاس بے کار وقت نہیں کہ وہ سڑکوں کے کنارے۔ دکانوں کے تھڑوں پر آپس میں گپ شپ لڑائی ی اور لڑائی جھگڑے میں گذار دیں۔ زندگی بے کار گذارنے کے لیے وجود میں نہیں آئی۔ زندگی کے آرام کے لیے جان کو تکلیف دینا ہی پڑتی ہے۔

گاڑی کیمبرج کی طرف جا رہی ہے جو تعلیم کے شائق نوجوانوں کے لیے مستقبل کا ایک خواب ہے جہاں ادب میں نام پدیا کرنے والے لوگ خاموشی اور لگن سے کتابوں میں الجھے رہتے ہیں وہ اپنے خوابوں کی تعبیر کے لیے کوشاں ہیں۔ اپنے تصورات کی دنیا میں کھوئے ہوئے ہیں۔ وہ جو زندگی کے مصرف کو جانتے ہیں۔

وٹلزفورں میں گاڑی ذرا سی دیر کو رکی اور پھر کٹر کٹر کی آواز پیدا کرتے ہوئے چل پڑی کوئی دروازہ کھلو کر اترا ہوگا۔ کسی گھر کا منتظر دروازہ ہوا ہوگا۔ یہ ساری چھتیں عافیت گاہیں ہی تو ہیں۔ فطرت کی سختیوں سے بچا کر اپنے نیچے پناہ دینے ڈالیں۔ سڑکوں کی سفید دھاریاں اوپر کو راہنمائی کر رہی ہیں۔ کسی کھیت کی طرف۔ چرچ کے کسی خاموش آبنوسی فرنیچر والے ہال کی طرف۔ کسی فیکٹری کی طرف یہ لوگ زندگی کی باگ کو ہاتھ میں تھامے بگٹٹ بھاگے جا رہے ہیں۔

چندلا آسمان تا حد نظر چھایا ہوا ہے

خزاں درختوں بیکار جڑی بوٹیوں اور گھروں کے آگے رکھے رنگ برنگے پھولوں پر دور دور سے مخاصمت بھری نگاہیں ڈال رہی ہے۔

شیل فورڈ بھی گذر گیا۔ گاڑی تھوڑے تھوڑے فاصلے پر رکتی ہے اور پھر ان زمینوں کے پاس سے تیزی سے گذر جاتی ہے جہاں ٹریکٹر والے ہل چلا رہے ہیں۔ کیمبرج یونیورسٹی پریس کا نیلا سا بورڈ...... بڑے واضح الفاظ میں نظر آ رہا ہے معمے حل کرتی عمر رسیدہ عورت ادھیڑ عمر خوبصورت ناخنوں پر سرخ رنگ لگائے کوئی پروفیسر...... کلاسوں میں پڑھتے سٹوڈنٹس...... سب اپنا اپنا سامان اٹھائے باہر جاتے راستے کی طرف مڑ گئے ہیں۔ میں بھی اپنا سامان سنبھالے ان کے پیچھے چل رہی ہوں۔

کیمبرج:

کیمبرج کا تاریخی مقام آ گیا۔کیمبرج کا شہر۔میں سٹیشن سے باہر جا کر چپ چاپ اسے دیکھ رہی ہوں کیمبرج اور گذری ہسٹری کیمبرج اور روشن نام۔کیمبرج اور تعلیم کا بلند معیار کیمبرج کتنی دور ہے۔میرے ملک سے میرے خوابوں سے میرے ملک میں مروج تعلیمی معیار سے میں نے اس کا نام ہمیشہ سنا اور بھول گئی۔میرے لیے یہ چاند پر کمند ڈالنا ہی تو تھا۔اور میں نے اتنی ناممکن بات سوچی بھی کب تھی۔لیکن اس تاریخی جگہ کو دیکھ کر آج میرے دل کے بہت نیچے کہیں محرومی کا احساس جاگنے سا لگا ہے۔میں نے بھی تو انگریزی لٹریچر پڑھا تھا۔انگلش میں ایم اے کیا تھا۔لیکنبہت سی نعمتیں خدا نہ جانے دولت سے کیوں وابستہ کر دیتا ہے۔صرف دولت کے جھنڈے تلے بعض خواب دیکھے جا سکتے ہیں۔

میں نے سر کو جھٹکا کیا بیوقوفی ہے وقت گذر گیا میرے بچے ہیں ان کا مستقبل ہے میں پچھلے گذرے برسوں سے صرف ان کے بارے میں دیکھتی آ رہی ہوں۔لیکن میرے اندر کا

سٹوڈنٹ کھانے کے باوجود بھی باز نہیں آیا۔ سڑکیں فٹ پاتھ نہ جانے کیسے کیسے نامور ذہین لوگ ان پر پاؤں دھرتے وقت کے اندھیروں میں سفر کر گئے میں بھی ان میں سے ایک ہو سکتی تھی۔ لیکن جو لمحے ہم اپنے ساتھ گذارتے ہیں اپنے خوابوں کی ہمراہی میں سفر کرتے ہیں وہ ہماری ذات کے ادر تو زندہ رہتے ہیں۔ اور وہی سچائی ہوتے ہیں اس سچائی میں ہماری بھی بقا ہے پھر بہت کچھ تخلیق ہوتا ہے۔

یورپ میں ہر ماہ ہزاروں کتابیں چھپتی اور پڑھی جاتی ہیں۔ تخلیق کے سوتے انہی چشموں سے تو سیراب ہوتے ہیں۔

سامان کو ایک خوبصورت سے کمرے میں رکھ کر میں باہر نکل آئی ہوں۔ دورویہ سفید کھڑکیوں اور جالی دار سفید پردوں والے چھوٹے چھوٹے گھر لیکن ان کی کھڑکیاں بے داغ نہیں ہیں۔ یہاں کے باسیوں کو روح کے جالے اتارنے سے فرصت نہیں۔ یہ ظاہر دنیا بے کار ہے۔ آؤ کسی بلند اور بہتر کام میں روح اور جسم کو جلا کندن بنائیں۔ میں چلتی جا رہی ہوں۔ سب طرف پرانی گوتھک طرز کی کدار کی گنبدوں والی عمارتیں ہیں تاریخ تخلیق کے ان لمحوں میں آ کر مقید ہو گئی ہے۔ جیسے وہ بھی رک کر ان کے نظاروں میں محو ہو۔ سبز ہموار لان ' تیز تیز چلتی عورتیں اور مرد' سائیکلوں پر سرخ تمتماتے گالوں والی لڑکیاں' ڈھلتی عمر کی عورتیں' روشن آنکھوں میں جھانکتے خواب' کچھ کرنے کے کچھ بننے کے' سڑکوں کے کنارے زرد پتے ہوا کے زور سے اکٹھا ہو رہے ہیں۔ لوہے کی گرلوں سے چمٹ رہے ہیں۔ ٹوٹے پتے' گزرے لوگ۔ لوگ جو اپنے آپ کو اپنی تخلیقات میں زندہ بنا گئے۔ بڑی بڑی کئی کئی منزلہ کتابوں کی شاندار دکانیں۔

ھیفر کی کتابوں کی مشہور دکان میں ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کا کارنر ہے جہاں اس کی تمام تخلیقات کو واضح طور پر روشنیوں کی زد میں رکھا ہوا ہے خوبصورت چہرے اور جاندار بلند شعور والا

ٹی۔ایس۔ایلیٹ۔

میں صرف سائرہ ہاشمی ہوں۔چھوٹے سے ملک کی چھوٹی سی ادیبہ وقت نے میرے لیے کوئی کانر کسی کتابوں کی دکان میں محفوظ نہیں کیا اور میرا اپنا وطن جہاں دولت اور اونچے مرتبے کی پوجا کی جاتی ہے۔ہم علم کے مشکل راہوں کے کنارہ کش ہو رہے ہیں۔ہونے دو......ہماری قوم کے بچے بہترین تاجر بن رہے ہیں۔قیمتوں کو بڑھا کر دولت کے انبار اکٹھے کیے جاسکتے ہیں۔ہمارے نفس اور جسم خرید ہو رہے ہیں۔لیکن پھر بھی میں ادیب ہونے کے ناطے کسی بھی سچائی سے اپنا رابطہ توڑنا نہیں چاہتی۔میں ہمیشہ اپنی بے بضاعت طاقت کے بھروسے جھوٹ اور برائیوں سے لڑتی رہوں گی۔میرے پاس سوائے سچائیوں کی روشنی کے اور کچھ بھی نہ ہو۔تب بھی میں جی لوں گی۔

مجھے معلوم ہے میرا قاری اسے لاف زنی سمجھے گا۔مجھے جھوٹی گردانے گا۔اس کی آنکھوں میں شک ہوگا۔لیکن میں ان الفاظ کو لکھتے ہوئے اپنے آپ کو خدا کے سامنے جوابدہ سمجھتی ہوں۔

میں کیمبرج میں آکر بے حد خوش ہوں۔دو رویہ دکانوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے کنگز کالج کی تاریخی عمارت میں گھس گئی ہوں سامنے کے وسیع لان کے درمیان فواروں کے گرد مختلف مشہور لوگوں کے بت ایستادہ ہیں۔پرسکون چہرے والے بت۔علم کے دیوتا، علم کے جویا گھوتھک طرز کی کھڑکیوں پر روشن مصوری کے قبل از مسیح کی داستانیں بیان کی گئی ہیں۔بادشاہوں۔وزیروں۔جنگجوؤں کے چہرے۔

میں کالج کے گرجا گھر میں داخل ہوگئی ہوں۔چیپل کے اندر پہلے ہال میں قطار در قطار کرسیاں نمبروں کے ساتھ رکھی ہوئی ہیں۔نظارے تاریخ کے اوراق پلٹ رہے ہیں۔بادشاہ

'وزیر' غلام ۔ چہرے جو کبھی سانس لیا کرتے تھے ۔ جو ظلم کرتے تھے ۔ چہرے جو ظلم برداشت کرتے تھے ۔ سچائیاں جو مصلوب ہوئیں ۔ اگلے ہال میں لکڑی کی فنکاری سے دیواروں کو مرصع کیا گیا ہے ۔ ایک دراز قد کتے کا اور ایک پروں والا ڈائنا سارس قطار در قطار دیواروں پر لکڑی میں تراشے گئے ہیں ۔ دونوں طرف سفید موم بتیوں کو شیشوں کے فانوسوں میں قطار در قطار رکھا گیا ہے ۔ پالش شدہ بینچ اور ان کے آگے رکھے میزوں پر انجیل اور زبور رکھے ہوئے ہیں ۔ جب منقش مصوری کی ٹرانسپیرنڈسی دیواروں پر ان سفید موم بتیوں کی روشنی لرزاں ہوتی ہوگی اور زبور کے گیتوں کی آواز ان جگمگاتی سایوں والی روشنی میں گونجتی ہوگی تو دل کے اندر خدا اور نیکی کا ان دیکھا تصور اجاگر ہوتا ہوگا ۔ اور پھر روح پر پڑی گرد دھل جاتی ہوگی ۔ طالب علم اچھائیوں اور سچائیوں میں دل کی زیادہ گہرائیوں سے یقین کر کے سامنے کی دیوار پر لگی ایک تاریخی تصویر کو دیکھتے کالج کے کمروں میں بکھر جاتے ہوں گے ۔

سامنے کی تصویر جو تاریخ کے کئی ادوار کا سفر کرتی آج بھی اپنے فن اور فنکار کی یاد کے ساتھ چیپل کی دیوار پر آویزاں ہے ۔ اس تصویر میں حضرت مریم اور ننھے حضرت عیسیٰ کو مجوسی بہت غور سے دیکھ رہے ہیں ۔ مختلف چہرے اپنے اپنے جذبات کی عکاسی کرتے ان کو غور سے دیکھ رہے ہیں میں آہستہ آہستہ چلتی واپس مڑ رہی ہوں ۔ تاریخ کے لافانی لمحوں سے حال کے محو پرواز لمحوں کی طرف ۔ میں بھی کسی روز ماضی کا حصہ بن جاؤں گی ۔ لیکن وقت کے شائد کسی لمحہ پر بھی میرے قدموں کے نقوش ثبت نہ ہو گے ۔ میں جو انسانی دکھوں سکھوں کی کہانیاں لکھتی ہوں ۔ مستقبل کی آنکھ میں جھانکنے کی طاقت نہیں رکھتی ۔ اب میں باہر نکل آئی ہوں ۔ گول چھوٹے چھوٹے پتھروں سے بنی ہوئی روشن پر مالی مٹی پھیلا رہا ہے ۔ بند کھڑکیوں کی سلوں اور رنگین پھولوں کے گچھے پرانی سیاہ پڑتی تاریخی دیواروں کو بڑا جاندار اور زندہ بنا رہے ہیں ۔ یہاں

زمین کو خوبصورت بنایا جاتا ہے تاکہ زمین کے باسی خوبصورتیوں کا ادراک کرتے ہیں۔ کنگز کالج کا مین دروازہ بے حد بلند اور صدیوں پرانا ہے۔ سب طرف نوک دار گنبدوں کو فرشتوں کی شبیہوں اور بڑے بڑے تراشیدہ پھولوں سے سجایا گیا ہے۔ گنبد' آسمان اور وقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھ رہے ہیں' میں ہمیشہ کی طرح تھک کر باہر کی پست' چوڑی دیوار پر بیٹھ گئی ہوں۔ میرے سامنے کوپر کیٹل اور کیمبرج کلاسیکل ریکارڈز کی دکانیں ہیں۔ میرے پیچھے سبز لان اور کنگز کالج کی خوبصورت محرابی بلند دیوار ہے۔ باہر کے بڑے گیٹ کو مرمت کیا جارہا ہے۔ تاریخ کے ورثہ کو قائم رکھنے کے لیے اس کی حفاظت قومی جذبے سے بے حد ضروری ہے تاکہ آنے والے وقتوں کے سیاح اس ورثے کی دید سے محروم نہ ہو جائیں۔ اپنے ماضی کو مستقبل سے جوڑے رکھنا اپنے آپ پر یقین کو قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے۔

سفید بالوں والی ادھیڑ عمر عورتوں اور مردوں کا ایک گروپ کالج کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ ایک خوبصورت چہرے والی ان کی ہم عمر خاتون ان کو تاریخ کے ادوار اور اوراق فر فر سنا رہی ہے۔ یہ یقیناً کسی کالج کے استاد ہوں گے جو سٹڈی ٹور پر کیمبرج آئے ہوں گے۔ سڑکیں ہموار ہیں اور لڑکیاں تیزی سے آ جا رہی ہیں۔ یہاں کوئی انڈر گراؤنڈ ریلوے نہیں۔ سب کچھ فطرت کی گود میں بیٹھا معصوم اور پُر کشش بچے کی طرح ہمک رہا ہے۔ ہاں یہاں بھی جوان جوڑے جذبات کے اظہار کے لیے آنکھوں سے اوجھل کونے کا انتظار نہیں کر پاتے۔ ازلی کشش۔ یہ دنیا کتنی خوبصورت ہے۔ ان کی آنکھوں میں یہی تو لکھا ہوا ہے۔ ان کے سرخ لبوں اور دھکتے رخساروں پر لکھا ہوا ہے۔ ان کی چال کے مستانہ پن میں لکھا ہوا ہے۔

میں پھر چلنے لگی ہوں۔ مجھے ماضی کے ان جاندار لمحوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا چاہیے۔ کرائسٹ کا کالج کا بے حد پرانا' بے رنگ' بڑا بلند لکڑی کا مین دروازہ۔ جو اندر کی پرانی

عمارت کی خوبصورتی کو اپنی حفاظت میں لئے ہوئے ہے۔ پھول اور سبزہ۔ بڑے بڑے لان ۔دیواریں جن پر کائی کی سبز تہہ ان کو مزید تاریخی بنا رہی ہے۔اندر کہیں طالب علم۔علم کے جویا خاموشی سے مصروف ہوں گے۔لیکن کوئی آواز' کوئی جنبش نہیں سب وقت کے دائرے کے اندر سفر میں مصروف ہیں۔

کارپس کرسٹی کالج۔وہی تاریخی ورق۔اوران کے آگے سڑکیں ہیں۔سڑکوں پر لوگ ہیں۔بھاگتی گاڑیاں ہیں۔مسافر کو ڈھوتی آرام دہ بسیں ہیں۔سڑکوں سے دائیں بائیں مڑتی گلیاں ہیں۔جہاں نہ جانے اور کتنے کالج ہوں گے۔کتنی تاریخی حکایات ہوں گی۔کتنے مثبت اور لازوال نقش قدم ہوں گے۔کتنے روشن ذہن ہوں گے۔اب میں بازار کی طرف بڑھ رہی ہوں۔ہمارے ملک کی طرح کھوکھوں کا بازار۔لیکن ترتیب میں خوبصورتی ہے۔قیمتوں میں کمی نہیں۔بلکہ قیمتیں قدرے زیادہ ہیں۔یہاں وہی لوگ تو آتے ہیں جو بن گنے روپے خرچ کر سکیں۔

یہاں آنے والے غیر ملکیوں کو اپنے بھی تو یاد آتے ہوں گے۔ان کے ساتھ تنہائی اور یادکے کرب میں حصہ بٹانے والا کوئی نہ ہوگا...... یہاں لڑکا اور لڑکی' مرد اور عورت ساتھ ساتھ چلتے ہیں بازو تھامے' قدم سے قدم ملا کر۔اور پھر اکیلا رہ جانے والا تنہائی کے اندر اترتا محسوس ہوگا ۔شاید ایسی تنہائیوں کے لیے ہی باتھ رومز کے دروازوں پر چھوٹے چھوٹے اشتہار لگائے گئے ہیں۔

گٹ انوالوڈ 126705 پر فون کریں

دوسرا اشتہار......کوئی تو ہو جس سے آپ باتیں کر سکیں۔جنسی تشدد سے دور۔فون نمبر

18455

یہ ایک معمولی سا اشتہار ہے۔ لیکن یہ بہت سی داستانیں سنا رہا ہے۔ جو کہی اور ان کہی ہیں۔ دل اور داستانیں۔ دل اور دل کے درد۔ لیکن دل کے درد کے مداوا کے لیے کوئی خدا کی طرف نہیں دیکھتا۔ چرچ کے بلند دروازے بند ہیں۔ وہاں تو اندھیرا ہوتا ہے۔ پر اسراریت ہوتی ہے۔ اندھیرا روح پر بوجھ بن کر اترنے لگتا ہے۔ لیکن جوان لوگ تھرکتی تال پر آگے پیچھے جھومنا چاہتے ہیں۔ ہر جگہ مذہبی عمارتیں اداس کھڑی ہیں۔ خالی جگہوں کو پر کرنے کے لیے بہت کم لوگ آتے ہیں۔ وہ نوحہ کناں اداس کھڑی ہیں۔

ہم کیا کریں۔ ہم زندگی سے لطف لینا چاہتے ہیں۔ وقت بھاگتا جا رہا ہے۔ ہمارے پاس پنچوں پر بیٹھ کر زبور اور انجیل پڑھنے کا وقت نہیں۔ جو ان دہکتے چہرے روشن ویمپی ریسٹورانوں میں بیٹھے گم کافی اور برگر کھاتے آپس میں باتیں کرنا پسند کرتے ہیں۔ ریسٹوران آباد ہیں کافی بار آباد ہیں چائے خانے آباد ہیں۔ تفریح گاہیں آبا ہیں۔ سڑکیں آباد ہیں۔ بڑے پرکشش کئی کئی منزلہ شاپنگ سنٹر آباد ہیں......اور پھر خدا انسانوں سے محبت کرتا ہے۔ وہ جابر نہیں۔ رحم دل اور نرم خو ہے......لیکن شاید وہ زندہ رہنے کے بارے میں تو سوچتے ہیں لیکن روح کی بالیدگی کے بارے میں نہیں سوچتے......جسم زندہ ہے......اس میں خون دوڑتا ہے۔ اس میں خواہشوں کی پکار اٹھتی ہے اور وہ سب خواہشوں کی اس پکار کا جواب ہی تو دے رہے ہیں۔

کیمبرج کے تاریخی بازار کے چوک کے پاس بنے کیبن میں کھڑی بوڑھی عورت اخباریں اور رسالے بیچ رہی ہے۔ اس کا جھریوں بھرا چہرہ اخبار پر جھکا ہوا ہے۔ وہ گاہک کو اخبار دے کر پیسے لے رہی ہے۔ ایک بینک کی دیوار کے باہر بنچ پر ایک جوان جوڑا اپنے اپنے سامان کو نیچے رکھے ایک دوسرے کا سہارا لیے چپ چاپ بیٹھا لوگوں کو آتا جاتا دیکھ رہا ہے۔ کہاں جایا جائے......وہ بھی شاید تھک گئے ہیں۔ اور دنیا تو ان کے اندر آباد ہے باہر کیا ہے

کچھ بھی نہیں زندگی کے دو رخ حیات کی صبح اور شام اور میں جو اس شام کے دروازے میں داخل ہو چکی ہوں پورے تین چار گھنٹوں سے شہر دیکھتے دیکھتے نڈھال ہو چکی ہوں۔لیکن واپس کمرے میں جا کر کیا کروں گی۔ابھی یہ پرکشش شہر میرے بازوؤں کے اطراف میں پھیلا ہوا ہے۔تاریخی گلیاں تاریخی دیواریں تاریخی سڑکیں میں بیٹھ جانا چاہتی ہوں...... پانچ بج چکے ہیں۔ویرانی اور خاموشی کا دیو آدم بو آدم بو کرتا شہر میں گشت کرنے لگے گا۔خوبصورت لڑکیاں بالوں کو لہراتی اونچی ایڑیوں کو کھٹ کھٹ بجاتی اپنے ٹھکانوں کی طرف جا رہی ہیں۔میں اپنے ٹھکانے کو جانے والی بس کے انتظار میں بس سٹاپ پر شیشے کی دیوار کے ساتھ بنی چھوٹی سی سیٹ پر بیٹھ کر ویمپی سے خریدا ہوا برگر گرم کافی کے ساتھ کھا رہی ہوں۔میں اندر میز پر اس لیے بیٹھنا نہیں چاہتی کہ کیری اوے فوڈ کو صاف سطح والی میز پر (جسے ایک جوان ویٹرس یونیفارم پہنے صاف کرتی رہتی ہے) بیٹھ کر کھانے کے لیے پچیس پینی زائد ادا کرنے پڑتے ہیں۔اور پچیس برابر ہوئے آٹھ پاکستانی روپوں کے۔بھلا میں یہ روپے کیوں ضائع کروں......

میں ٹورسٹ ہوں......اور میں اس احساس سے لطف اٹھانا چاہتی ہوں...... میں سائرہ ہاشمی اور جہاں گرد......ایک عورت اور وہ بھی پاکستانی...... ہمارے ہاں ہماری ایک ایک حرکت کو اپنی ہی خواہش کے مطابق معنی پہنا دیے جاتے ہیں۔کسی کے کردار کی آؤٹ لائن میں اپنی ہی مرضی کے رنگ بھر دیئے جاتے ہیں۔اور پھر آپ کو پسند یا رد کرنے کے اپنے ہی پیمانے ہوتے ہیں۔آپ زندگی کی تنی رسی پر ثابت قدمی سے چل کر پار اتر جائیں تو جنت آپ کی۔ورنہ یہاں مجھے کوئی نہیں دیکھ رہا۔لیکن میں خود اپنے آپ کو مسلسل گھور رہی ہوں۔اپنے آپ پر ہنستی ہو......میں اور جہاں گرد......میں جو اپنی ہی زنجیروں میں بندھی بڑی پرسکون اور آرام دہ زندگی بسر کر رہی تھی......سارا سارا دن پھرتی رہتی ہوں......حالانکہ بچوں سے دوری کو دل ہی دل میں

محسوس کرتے ہوئے گذرے اور باقی دنوں کے گننے لگتی ہوں۔ میں کہ ایک مشرقی عورت ہوں۔ جو اپنے گرد لپٹی سارا زنجیروں کو محسوس کر کے ہی خوش رہ سکتی ہوں۔ اگر میں ایک جوان مرد ہوتی تو میرے چاروں طرف پھرتے چہرے میرے دل کو جذبات کے انگاروں سے بھر دیتے ہیں میں اپنے پاس بیٹھی لڑکی کی خوبصورتی کے قصے کہتی اور پھر محبت کی ایک غیر ملکی داستان جنم لیتی میں سب کچھ بھول کر اس کی زلف گرہ گیر کی اسیر ہو چکی ہوتی۔ ناممکن خواب میری آنکھوں میں بھر جاتے یا پھر کسی چائے خانے کے میز پر بیٹھے ہوئے دور بیٹھی لڑکی سے اپنے حوالے سے ایک داستان بن ڈالتی مجھے اکثر اپنے عورت ہونے پر غصہ آ جاتا۔ اس وقت جب میں بہت کچھ لکھنا چاہتی ہوں ملک کی سیاست کے اتار چڑھاؤ جلوسوں میں شامل لوگوں کے اندرونی جذبات و احساسات ان کی وابستگیوں کو محسوس کر کے آنے والے حالات کا جائزہ ۔لیکن جلوسوں میں شامل ہونا تو درکنار میں اس دن اپنے گھر کا دروازہ بھی کھلا نہیں رہنے دیتی ۔میں اپنے بڑے بیٹے ہمایوں کو بھی تاکید کرتی ہوں کہ وہ کالج سے جلد لوٹ آئے......میں اپنے شوہر کو سمجھاتی ہوں کہ وہ اس وقت سڑک پر نہ آئیں۔

اور اب میں اس وقت جز بز ہو رہی ہوں کہ عورت ہونے کے ناطے سے میں اپنے سفر نامہ کو دلچسپ نہیں بنا سکوں گی......اور یہ کمی میرے عورت پن کی وجہ سے ہی تو ہے۔ نہیں تو بنچ پر بیٹی لڑکی کا سر میرے کندھے پر ہوتا......اور......خیر جانے دیجئے......میں ایسی کہانیاں ضرور لکھوں گی جہاں یہ لڑکی میرے کندھے پر سر رکھے ہوگی......بس قاری کو انتظار کرنا پڑے گا۔ میں ان جوان چہروں کو دیکھ کر اپنے بچوں کو یاد کرنے لگتی ہوں۔ ان کے خوبصورت سویٹر مجھے بچوں کی فرمائشیں یاد دلاتے ہیں۔ اور تب میں کسی نہ کسی بڑی دکان کے شو ونڈو کی طرف بڑھ جاتی ہوں۔ میں ان کے لیے کچھ نہ کچھ خریدتی رہتی ہوں میرے سامان میں کئی پونڈ وزن کا

اضافہ ہوگیا ہے۔ خاندان کے چھ لوگ کم از کم بارہ سویٹر تو خرید ہی لینے چاہیں۔ میں نے کوئی بار بار تو یہاں آنا نہیں۔ چیزیں خوبصورت اور پائیدار ہیں۔

میں اپنے چھوٹے بیٹے فیصل خان کی دی ہوئی لسٹ کو پڑھتی ہوں۔ ناممکن میں چلاتی ہوں اس کی فرمائش پوری کرنے کے لیے تو ہزاروں پونڈ چاہیں۔ اور میرے سارے پونڈ تو کمرے کے کرائے پر خرچ ہوتے جا رہے ہیں۔ ہر رات کا بارہ پونڈ یعنی تین سو چوراسی روپے۔ اور پھر سارے دن کے کھانے کا خرچ تقریباً کم از کم دو سو روپیہ۔ ریل کے کرائے الگ۔ پیاس کو بجھانے کے لیے کوک...... میں بھوکا نہیں رہ سکتی...... کسی معمولی سرائے میں رات نہیں گزار سکتی۔

ڈیم وو شاپنگ میں لوگوں سے لفٹ لے کر تو سفر کرنے سے رہی۔ یہاں تو پارک میں گھاس پر سونا ناممکن ہے سردی سے ہڈیاں تک جم جائیں گی۔ ہاں کسی ٹورسٹ سائٹ پر خیمہ لگا کر رات بسر کی جا سکتی تھی لیکن میرے پاس تو خیمہ ہی نہیں اور نا ہی میں مرد ہوں مجھے ہر حالت میں بخیریت گھر واپس جانا ہے میرے بچے میرے منتظر ہوں گے میرے پہنچنے کی خوشی کے ساتھ ساتھ وہ یورپ سے لائی گئی چیزوں کی خوشی کو بھی پانا چاہیں گے اور پھر ہمارے دوست کتنا ناممکن ہے کہ ان کو خوش کر سکوں۔ میں بھی آنے والوں کی اکثر شکایت کیا کرتی تھی۔ لیکن اب میں جان گئی ہوں کہ ساٹھ ستر ہزار روپیہ لے کر یورپ کو پورے ایک ماہ کی سیر کے لیے نکلنا بہت سی جگہوں کو دیکھنا بہت سے شہروں کی سڑکیں ناپنا اور پھر تحفوں سے بھرے بکس لیجانا ناممکنات میں سے ہے۔ اور میں ان ناممکنات کو ممکن کیونکر بنا سکتی ہوں میں سیر کے لیے آئی ہوں مختلف جگہوں اور لوگوں کو دیکھنا کتنا اچھا لگتا ہے غیر ملکی ہواؤں کو اپنے بالوں میں گھستا محسوس کر کے میں مسکرانے لگتی ہوں۔ واپس جانے پر میں یقیناً سفرنامہ لکھوں گی۔ ایسا سفرنامہ جو عورت کی محدودو

دنیا میں رہ کر ہی لکھا جا سکتا ہے میں کسی خوبصورت لڑکی کو جاتا دیکھ کر یہاں کے لڑکوں کی طرح سیٹی نہیں بجا سکتی۔ بس مجھے ان کے دہکتے رخساروں والے چہرے قدرت کا شاہکار لگتے ہیں۔ جن کو سراہنا ضروری ہے جن کی تعریف کرنا خدا کی صناعی کا اعتراف کرنا ہے ان کے جسم ایک عظیم صناع کی کاری گری ہیں۔

تاریخی عمارتوں کی صدیوں پرانی زندگی کی میں گواہ بن گئی ہوں۔ بڑھاپا ہر ملک ہر قوم اور ہر جگہ چہروں کے ساتھ ایک سا ہی برتاؤ کرتا ہے میں شکر گزار ہوں کہ اپنے ملک میں مجھے زیر زمین رہداریوں میں ہمیشہ بھاگنا نہیں پڑتا۔ میرے لیے خدا نے اپنی نعمتوں کے دروازے آہستہ آہستہ وا کیئے اور میں نے شکر گذاری میں ہر بار اس کے سامنے سر جھکایا۔ اس کی حمد کی۔ اس نے مجھے اس وقت بھی تنہا نہیں چھوڑا تھا جب میں جوان لوگوں میں شامل تھی اور اس وقت بھی اکیلی نہیں ہوں جب بڑھاپا میری روح اور جسم کے دروازے پر کھڑا مسکرا کر اندر آنے کا اذن طلب کر رہا ہے۔ میں وقت کے لمحے لمحے میں سفر کرتی ہی تو یہاں تک آئی ہوں۔ میں نے راہ کی ساری نعمتوں کو برتا۔ ان کے رنگوں اور خوشبوؤں کو مسام جاں میں اترتے محسوس کیا۔ میں اب اس کا حصہ بننے کے لیے تیار ہوں میں ماں ہوں خدا نے مجھے تخلیق کی فضیلت دی۔ بیوی ہونے کے ناطے میں نے وفا شعاری کو اس کا تحفہ جانا۔ زندگی کی کمیوں کو میں نے قسمت سمجھا اور اپنی خامیوں پر نگاہ کی۔ زندگی کی کڑی راہ پر میں خدا کی رسی کو پڑ کر چلی اور چلتی آ رہی ہوں۔ میرے پاس خدا جیسی ہستی کا سہارا اور اس کی طاقت کا بھروسہ ہے یہاں کے انسان بظاہر اس سے لاپرواہ لگتے ہیں لیکن وہ ایک دوسرے کو تکلیف دے کر خوش نہیں ہوتے اپنے کام محنت اور دیانتداری سے انجام دیتے ہیں۔ یہ سب اس کے احکام پر چلنا ہی تو ہے یہاں کے سائنس دان انسانیت کے سکھ کے لیے دن رات تجسس اور تحقیق کے میدانوں میں

عقل کے گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے اور ستاروں پر کمندیں ڈالتے ہیں چاند کو زیروزبر کرتے اور مریخ کی دنیا پر قابو پانا چاہتے ہیں۔ یہ انگریزی خدا نہیں تو وہ خدا ہے جسے سب شیئر کرتے ہیں بہن امیرزہرا کی سب سے چھوٹی بیٹی نے کہا تھا......اور میں اسی کے الفاظ دہرا رہی ہوں۔''خدا ایک ہی ہے سب شیئر کرتے ہیں'' اس نے اپنی گڑیا کو پکڑا ہوا تھا جس کے بال سنہری اور اس کے اپنے بال سیاہ وہ دو مختلف قومتیں رکھتی تھیں۔لیکن ان دونوں کو ایک ہی خدا پر یقین تھا اس کی بات مجھے بہت اچھی لگی تھی۔خدا کا ایک ہونا پیاری بات ہی تو ہے۔

چہرے ہمیشہ وقت کی شکنوں بھری زمین پر آتے اور غائب ہوتے رہیں گے۔چہرے جو اپنے ہونے پر یقین رکھتے ہوئے اپنی طاقتوں کی کھوج میں سرگرداں رہتے ہیں اور یہ کیمرج کا شہر ایسے ہی چہروں سے پررونق ہے غیر ملکی سٹوڈنٹس چینی جاپانی پاکستانی ایرانی ہندوستانی اور نہ جانے کہاں کہاں سے وہ سب ان پرانے وقتوں کے چشموں سے آب حیواں کی تلاش کر رہے ہیں۔ہنستے مسکراتے اپنے پر یقین کرتے راہوں پر چلتے جا رہے ہیں۔

''ہوپ'' ہسپتال کی بوڑھی نرسوں کو آپی جمیلہ ہاشمی یاد ہیں۔آپی نے آنکھوں کا آپریشن اسی ہسپتال سے کروایا تھا۔وہ ان کی موت پر افسوس کر رہی ہیں رنگین پھول کھلے ہیں ہوائیں زرد پتوں کو ہمیشہ کی طرح سڑکوں کے کناروں پر اکٹھا کر رہی ہیں۔ہائی سکول کے بچے تیز تیز سائیکل بھگاتے گاڑیوں کے آگے پیچھے بھاگتے جا رہے ہیں۔زندگی اور زندہ رہنے پر یقین کرتے ہوئے۔لیکن موت دبے قدموں آ کر کسی نہ کسی کو اچک کر لے جاتی ہے اور زرد پتے خزاں کے موسم میں ہمیشہ اکٹھے ہوتے رہتے ہیں۔اور یادیں دلوں کو تڑپانے لگتی ہیں۔

میں ایونیو اکتالیس کے بس سٹاپ پر سرسبز درختوں تلے پھیلی خودرو روئیدگی کو لکڑی کی دیوار کے اوپر سے جھانک رہی ہوں نئے پتے نئی کونپلیں نئے انسان جو زندگی پر اندھا یقین

کرتے ہیں میں واپس آ کر بس سٹاپ کے شیشے کی دیوار سے ٹیک لگا کر سیٹ پر بیٹھ گئی ہوں غم زدہ اور اداس اسی بس سٹاپ پر ایک بوڑھا انگریز خود سے باتیں کرتا سر ہلاتا ہوا بیٹھا ہے۔ پانچ پھر بج گئے۔ کیمبرج کا آسمان دھند میں چھپا ہوا ہے۔ شاید یہ بوڑھا فرد کسی اکیلے سرد کمرے میں جانے سے ڈر رہا ہو۔ گھبرا رہا ہو۔ وہ یہاں بیٹھا شیشے کی دیوار کے پار جاتے خوش وخوم لوگوں کی دوسراتھ میں تنہائی سے آنکھیں چرا رہا ہے اس کی آنکھوں میں ویرانی کے سائے ہیں زندگی بھاگی جا رہی ہے یہی تو زندگی ہے یہی تو زندگی کا چلن ہے پتے درختوں کی شاخوں سے برابر ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ گر رہے ہیں اور نہ جانے اس بوڑھے تنہا انگریز کی زندگی کا پتا کب حیات کے درخت سے گر جائے گا اور اسے کوئی یاد نہیں کرے گا۔ وائے زندگی۔

بس آ گئی ہے تھوڑی دیر بعد میں اس کمرے میں رات کے شر سے پناہ لے لوں گی شر جو اندھیروں کے بطن سے جنم لیتا ہے ایک چھت کتنی بڑی پناہ گاہ ہے۔ کھڑکی کے دھندلے شیشے سے آسمان سیاہ تنی چادر لگ رہا ہے میں نے کھڑکی کے شیشے سے چہرہ لگا کر باہر جھانکا ہے تیز ہواؤں میں چند ٹمٹماتی کمزور سی روشنیاں زندہ شہر تو روشنیوں میں نہائے ہوئے جگمگا رہے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ شہر کیمبرج ہے جو ظاہر سے زیادہ باطن میں اتا ہوا ہے اندر کی کھوج کرتا ہوا میں نے پھر دنوں کو انگلیوں پر گنا ہے۔

اللہ نے چاہا تو بارہ تاریخ کی صبح کو میں اپنے گھر کے پر رونق چہروں میں گھری اطمینان بھرا سانس لے رہی ہوگی۔

دریائے کم:

میں نے دنوں اور تاریخوں کو زیادہ تر ذہن سے نکال دیا ہے۔ تاریخ بس اس دن یاد

آتی ہے جب گھر کی یاد تیز قدم رکھتی میرے دل کے اندر باہر گھومنے لگتی ہے۔ آج پانچ تاریخ اور کتوبر کا مہینہ ہے۔ میں سینٹ جانز کالج کی پرانی عمارت کے لانوں کے بیچ بنے راتوں پر چلتی ہوئی عمارت کے اندر داخل ہو گئی ہوں۔ پرانی دیواریں قدموں کے بوجھ کے گھسے راتے۔ ایک کمرے کی دیرار کے ساتھ سوکھی بیل کی شاخیں اونچائی تک چمٹی ہوئی ہیں۔ روئیدگی اور ہے سے تہی اس ذہن کی مانند جو بڑھنے سے رک جائے۔ سوچنے سے عاری ہو جائے اور ایک ہی تصور اور خیالات کے گرد چکر لگانا شروع کر دے۔ یہ بیل بھی روئیدگی سے خالی ہو چکی ہے عمارت کا دوسرا حصہ بھی ویسا ہی تاریخی ہے۔ دریائے کم کا گہرا کائی زدہ مونگیا پانی تنگ محرابوں کے نیچے سویا ہوا ہے۔ بالکل کالج کے ماحول کی طرح۔ اس سے آگے جانا منع ہے۔ لیکن میں نے بورڈ کی طرف دیکھا ہی نہیں۔ سامنے گھاس کے دبیز لان ہیں۔ لانوں کے کنارے درخت ہیں اور کم کا سرد پانی بہتا جا رہا ہے۔ اور بجری بجھی روشیں شانت لگ رہی ہیں۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے یہ سارا قطعہ نروان کے لمحے میں آ کر رگ گیا ہے۔

”پرائیویٹ یار پروفیسرز اونلی“ میں واپس مڑ گئی ہوں سوکھی بیل پھر نظر آنے لگی ہے۔ سوکھی ہزار ہا شاخیں دیواروں سے چمٹی ہوئی ہیں۔ اور نیچے سے اس کی جڑوں کو کاٹ کر زمین سے اس کا تعلق ختم کر دیا ہے۔ وہ ہمیشہ قائم رہنے والی حنوط شدہ ممی کی طرح صدیوں یونہی موجود رہے گی۔ کیمبرج کی تاریخ کا ایک حصہ بن کر۔ میرے جیسے لوگ اسے دیکھ کر خوشی اور اداسی کے گڈمڈ جذبوں میں الجھ جائیں گے۔ چند طالب علم تیز تیز چلتے ایک بلاک سے دوسرے بلاک میں چلے گئے ہیں۔ میں کسی کمرے میں جھانک کر دیکھنا چاہتی ہوں کہ اندر کوئی ہے بھی یا نہیں۔ لیکن اندر جھانکتے ہوئے یقیناً کوئی تاریخی اصول ٹوٹے گا اور میں صدیوں پرانے اصول کو توڑنا پسند نہیں کروں گی۔

واپس پلٹتے ہوئے باہر کے گیٹ کے پاس بڑی سی کینٹین میں جھانکتے ہوئے مجھے تضاد کا ایک دم احساس ہوا ہے۔کینٹین موجودہ طرز زندگی کی عکاسی کر رہی ہے کوئی بیرا اونچی آواز میں گیت سن رہا ہے۔یہ کینٹین اوراس میں کام کرنے والے تاریخ کے اس ورثہ سے بالکل الگ شخصیت لگ رہے ہیں۔وہ آج کے دن میں زندہ ہیں۔باقی عمارت تو صدیوں سے کائی زدہ دیواروں کے ساتھ ایک خواب دیکھ رہی ہے۔

ایک کالج میں ٹرینیٹی کالج کے باہر کے لان کی دیوار پر بیٹھی کالج کو دیکھ رہی ہوں۔تاریخ کا ایک اور درخشندہ ورق۔کالک کے لان میں ایک فوارا بڑی بے دلی سے پانی گل رہا ہے۔جیسے وہ یہ کام مجبوری سے کر رہا ہو۔فوارے کا درمیانی گول گنبد خاصا بلند ہے۔اس فوارے کے دائرے کے باہر پھولوں کا گول تختہ ہے میں نے پہلی بار اس کالج کی اندر کی عمارت میں روشنیاں دیکھتی ہیں۔روشنیاں کالج کی عمارت کے جاگنے کا تاثر دے رہی ہیں۔کالج کی مرکزی عمارت کی پیشانی پر ایک اور شیشے کی کھڑکیوں سے بنایا گیا گنبد ہے۔عمارت میں گذرے زمانے کی بزرگی اور شاہانہ پن ہے۔کائی زدہ دیواریں پرانی طرز کی کھڑکیاں......پھول ......اور بڑے بڑے لان میں گیٹ وہی پرانی بے رنگ لکڑی کا ہے ۔ڈیوڑھی کی چھت پر مختلف کالجوں کی شیلڈز کو لگا کر سنوارا گیا ہے اور چھت میں زندگی دوڑ آئی ہے۔وہ جاگتی لگ رہی ہے۔لیکن اس کے بڑھاپے کا تاثر ابھی تک زائل نہیں ہوا۔ایسے لگ رہا ہے جیسے بوڑھی عورت نے اپنے چہرے کو غازہ لگا کر جوان بنانے کی کوشش کی ہو۔میں واپس آ کر پھر دیوار پر بیٹھ گئی ہوں۔میری پشت پر تیز چلتی خواتین کی ایڑیوں کی آواز مسلسل گونج رہی ہے۔یہ گونج کبھی مدہم۔کبھی تیز ہو جاتی ہے لیکن میں مڑ کر نہیں دیکھوں گی......۔

ہوا نخ ہے۔رات کمرے کی دھندلی کھڑکی کے باہر بارش ہولے ہولے دستک دیتی

رہی تھی۔سیاہ آسمان سکت تھا۔آج سورج روشن ہو کر پھر دبیز بادلوں کے پیچھے چھپ گیا ہے۔میرے بائیں ہاتھ پر ویسٹ منسٹر بینک کی عمارت ہے اور پیچھے آل سینٹ چرچ کی یادگار صلیب گڑی ہے۔جس کے تنے کی گولائی پر مختلف بزرگوں کے بارے میں یادگار تحریریں لکھی ہوئی ہیں۔آل سینٹ کا نیا چرچ جیوٹس لین میں بنایا گیا ہے۔

ٹرینٹی کالج 1546ء میں ہینری ہشتم نے بنایا تھا۔اور اس کا بت کالج کے صدر دروازے کے باہر اوپر پیشانی پر نصب کیا ہوا ہے۔اور بادشاہ جو اپنے درباروں میں علماء اور فضلاء کو جگہ دیتے تھے۔شاید اکبر بادشاہ کی طرح ہنری ہشتم کے بھی نورتن ہوں......اور اس کالج نے اتنی صدیوں میں نہ جانے کیسے کیسے رتن تخلیق کیے ہوں گے۔اور نہ جانے کون کون آنے والے وقتوں میں موتی بننے کے جوکھوں سے گذرے گا۔اور عقل کے چراغ فروزاں رہیں گے اور انسانی شعور ترقی کی منازل طے کرتا رہے گا......ہنری ہشتم کا بت پہرہ دیتا رہے گا۔احساسات کا اعتقادات اور شعور کی برتری پر۔

ہوا اور بھی سرد ہو گئی ہے۔کیونکہ وہ صدیوں سے یہاں ان تاریخی راہداریوں میں سرگرداں ہے۔صرف چہرے بدلتے ہیں۔وہ چہرے جو مشہور تین منزلہ ہیفر کی کتابوں کی دکان کے شیلفوں کے سامنے رکھے ہوئے گذرے لوگوں کے شعور میں حصہ بنانے کی تگ و دو کر رہے ہیں۔پھر یہ بھی نہیں رہیں گے۔لیکن کئی ذہن انمٹ نقوش چھوڑ جائیں گے۔لافانی دربار میں غیر فانی ناموں کی لسٹ میں ان کا نام لکھا جائے گا۔ایسا ہمیشہ ہوتا رہا ہے اور ہمیشہ ہوتا رہے گا۔

میرے ملک میں بھی ایسے لوگ ہیں جو ملک کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتے ہیں۔اس کے دلوں میں محبت لگن سچائی اور قربانی کا جذبہ ہے۔لیکن ان کو کوئی نہیں پوچھتا۔ان کی راہوں میں رکاوٹیں کھڑی کر دی جاتی ہیں۔ان کو پیچھے دھکیلنے کی نت نئی ترکیبیں سوچی جاتی ہیں۔ان

کے چہروں پر سیاہی پوتنے کے لیے ترکیبیں لڑائی جاتی ہیں۔وائے افسوس ہائے افسوس...... ہماری تہذیب نئے چولے بدل رہی ہے۔نئی راہیں تراش رہی ہے۔اپنی شخصیت کو اہم بنانے کے لیے روپیہ چاہے چاہے کچھ بھی کریں۔کسی طرح بھی کمایا جائے۔ہمیں عزت چاہیے عزت۔

ہم یہ جانتے ہوئے بھی ایک سمگلر کی عزت کرتے اس کو بڑا مانتے اور اس کے آگے جھکتے ہیں کیونکہ وہ ہم سے زیادہ امیر ہے۔وہ امیر ہے اس لیے صاحب اقتدار ہے سیاست کی بازیاں چل سکتا ہے۔امیری کے کھیل کھیل سکتا ہے۔ہم اس کی دولت اور طاقت سے خوف زدہ ہو جاتے ہیں کیونکہ ہوسکتا ہے ہماری خوشامد ہمیں بچالے گی...... خدا دور ہے۔اور شائد سنے بھی نہ......

لیکن اگر ہم قوموں میں سربلند رہنا چاہتے ہیں تو ہمیں ان بڑھتی ہوئی غلط رایات کے سامنے سچائی کا بند باندھنا چاہیے نہیں تو تباہی ہمارا مقدر بن جائے گی۔میں اس شہر کی خوبصورتی کو دیکھتے دیکھتے غم زدہ ہو رہی ہوں......ہم تو بڑی عظیم اور قدیم روایات کی حامل قوم تھے۔جہانگیر و جہاندار تھے۔ہمارے پھریرے سمندروں پر لہراتے تھے۔علم ہمارے سامنے جھکا ہوا تھا۔بہادری اور سچائی ہماری گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔لیکن وقت نے ہماری روایات کو رند ڈالا۔خود غرضیوں نے سچائیوں کا خون بہادیا۔اسلاف کی روایات کو زمین کے بدلے بیچ ڈالا......غلام ہو کر ...... جاگیردار اور خانصاحب کہلائے......سر جھکا کر سر کا خطاب پایا......وائے ماتم ایک شہر آرزو۔

لیکن وقت کو ہم چاہیں تو اپنا پابند بنا سکتے ہیں۔شعور کو بیدار کرنے کے لیے گزری روایات کو زندہ کرنا ہوگا۔نہیں تو ہماری پاس صرف تاریخ کے بوسیدہ اوراق رہ جائیں گے۔اور

مستقبل کا تاریخ دان ہماری کس ارفع و بلند خوبی کو رقم نہیں کر سکے گا۔صرف روپیہ ہوگا۔جو کالا دھن ہوگا۔اوراس کالے دھن سے بنائی گئی دنیا بھی کالی ہوگی......ہمیں روشنی کی جستجو کرتے رہنا چاہیے۔لاہور کی تاریخی حیثیت یونیورسٹی کی علمی روایات وہ بھی کیمبرج بن سکتا ہے۔صرف بہتر سوچ اور بلند کردار رکھنے والے باصلاحیت استدا چاہیں......راہیں آگے بڑھ رہی ہیں۔گلیوں میں مڑ رہی ہیں۔تاریخی اور تعلیمی روایات والی شاہراہوں پر مڑ رہی ہیں۔سفر جاری ہے۔

دریائے کم ہمیشہ کی طرح خاموش اور بردبار طریقے سے بہہ رہا ہے۔میں اس دریا کی سیر کرنے کے لیے آئی ہوں۔چونی کشتی کو پنی کہتے ہیں۔ابھی ابھی تیز بارش کی بوچھاڑ نے کئی لوگوں کو بھگو دیا ہے۔میں سامنے کی کیمروں کی دکان میں گھس گئی ہوں۔عاشی نے چارسو پنڈ کا کیمرہ خردا ہے۔اب لمحے اور ساعتیں کاغذ کی زنداں میں قید ہو جائیں گی۔

سرمئی بادل بہت نیچے جھک کر دریائے کم کے مونگیا پانی میں اپنا چہرہ دیکھ رہے ہیں۔سامنے کی دیوار کے ساتھ اُگے بڑے بڑے گیندے کے پھول پرانی اینٹوں کی سڑکیں جو قدموں تلے بچھ کر ملائم ہو چکی ہیں تاریخی عمارتیں سب کچھ دھل گیا ہے۔اوراب بادل نہ جانے تیزی سے کدھر جا کر چھپ گئے ہیں۔شائد وہ خوبصورتی اور ٹھنڈک میں اضافہ کرنے کے لیے ہی آئے تھے۔دریائے کم کے پانی میں تھوڑی دیر کو ہلچل ہوئی اب وہ دوبارہ ٹھہرا ہوا لگ رہا ہے۔میں پنی میں بیٹھی نیچے جھانک رہی ہوں۔لمبی لمبی موٹی گھاس کی شاخیں اوپر تک تیر رہی ہیں۔کریپر بیلوں سے ٹوٹے ہوئے زرد ہلکے سبز اور سرخ پتے پانی کی سطح پر ایک ہی جگہ رکے ہوئے لگ رہے ہیں۔نامعلوم طور پر آگے بڑھنے کے باوجود وہ رکے ہوئے ہیں۔

یہ دریا کیمبرج کا تاریخی دریا ہے۔شاید پانی بھی صدیوں پرانا ہو......لیکن یہ ناممکن

بات ہے۔ پانی کی بہتی دھارا دوبارہ وقت کا حصہ نہیں بن سکتی۔ ایسا ہونا ناممکن ہے۔ عمارتوں کے لانوں میں پھول ہیں۔ پھول قدرت کی خوبصورت کا برملا اظہار ہیں۔ عمارتوں کی دیواروں سے سرخ عنابی رنگ والے پتوں کی بیلیں چمٹی ہوئی ہیں۔ کریپر...... بغیر سہارے کے بلندی تک نہیں پہنچ سکتیں۔ اور وہ انسان بھی تو کریپر ہی ہیں جو دوسرے نظریات خیالات کے سہارے اپنی ذات کی پہچان بناتے ہیں۔ دوسرے کے دیئے گئے لباس میں خوبصورتی کی تلاش کرتے ہیں۔ دوسروں کے الفاظ کو دہراتے اور عقل کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں...... وہ ادیب جو اپنی ذات پہ شک...... ایسا انسان کریپر ہے...... اور کلہاڑی کا ایک وار جب جڑ کو کاٹ ڈالتا ہے تو کریپر کبھی دوبارہ ہرا نہیں ہوسکتا...... بیچارا کریپر۔ بیچارا انسان......

کشتی والا کشتی کو ہولے ہولے سے بانس سے کھے رہا ہے۔ پل کے کونے میں پانی پر جمع گندگی پیچھے چھٹ گئی ہے۔ اب ہوا پانی پر چھوٹی چھوٹی لہریں بناتی بہہ رہی ہے۔ دریا تاریخی عمارتوں کی کائی زدہ دیواروں کی قید میں گھرا ہوا ہے۔ دونوں طرف بلند دیواریں ہیں۔ تاریخی عمارتیں ہیں۔ یہ ان کالجوں کی پشت ہے۔ اور دریا کے کناروں پر اگے ہوئے ویپنگ ولوز کے بڑے بڑے درخت پانی کی طرف جھکے ہوئے ہیں۔ ویپنگ لوز...... فراق اور کرب کے آنسو۔ وصال کے لیے بیتاب دل کا نوحہ پانی کی صورت میں رواں رہتا ہے۔ درخت روتے ہیں۔ ان گئے ہوؤں پر جو زمین کا سنگار تھے۔ جو زندگی کی آن تھے۔ جو سچائیوں اور نیکیوں کے رکھوالے تھے...... شاخیں بے بسی سے نیچے کو جھکی ہوئی ہیں۔ اپنی ذات کو تج کر دوسرے کی ذات میں پناہ تلاش کرنا محبت کا یہ بھی تو مفہوم ہے۔

پنی جارج کالج کی دیواروں پر سرخ پتوں والی بیل چمٹی ہوئی ہے۔ اور کشتی آہوں کے پل کے نیچے سے گذر رہی ہے آہوں کا پل میں کشتی والے سے استفسار کر رہی ہوں...... کیا پل

آہیں بھرتا ہے وہ ہولے سے ہنستا ہے...... "نہیں آہوں کا تعلق اس پل سے نہیں...... ویانا میں ایک پل تھا جس پر سیاسی اور اخلاقی مجرموں کا سر قطع کرنے سے پہلے لا کر کھڑا کرتے تھے تا کہ وہ اپنی آنکھوں سے اس خوبصورت دنیا کا آخری نظارہ کر لیں دنیا جو بے حد پرکشش ہے۔ جاندار ہے ان کے دل میں اس دنیا کی محبت کو بیدار کیا جاتا ہے جو انسان کو موت سے خائف کرتی ہے۔ اور پھر موت کا خیال ہی ان کے دل پر گر کر ان کی حقیقی موت سے پہلے بھی انہیں مار دیتا ہے۔ وہ دوہرے کرب میں مبتلا ہو جاتے تھے۔" "میں سن رہی ہوں...... تاریخی کہانی...... لیکن پل کا نام خوبصورت ہے۔ شاید اس پل کے اوپر کھڑے ہو کر کسی ناشاد عاشق نے سرد آہیں بھری وں گی اس کے آنسوؤں کی نمکینی دریائے کم کے پانی میں شامل ہوئی۔ اس نے اپنی محبوبہ کو کسی دوسرے کے ساتھ مسکراتے ہوئے کسی کشتی میں بیٹھے باتیں کرتے دیکھا ہوگا۔ اور وہ نیا چاہنے والا کشتی کے لمبے بانس کو بار بار پانی میں ڈبوتا اور پھر گیلے ہاتھوں سے تھامتا ہوا اپنی نئی محبوبہ کو خوش کرنے کی کوشش کر رہا ہوگا۔

کشتی والا کہہ رہا ہے کہ یہاں اس پل کے ساتھ کوئی رومانی ٹریجڈی وابستہ نہیں۔ یہ نام ویانا کے پل کی نقل میں رکھا گیا ہے...... وہ ان جوان لوگوں کو کیوں نہیں دیکھتا جو کندھے سے کندھے ملائے گپیں مارتے سب طرف نظر آ رہے ہیں کیا محرومیوں کا کوئی سایہ ان پر نہیں گذرے گا۔ اور وہ آہیں نہیں بھریں گے۔

ہماری کشتی اب جونز برج کے نیچے سے گزر رہی ہے پانی میں چھوٹی چھوٹی رنگین مرغابیاں طمانیت سے ٹھنڈے پانی پر تیر رہی ہیں۔ پرانے بلند اور چوڑے گھیر والے درختوں کی شاخیں تالیاں بجا رہی ہیں۔ پلوں کے اوپر کاڈ کا ٹورسٹ جوڑا کیمرہ ہاتھ میں لیے آتی جاتی کشتیوں میں بیٹھے لوگوں کو اس تاریخی پس منظر کے ساتھ اپنے کیمرے میں بند کر رہا ہے۔ لیکن

یہاں پر لوگ ایک دوسرے کو وِیو نہیں کرتے۔ وہ دوسروں کی طرف دیکھ کر مسکراتے بھی نہیں ہم سب یہاں اجنبی ہیں اور اجنبی ہی رہیں گے۔ لیمپیرس کے وکٹوریہ ہوٹل کی سیڑھیوں یا ڈائنگ ہال کی طرح یہاں ہمیں گڈ ڈے یا گڈ مارننگ نہیں کہتا۔ ہم سب اپنے اپنے خول کے اندر بند ہیں۔ ہماری طرف کوئی کبھی مسکرا کر نہیں دیکھتا۔ شاید ویلز میں فطرت کی سادگی تھی اور یہ ذات کا حصار ہے۔ یہاں سب ملرں کے لیے بے حد پڑھے لکھے کچھ کرنے کچھ بننے کی خواہش لیے لوگ ہیں۔ اپنی ذات کی اسیر۔

چند لوگ ٹرینیٹی کالج کے پل پر بھی کھڑے ہیں ہم اس کی محراب ک پیچھے سے بھی گذر گئے ہیں۔ ٹرینیٹی کالج جہاں علامہ اقبال پڑھنے کے لیے آئے تھے۔ وہ ان سر دراہداریوں میں دوسرے غیر ملکی طالب علموں کے ساتھ گھومتے ہوں گے۔ ان خوبصورتیوں نے انہیں مسحور کیا ہو گا۔ نہ جانے فطرت کی تعریف کرتے ہوئے وہ انہی مناظر کی یاد میں کھڑے ہوں گے۔ ان کے دل میں بھی علمی نقاط نئے افقوں کی نشان دہی کرتے ہوں گے۔ اور پھر شاید وہ اسی کشتی میں بیٹھ کر اس درخت کے پاس سے گذرے ہوں گے جس کی ایک جھکی شاخ دراۓ کم کے مونگیا پانی پر جھکی ہوئی ہے۔ انہوں نے میری طرح اوپر کی بلند کھڑکیوں کے جھروکوں کی طرف دیکھا ہوگا۔ کسی نے انہیں دیو کیا ہو گا۔ لکن مجھے یہاں کوئی نہیں جانتا۔ نہ سائرہ ہاشمی کے طور پر اور نہ مسز یعقوب خان کے طور پر پورے شہر میں مجھے سوائے لینڈ لیڈی کے اور کسی نے دیو نہی کیا۔ ایک تھکے ہوئے مسافر کی طرف توجہ دینے کے لیے ان کے پاس کوئی فالتو لمحہ نہیں۔ وہ انسانوں کی بجائے خیالات و تصورات میں دلچسپی لیتے ہیں۔ خیالات جو انسانوں سے بلند تر اور ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

نیو ٹرینیٹی کے پل کے پاس کشتیاں زنجیروں سے بندھی پانی پر ہولے ہولے ہچکولے

لے رہی ہیں۔ ان کشتیوں پر لاہور کے نیو کیمپس کی نہر میں پڑی کشتیوں کی طرح صرف طالب علم سوار ہو سکتے ہیں۔ کشتیاں مختلف ہالز کے نام منسوب ہیں۔

کشتی چل رہی ہے۔ پانی چل رہا ہے۔ سورج دبیز گھاس کے تختوں پر روشن ہو رہا ہے۔ سورج کی تمازت سے گرم ہوتی ہوا لطف دے رہی ہے۔ ویپنگ ولز کی شاخیں پانی میں اندر تک جھکی ہوئی ہیں۔ وصال کے لمحے محبت کے انداز تجدید وفا یا صرف آنسو ہی آنسو۔

بائیں جانب کنگز چیپل ہے اور ہم کنگز چیپل کے پل کو پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ یہ عمارت پہلے سال کے طالب علموں کا ہوسٹل ہے۔ کشتی کے ملاح کی زبان چل رہی ہے اور یہ...... یہ میتھمیٹیکل پل ہے...... کیا مطلب میں بے اختیار پوچھتی ہوں شہتیروں کا پل جن کو خاص انداز سے رکھا گیا ہے۔ سب شہتیر بالکل سیدھے ہیں اور ان سیدھے رکھے شہتیروں نے پل کو نہ جانے وقت کی کتنی تند و تیز آندھیوں سے بچایا ہوگا اور اقلیدس کا حوالہ بنا ہوگا۔ سٹوڈنٹ اسے دیکھنے آئے ہوں گے۔ سیدھی لائنیں زاویے ٹرائنگل...... مربع...... کائنات بھی تو خدائی کی عقل اور علم کا مظہر ہے۔ اور خدا فرماتے ہیں دیکھو میں نے آسمان کو چاند ستاروں سے مزین کیا اور وہ معلق ہیں...... اور خدا سب سے بڑا حساب دان ہے۔ سورج...... چاند...... ستارے...... سیارے...... موسم...... سب حساب سے چمکتے ہیں...... اپنے اپنے دائروں کے اندر ایک دوسرے سے ٹراڑے بغیر ایک پل بالکل عام سا لگتا ہے......

ویپنگ ولوز جھکے ہوئے ہیں۔ مرغابیاں تیر رہی ہیں تاریخی عمارتیں سنجیدہ اور گھمبیر چہروں کے ساتھ وہ رویہ خاموش کھڑی ہیں۔ پانی کی شاخیں دائیں بائیں گھنے درختوں کے سایوں سے گذر کر چھوٹے چھوٹے پلوں کو عبور کرتی نا جانے کہاں جا رہی ہیں۔ ہماری لمبی کشتی

ان چھوٹی نہروں میں داخل نہیں ہوسکتی۔ہمیں دریا کی سیدھ میں ہی چلنا ہے۔

کوئینز کالج کی نئی عمارت کی روشنیاں ہمیں جاتے دیکھ رہی ہیں۔لیکن دن کی روشنی میں ان کا عکس پانی میں جھلملاہٹ پیدا نہیں کر رہا۔کالج میں تحقیق کے نہ جانے کتنے نقطے حل کئے جا رہے ہوں گے۔نہ جانے کون سے ملک کا طالب علم اپنے وطن کی ترقی کے بارے میں خواب دیکھ رہا ہوگا......اس کے ماں باپ شام کو اسے یاد کر کے اس کے بارے میں پرامید باتیں کرتے ہوں گے۔اس کی ماں اس کی کامیابی کے لیے دعا گو رہتی ہوگی......

اگر خدا ماں نہ بناتا تو کیا ہوتا......اکثر مجھے اپنی امی یاد آتی ہیں ان کے محبت اور مامتا بھرے لمس میرے وجود میں جاگنے لگتے ہیں اور میرا دل خدا سے گلہ کرنے لگتا ہے وہ کچھ دیر اور بھی تو زندہ رہ سکتی تھیں۔میں جانتی ہوں موت اٹل اور اس کا وقت مقرر ہے یہ جانتے ہوئے بھی میری ماں کی کمی مجھے عجیب طریقے سے اکیلا اور دکھی کر دیتی ہے میں تو خود ماں ہوں......اور سوائے خدا کو کون ہمیں زندہ رکھ سکتا ہے۔ان کی یاد میری آنکھوں میں ہمیشہ آنسو بن جاتی ہے۔میں جانتی ہوں مائیں دعا کرتی ہیں۔محبت کرتی ہیں......اور اولاد کی کامیابیوں میں سرشار رہتی ہیں۔اور یہاں کیمبرج میں آنے والے طالب علم اپنی زندگی کی راہ متعین کر کے مشکلوں کو سر کر کے اور راستوں کو ہموار کر کے ہی پہنچتے ہیں۔اور ان میں ان کی ماں کی دعائیں ضرور شامل ہوں گی۔

یہ کالج ابھی زمانہ حال ہے۔اس کا کوئی ماضی نہیں۔لیکن یہ کیمبرج کے تاریخی شہر میں ہے بس یہی اس کے لیے کافی ہے۔

ایک نیا پل میرے سر پر سے گزر گیا ہماری سیر کا آخری پڑاؤ اس کے کنارے اینکر با اور ویٹ بریڈ کے سنہری بورڈ نظر آ رہے ہیں چند سفید بڑی بڑی بطخیں میزوں پر کافی یا شراب

پینے والوں کے پاس پانی پر امید بھری نظریں کیئے ساکت ہوگئی ہیں۔ کچھ ہمارے لیے بھی اے نو جوان...... اے حسینہ...... خدا تمہارا بھلا کرے گا...... میں انہیں دیکھ رہی ہوں...... پانی تیزی سے ننھی سی آبشار کی صورت میں اوپر سے گر رہا ہے۔ ''خطرہ'' سرخ بورڈ پر لکھا ہوا ہے۔ کم دریا کی اوپر کی بلند سطح کا پانی جھاگ بناتا نیچے حصے میں گر رہا ہے۔ کشتی اوپر نہیں جا سکتی۔ ہمیں واپس مڑنا ہے۔ ہماری کشتی نیم دائرہ بناتی مڑ گئی ہے زیر سطح روئیدگی سے پانی کے گندا ہونے کا احساس ہو رہا ہے۔

ہم سفید آگے بڑھی کھڑکیوں والی سفید عمارت کے پاس سے پلٹ رہے ہیں۔ زندگی کے گذرے لمحوں میں واپس مڑنا کشتی کے مڑنے کی طرح ہی آسان ہوتا تو میں بھی یہاں ایک طالب علم بن کر آتی۔ دوسروں کی طرح میری جوتی کی ایڑیوں کی کھٹ کھٹ بھی ان سڑکوں پر سنائی دیتی۔ میں بھی ساتھی لڑکیوں کے ساتھ ہنستی کھیلتی چھوٹے سے بیگ کو کندھے پر لٹکائے کسی ہوسٹل کے کمرے میں داخل ہو کر بستر پر گر پڑتی......

ہوسٹل کی زندگی کی اپنی ہی خوبصورتی اور کشش ہوتی ہے یہاں ہر کوئی اکیلا اکائی میں ڈھل کر اپنی خامیوں اور خوبیوں سے آگاہ ہوتا ہے۔ دوستیاں استوار ہوتیں اور اندر کی تفرتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ راتوں کو بہن بھائیوں کے چہرے خوابوں میں آپ کو گھیر لیتے ہیں اور ماں باپ سے دوری کبھی کبھار آنسو بن کر پلکوں پر اٹک جاتی ہے یہ ساری جدائیاں اور تنہائیاں آپ کو زیادہ عقلمند اور باشعور بنا دیتی ہیں۔ آپ بھی وقت کی کسوٹی پر کسے جاتے ہیں اور حالات آپ کی ذات کے سونے کو لوہے سے الگ کر دیتے ہیں۔

ایک جوان آدمی مچھلی کا کانٹا پانی میں ڈالے خاموش بیٹھا ہوا ہے کیا دریائے کم میں مچھلیاں بھی ہیں میں نے ملاح کو مخاطب کر کے پوچھا ہے۔ ''یس......'' وہ بڑے وثوق سے

بولا......لیکن پچھلے چالیس منٹ میں مجھے تو ایک بھی نظر نہیں آئی۔ جس طرح عمارتیں انسانوں سے خالی لگتی ہیں لیکن ان میں ساری دنیا کے ملکوں کے لوگ ہوتے ہیں اسی طرح یہ پانی بھی جو بظاہر مچھلیوں سے تہی لگتا ہے۔ یقیناً تہہ میں مچھلیوں کی ایک دنیا آباد کیے ہوگا۔

میں نے پانی کے اندر غور سے دیکھا اور غیر یقینی انداز میں سر ہلایا۔ مجھے کوئی مچھلی نظر نہیں آرہی تھی۔

سورج ایک لمحہ کو میرے چہرے پر چمکا اور غائب ہو گیا لکین سورج تو ساتھ ساتھ ہی کشتی میں بیٹھی لڑکیوں کے چہروں میں ڈھل گئی ہے لڑکوں کی آنکھوں میں روشن ہے۔ ان کے دلوں میں جاگزیں ہو رہا ہے ان کی امیدوں کی صورت اختیار کیئے ہوئے ہے وہ سب سورج جیسی تمازت بھیری ہنسی ہنس رہے ہیں۔

ملاح کشتی کو تیز تیز چلا رہے ہے بانس ڈوبتا ہے پھر نکلتا ہے پھر ڈوبتلا ہے اسے پینتالیس منٹ میں اس چکر کو پورا کرنا تھا لیکن یہ چکر دائرہ نہیں بلکہ نیم دائرہ ہے دریائے کم کی اوپر کی بلند سطح تو ہم نے دیکھی ہی نہیں ہم تاریخ کے ادوار کا مطالعہ کر کے حال میں واپس آگئے ہیں بھوک کو مٹانے کے لیے ایک ریسٹوران میں بیٹھی سوپ کے ساتھ بن کھا رہی ہوں۔ میرے ارد گرد کی

بیٹھ



پہنچانے کے لیے لگن ضروری ہے میرے اندر یقیناً جرمن زبان کے لیے کوئی لگن نہیں ہو گی یا کمی ہو گی۔

علمی لگن کی کمی کی اس وبا کو روکنا کتنا ضروری ہے تعلیم ذہنی بالیدگی کے لیے مینارہ نور ہے۔اور ہمارے ملک میں خواندگی کی سطح انیس سو سنتالیس سے بھی کم ہو گئی ہے ہائے افسوس......وائے افسوس......۔

ہمیشہ کی طرح چھ بج چکے ہیں شہر سونا ہو گیا ہے تجارتی مراکز بند ہو چکے ہیں سٹوڈنٹ اپنے ٹھکانوں پر تیز سائیکل چلاتے بھاگ رہے ہیں۔گاڑیوں میں بیٹھے سنجیدہ چہروں والے پروفیسر استاد عورتیں اور مرد بسوں کے انتظار میں کھڑی گھریلو عورتیں ہاتھوں میں برگر پکڑے کھاتی دراز قد سینوریٹائیں اگریز میڈ میں یادوں کے بوجھ سے بھاری دل لیے ایشیائی لڑکا۔اس لڑکے کو میں پچھلے دو دنوں میں کئی بار دیکھ چکی ہوں۔وہ کھویا کھویا اور اداس لگ رہا ہے۔وہ میرے بیٹے کے برابر ہے اور میرا جی چاہتا ہے کہ آگے بڑھ کر اس کی اداسی کا سبب پوچھوں۔لیکن وہ بغیر کسی طرف دیکھے آگے بڑھ گیا ہے۔وہ اکیلا ہے میں اکیلی ہوں ہو سکتا ہے وہ میری طرح پاکستانی ہی ہو۔ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں ہمیں وطن میں غیر لوگوں کے ساتھ باتیں کرنا پسند نہیں یہاں بھی ہماری جھجک قائم رہتی ہے۔

ابھی تو دن باقی ہے روشنی درختوں کے اوپر بڑی جاندار اور واضح ہے نہ جانے یہاں کے لوگ سرِ شام گھروں میں گھس کر کیا کرتے ہوں گے کیا راتیں لمبی نہ ہو جاتی ہوں گی۔لیکن ان کے اپنے اصول ہیں یہ زندگی سے لطف اٹھاتے ہیں گھریلو زندگی میں دلچسپی لیتے ہیں بیویوں کو وقت دیتے ہیں محبوباؤں کی دوسراتھ میں خوش ہوتے ہیں......اور اپنے شعور کو بڑھانے کے لیے ٹیلی ویژن کا خبروں والا چینل کھولے رکھتے ہیں۔انہیں بیکاری میں الاؤنس ملتا ہے بیماری

میں ڈاکٹر کی توجہ اور نوکری کرتے ہوئے معقول تنخواہ اور ہم ہماری ساری زندگی محنت کرنے روٹی کمانے میں گذر جاتی ہے بازار رات کے دس بجے تک کھلے رہتے ہیں اور دکانداروں کی بیویوں کی آنکھیں نیند سے بھری ہو جاتی ہیں دل اس دکھ سے کہ شوہر کو دوسرا تھ ان کے مقدر میں نہیں۔ تب زندگی سب کے لیے مشکل بن جاتی ہے۔

ہمیں واپس جانے کی کوئی جلدی نہیں دریائے کم کی اوپر کی سطح کا نظارہ کرنا بھی ضروری ہے اور پھر ہمارا کوئی بھی تو منتظر نہیں...... بندھنوں سے آزاد وجود بڑا ہلکا پھلکا رہا ہے...... جیسے دیواروں کی قید سے آزاد بنجارا...... دریائے کم کے اوپر کی سطح کے پل پر سے ہو کر ہم آگے بڑھیں گے...... شام اکیلی درختوں کی شاخوں پر بیٹھی آنکھیں جھپک رہی ہے...... نہیں تمہاری آنکھیں تو بہت دیر کھلی رہیں گی...... اور میں اس دریا کے ساتھ ساتھ چلوں گی کیا تم میرے ساتھ آؤ گی...... شام اقرار میں سرہلا رہی ہے پل کی دیواروں پر لڑکا لڑکی بیٹھے ایک دوسرے کو انجوائے کر رہے ہیں پل پر سے گذرتی کچی عمروں کی لڑکیاں کالج کے سٹوڈنٹ پروفیسر وہ سب سے بےخبر ایک دوسرے میں کھڑے ہوئے ہیں...... لڑکے کے کان میں بالی ہے لندن میں میں نے اکثر لڑکوں کے کانوں می تین تین چار چار بالیاں دیکھی ہیں۔

ایک دو نے تو ناک بھی چھدوائے ہوئے تھے...... اللہ ہو غنی...... وہ میری طرف بھی نہیں دیکھ رہے حالانکہ میں نے چہرے کو خاصا ناگوار بنایا ہوا ہے۔ آخر کوئی حد ہوتی ہے۔ دن ان پر اتنا بھاری ہے تو رات کیا غضب ڈھائے گی...... میں آگے بڑھ گئی ہوں۔ دریائے کم کی اوپر کی سطح کا پانی شام کی ملگجی روشنی میں بڑا پرسکون لگ رہا ہے۔ دریا مڑتا جا رہا ہے۔ میں مڑتی جا رہی ہوں اف آخر سڑک آ ہی گئی۔...... دیکھتے ہیں یہ سڑک کہاں مڑتی ہے آؤ چلیں...... وہ جگہ بھی دیکھ لیں گے، لیکن سڑک ختم ہونے میں نہیں آ رہی ہمیں بس سٹاپ تک پہنچنا ہے۔ بادل

گھر کر آ رہے ہیں شام کی سیاہی میں اندھیرا شامل ہوتا جا رہا ہے صبح نو بجے سے شام سات بجے تک یعنی پورے دس گھنٹے...... میں اپنی ٹانگوں کو گھسیٹ رہی ہوں...... مجھے اپنے آپ پر غصہ آ رہا ہے۔ یہ میری عمر کا ایسا حصہ تو نہیں تھا کہ میں گھر کی آرام دہ اور پرسکون زندگی کو چھوڑ کر غیر ملکی سڑکوں کو ماپتی پھرتی ہوں...... بارش پھوار کی صورت میں گر رہی ہے میں چھتری تانے چلی جا رہی ہوں...... میں بے حد تھک چکی ہوں مجھے کہیں نا کہیں آرام کرنا چاہیے گرم کافی یا چائے کی شدید خواہش میرے تھکے وجود کو اپنے نرم ہاتھوں سے تھپتھپائے گی تو شاید میں چلنے کے قابل ہو سکوں۔ کیا میں بوڑھی ہو چکی ہوں...... ہاں مشرقی عورت کی طرح مجھے اپنا تیس سالہ وجود بھی بوڑھا لگتا تھا میں صرف ایک ماں تھی اور ماں کبھی جوان نہیں ہوتی چاہے وہ بیس سالہ ہی ہو اور اب تو میں اسے تیس سالہ بوڑھی عورت کو پندرہ بیس برس پیچھے چھوڑ آئی ہوں...... یعنی...... دل اپنی عمر کو سوچ کر رنجیدہ ہو جاتا ہے یعنی اب ہم ڈھلوان کی طرف کھسک رہے ہیں نیچے موت کی گہری کھائی ہے...... نا جانے کس وقت ہمارے قدم اس میں اتر جائیں......

زیادہ تر کافی بارز بند ہو چکی ہیں۔ ان کا چلتا کاروبار طالب علموں کی چھٹی کے ساتھ ہی بند ہو جاتا ہے یہ سارا شہر طالب علموں اور استادوں کے دم سے آباد ہے۔ ساری رونق ہی وہ ہیں چھٹیوں کے دنوں یہاں کی رنق لٹ جاتی ہے صرف مقامی لوگ ہی رہ جاتے ہیں میں کافی بار کی تلاش میں چل رہی ہوں...... ارے یہ بورڈ بھی تک باہر ہی پڑا ہے۔

بورڈ پڑھ کر سیڑھیوں سے اتر کر ہم نچی منزل کے چھوٹے سے کمارے میں بیٹھ گئے ہیں وہاں کل آٹھ میزیں رکھی ہوئی ہیں کانوں میں لمبا سا بندا پہنے ایک لڑکا کاؤنٹر پر کھڑا ہے۔ گے بوائے...... شاید...... یا صرف فیشن......

"دو کپ کافی اور دو براؤنی"...... میں سر گھما کر سب طرف دکھتی ہوں اوہ...... بڑی

رومینٹک جگہ ہے میں نے اونچی آواز میں اردو میں کہا ہے یہاں اردو سمجھنے والا کوئی نہیں......دو میزوں پر لڑکا لڑکی بیٹھے چائے کی پیالی پر ایک دوسرے سے واقفیت حاصل کر رہے ہیں۔ کیونکہ کیمبرج کا لینگویج سیشن شروع ہو گیا ہے۔نئی دوستیاں نئی محبتیں استوار کرنے کا موسم......

ایک فرانسیسی لڑکی جرمن لڑکے سے کہہ رہی ہے" اور پھر میری ماں چائنا ٹاؤن چلی گئی ......میں پیرس میں انگلش زبان پڑھاتی ہوں اور اب ایڈوانس پڑھائی کے لیے یہاں آئی ہوں" جاپانی لڑکا مسکراتے ہوئے دبی آواز میں نہ جانے کیا کہہ رہا ہے میں کان کھڑے کرتی ہوں......آخر مجھے سفرنامہ لکھنے کے لیے کرداروں کی ضرورت تو ہوگی......

ہاں......سامنے کی میز پر بیٹھی لڑکی نازک اور کم عمر ہے میں افسانہ نگار ہونے کے ناطے زندہ کرداروں میں دلچسپی لینا اپنا حق سمجھتی ہوں وہ یقیناً میرے سفرنامہ میں ضرور جگہ پائیں گے۔میں ان سے بے خبر نہیں رہ سکتی ارے وہ قصبہ......وہ قصبہ تو ہمارے قصبے کے برابر ہی ہے اور سنو ابھی میں صرف بائیس برس کی ہی تو ہوں اور مجھے بہت کچھ کرنا ہے واپس جا کر مجھے پڑھانا ہے......اور میرے پاس شادی کا وقت نہیں......شادی کی ضرورت بھی کیا ہے......۔

میں کافی کا انتظار کر رہی ہوں......لیکن پہلے آنے والے پہلے سرو کیے جاتے ہیں دوسروں کے میز پر کافی سے بھاپ اٹھ رہی ہے مجھے اپنے جسم کی تھکاوٹ پھر یاد آ گئی ہے۔ڈیم وومائی کیریکٹرز میں بڑی رغبت سے براؤنی کھا رہی ہوں چاکلیٹ کیک کا ٹکڑا جو صرف پچاس پینی کا ہے......لیعنی اوہ......اوہ......ڈیم چیپ انسانی ذہن میں حالات کے مطابق ڈھلنے کی بڑی صلاحیت ہے اگر ایسا نہ ہو پاتا تو نہ جانے کتنے زندہ انسان خودکشی کیا کرتے۔

میں براؤنی ختم کر چکی ہوں خون میں گرم بھاپ دیتی کافی دوڑ رہی ہے......میر جسم

دوبارہ زندہ ہو رہا ہے...... میں پھر کرداروں کی طرف توجہ دینے لگی ہوں جوان جوڑے جا چکے

ہیں صرف دو خواتین پروفیسرز الگ الگ میزوں پر بیٹی آہستہ آہستہ کھاتے ہوئے ٹائپ کئے

کاغذوں کی موٹی فائل کی توجہ سے پڑھنے میں مصروف ہیں یہ نہیں جانتیں کہ میں ان کا ذکر سفر

نامے میں کرنے والی ہوں۔ اس طرح نہ جانے کتنے لوگ کہانیوں کا حصہ بن جاتے ہیں لیکن وہ

اس بات سے کبھی آگاہ نہیں ہو پاتے۔ اور انہیں یہ بتانا کتنا مشکل ہے کہ اے اکیلی بیٹھی پردیسی

خاتون تمہیں میرا شکرگزار ہونا چاہیے کہ میں جو پاکستانی ادیبہ ہوں تم پر کرم کرنے والی

ہوں...... شاید یہ بات ہم دونوں کے لیے ہی اہم نہ ہو شاید میں ان کا ذکر بھی نہ کروں صرف ان

جوڑوں کا ذکر کروں جو اس چھوٹے سے کافی بار میں اپنی اجنبیت کو دور کرنے کے لیے ایک ہی

میز پر بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ ان کو بھی اس بات کی شاید پرواہ بھی نہ ہو اور اس جوان خوبصورت

لڑکی کو بھی کیا فرق پڑے گا جو چھوٹے سے بچے کو اپنے پیچھے باندھے ہوئے سنہری بالوں کی دو

چٹیاں بنائے سیاہ سایہ پہنے جس سے اس کی سفید ٹانگیں جھلکتی ہوئی اور بھی خوبصورت لگ رہی

تھیں چلی جا رہی تھی پتے اگر رہے تھے یخ ہوا اور درختوں سے الجھ رہی تھی اور سڑکیں سنسان ہو

رہی تھیں شاید بچے کا باپ اس کا ساتھ دینے کے لیے کبھی اسی سڑک پر اس کے ساتھ ساتھ چلے یا

شاید وہ اس خوبصورت معصوم روح کو اپنانے سے بھی منکر ہو جائے۔ مجھے اس کے لیے دعا کرنی

چاہیے ویسی دعا جو مائیں بچوں کی بہتری کے لیے کرتی ہیں وہ بچے اور سفری بیگ کے ساتھ

یقیناً اس شہر میں اکیلی ہی آئی تھی۔ اجنبی شہر میں اکیلا ہونا کتنی دکھ بھری بات ہے۔ اس نے

باریک کپڑے کا سایہ پہنا ہوا تھا اور ہوائیں سرد تھیں اور اس کی دو سنہری چٹیاں بڑی اچھی لگ

رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر بھولپن تھا...... لیکن اس نے اپنا یہ بھولپن لمحاتی لذتوں کے

ہاتھوں پامال ہونے دیا...... آزادی کا مزہ چکھنے کے لیے اسے یہ کڑوا گھونٹ پینا پڑا...... اور یہ بچہ

وہ کم عمر معصوم چہرے والی ماں......اور خدا......اور میں......میں بھی ایک ماں ہوں۔

بارش شہر کو ایک بار پھر بھگو کر غائب ہو چکی ہے۔اب میں دوبارہ چل سکتی ہوں۔موڑوں پر مڑتے بند دکانوں میں جھانکتے دیکھے ہوئے کالجوں کے بند گیٹوں پر نگاہ ماتے ہوئے میں بس سٹاپ پر آ کر کھڑی ہو گئی ہوں بس ابھی تک نہیں آئی۔"کل کے لیے خدا حافظ۔پھر ملیں گے اگر خدا لایا"......لیکن انہیں خدا کی زیادہ پرواہ نہیں یہ تو ہم مشرقی لوگوں کا المیہ ہے۔"رات تمہارے بغیر لمبی ہو جائے گی مجھے تمہاری یاد آئے گی......آؤ آخری بوسہ ایک دوسرے کے لبوں پر ثبت کریں اور پھر جدا ہو جائیں۔"میں ان کی موجودگی سے بالکل لاپرواہ ہو چکی ہوں......

پڑاؤ......منزل عافیت......رات کا اندھیرا کل رات کی طرح ہی کھڑکی سے لگا مجھے دیکھ رہا ہے میں اپنے نرم بستر میں لیٹی سیدھا اس کی آنکھوں میں جھانکوں گی اور کہوں گی......میں تم سے خوف زدہ نہیں کیونکہ میں جیسے ہی سو جاؤں گی۔فاصلے سمٹ جائیں گے اور میں جو کیس دنوں سے اپنوں سے دور ہوں۔ہر عمر میں خواب دیکھے جا سکتے ہیں بات اتنی سی ہے کہ خواب آپ کی مرضی کے ہوں میں نیند کی خواہش میں بند کر لیتی ہوں لیکن نیند نہیں آ رہی مجھے سو جانا چاہیے میں کروٹیں بدل رہی ہوں مجھے خواب میں اپنے گھر پہنچنا ہے۔رات گذر رہی ہے......

چھ تاریخ کا سورج ابھی تک پیچھے چھپا ہے اور ابر آلود دن کھڑکی کے شیشوں سے لگا مجھے جگا رہا ہے آج میں باہر نہیں جاؤں گی میں اس اجنبی لیکن مانوس شہر کے ایک کمرے میں چپ چاپ بیٹی رہوں گی اجنبی ملک میں شہروں گلیوں اور لوگوں کو دیکھ کر میرے اندر کوئی نئی روشنی کوئی بہتر شعور بیدار ہوا ہے یا نہیں میں آج اپنا تجزیہ کروں گی میں ایسے کئی لوگوں سے مل چکی ہوں جو ہر برس مختلف ملکوں کی سیر کرتے ہیں وہ صرف اتنا بتا کر کہ وہ فلاں ملک کی سیر کو گئے تھے اپنی فخر

سے تنی گردن کو کچھ اور اونچا اٹھا لیتے ہیں ان کے پاس اس بات کا تصور ہی کافی ہے کہ وہ امیر ہیں دوسروں سے الگ اور منفرد ہیں وہ ہر برس باہر جا سکتے ہیں اور روپیہ خرچ کرنے کے لیے ان کی جیبیں بھاری ہیں...... اس کے بعد ان کے اندر کا خود پسند انسان صرف اپنے اندر جھانکنے لگتا ہے دوسرے انہیں نظر ہی نہیں آتے وہ کہنے لگتے ہیں ہماری طاقت کا اندازہ کرو ہماری عزت کرو ہمارے سامنے جھکو اور پھر وہ اپنے ملک کی برائیاں اور دوسرے ملکوں کی اچھائیاں بیان کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں جیسے ہم فلاں ملک میں تھے فلاں جگہ ٹھہرے تھے پاکستان میں کیا ہے یہاں کے لوگوں میں سوک سینس ہی نہیں...... وہاں سب لوگ اپنی باری کے انتظار میں کیو بناتے ہیں۔ کسی کے معاملات میں دخل نہیں دیتے وغیرہ وغیرہ...... اور یہ باتیں کرتے ہوئے وہ بھول جاتے ہیں کہ انہوں نے ان اچھے لوگوں سے کچھ بھی نہیں سیکھا انہوں نے یہ بھی نہیں سیکھا کہ وہ اپنے بارے میں شیخیاں نہیں بھگارتے دوسروں کو ناجائز طور پر مرعوب کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اپنے ملک کی برائیاں نہیں کرتے اور یہ کہ وہ خاصے محبِ وطن ہوتے ہیں...... غیر ملکیوں سے ملتے وقت وہ ذاتی شکائتوں کا دفتر نہیں کھول لیتے۔ میں نے دیکھا ہے کہ وہی لوگ جو دوسرے ملکوں میں خاموشی سے قوانین کی پابندی کرتے ہیں کیو میں کھڑے ہوتے ہیں دن رات محنت کر کے پونڈ کماتے ہیں وطن واپس آتے ہی انگریزی بولنے کے بل پر صاحب بن بیٹھتے ہیں اور اپنے گرد جھوٹ کی بڑی خوبصورت داستان بن ڈالتے ہیں جس میں وہ وہ بن ڈالتے ہیں جس میں وہ وہ بن موجود نہیں ہوتے۔

میں چپ رہتی ہوں میں ان سے اب بھی یہ نہیں پوچھوں گی کہ وہاں سے کردار کی اچھائی کا تحفہ کیوں نہیں لائے۔ انہوں نے سیکھا ہوا کیوں نہیں ہورتا اور صرف انگریزی بولنا اتنی بڑی بات نہیں انگریزی ان کی زبان ہے اور وہاں کوڑا کرکٹ اٹھانے والا بھی اسی زبان میں

گفتگو کرتا ہے وہ صرف انگریزی سمجھنے والے خدا پر یقین کرنے لگتے ہیں انہیں وہ خدا بھول جاتا ہے جو ہمارے ملک کی تپتی گلیوں بے علم لوگوں اور جبر تلے دبے لوگوں کا بھی خدا ہے اور ہمیں اسی کا سہارا لینا اور اسی سے بہتری کی دعا کرنا ہے فخر سے گردن اکڑائے پائپ پیتے مرد اور بال بکھرائے حسین بننے کی کوشش کرتی عورت کو آپ دیکھیں تو فوراً سمجھ جائیں کہ موصوف باہر سے ہو کر آئے ہیں۔

آپ ان بالغ نظر باشعور لوگوں کو پہچان ہی نہیں پائیں گے جو وہاں سے ذہنی روشنی حاصل کر کے پلٹتے ہیں وہ شیخی نہیں ماریں گے اور پھر ان کو اتنی فرصت کہاں ہوگی کہ اپنی برتری اور دوسروں کی خامیاں بیان کرتے پھریں وقت قیمتی ہے لمحے محو پرواز ہیں وہ لمحوں کو گرفت میں لینے کے لیے اپنی ساری توانائیاں لگا دیتے ہیں...... میں ایسے چند لوگوں کو جانتی ہوں جو جب وطن واپس پلٹتے ہیں تو اپنے وطن سے محبت اور وفا کرنے کا سبق بھی لے کر آتے ہیں۔ اور وطن کو ایسے ہی لوگوں سے امیدیں ہیں۔

تیز ہوا ہمیشہ کی طرح درختوں کی بلند شاخوں پر جھولا جھولتی پھلوں کی خوشبو سونگھتی سڑکوں پر لوٹ لگاتی سارے شہر میں گھوم رہی ہے سرمئی بادل سورج کے جبر کے سامنے تن کر کھڑے ہیں کھڑکی کے دھندلے شیشوں پر بارش کے قطرے ٹھہرے ہوئے ہیں اور میں نے خبروں میں سنا ہے کہ میرے وطن میں دریا کناروں سے اچھل کر آبادیوں کو تاراج کر رہے ہیں بے بس لوگ پناہ کی تلاش میں گھروں کو چھوڑ کر بلند جگہوں کی تلاش کر رہے ہیں گھر کی وہ چیزیں جن کو جمع کرنے کے لیے انہوں نے انتھک محنت کی پانی کے ریلے میں بہتان کی ملکیت سے دور نکل گئی ہے۔ اور برستی بارش میں ان کی آنکھوں سے بہتے آنسو بھی نظر نہیں آتے زندگی اور سکھ کا مربوط نظام تہہ و بالا ہو گیا ہے۔

کیا کچھ تہہ و بالا ہوتا جا رہا ہے کون ہے جو ہماری جڑوں کو کاٹتا ہمارے ذہنوں کو دوغلاتا ہماری سوچوں کو بے راہ کرتا ہمارے گھر کے اندر باہر پھر رہا ہے ہاتھ نظر نہیں آتے نظریئے نظر نہیں آتے بربادی کا آنے والا ریلا نظر نہیں آتا......ہم خود پسندی اور بے خبری کے دھوئیں میں گھرے ہیں......ہم موجودہ وقت کے ترازو میں اتنے ہلکے کیوں ہیں کہ ہمیں ذرا سا تند جھونکا بے بس کر دیتا ہے ہمیں ایک مضبوط نظام زندگی کو وضع کرنا چاہیے وطن سے محبت کرنے والے لوگ ہراساں ہیں سوال الجھ رہے ہیں جواب ناپید ہیں ماضی گذر گیا مستقبل طلوع نہیں ہو رہا لیکن پاکستانی لوگ پھر بھی اچھے وقتوں کے منتظر رہیں گے کیونکہ اگر ہم نے امید کا دامن چھوڑ دیا تو ہماری سوچ کے لیے کچھ بھی باقی نہ رہے گا۔

مشتاق یوسفی صاحب نے بڑی فکر مندی سے کہا تھا۔

''اس وقت پاکستانی سخت مصیبت کے دوراہے پر کھڑا ہے خزانہ خالی اور خزانے کی حفاظت کرنے والے امیر۔'' ہاں یہاں کوئی کسی کا محاسبہ نہیں کر سکتا کیونکہ ہمارے حاکم ایک ہی حمام میں ننگے ہیں سب شیشے کے گھروں میں رہتے ہیں اس لیے کون سنگباری کرے گا۔

حمام اور ننگے......میں لفظوں کے مطالب پر ہنسنا چاہتی ہوں......لیکن میری عمر کی لاپرواہی کا دور دور چلا گیا......میں سوچوں کی سنجیدگی فکورں کا بھاری پن میرے ذہن کو پریشان کرتا رہتا ہے میرے بچے کہتے ہیں امی آپ بڑی ایموشنل ہیں میرا ڈاکٹر کہتا ہے مسز یعقوب سوچا کم کیجئے......اور میں......میں سچائی کی ڈور کو کسی صورت اپنے ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہتی ۔مجھے بھی اپنی ہی ٹرمز پر جینے کا حق ہے اور میں اپنے حق کو کیوں چھوڑوں......میں بے حس نہیں ہوں......محبت کے بغیر بنجر دل کو لے کر میں کیا کروں گی......دکھ تو اس بات کا ہے کہ لوگ میری سچائی کو سچ ماننے کے لیے تیار نہیں......''تم دوسروں سے الگ نہیں ہو سکتیں'' وہ اپنے اندر کی

نفرت کے چھینٹوں سے میرے وجود کو بھگو ڈالتے ہیں لیکن میں ہار نہیں مانوں گی...... میرا ڈاکٹر میری کسی بھی بیماری کو خواہ کوئی بھی نام دے...... ہاں میں قدرے پریشان ہو جاتی ہوں...... میں ایموشنل کیونکر ہو سکتی ہوں...... اب تو جوار بھاٹا کا وقت نہیں اتار کا وقت ہے جب سمندر بھی کناروں سے دور ہٹ جاتا ہے اور شانتی سے ہموار سطح کے ساتھ بہنے لگتا ہے ...... میں جانتی ہوں میں کسی بھی برائی سے سمجھوتہ نہیں کر سکتی۔ مجھے اپنے ہی ڈھنگ سے جینا ہے اور میں ہمیشہ دوسروں کے ہاتھوں جذباتی زخم کھاتی رہوں گی۔ میری آنکھیں رہیں گی اور دل بھاری پن سے میرے وجود کے اندر تھم سا جائے گا......

اے خدا...... اے خدا...... بارش ہو رہی ہے اور یہاں پاکستانی لوگ ایک دوسرے کی عیب جوئی میں مصروف رہتے ہیں فلاں یہاں تک کیسے پہنچا۔ اس نے کتنی دولت اور کس طرح کمائی، وہ دراصل کون سی نوکری کر رہا ہے اس کی بیوی یا بیٹی سکرٹ پہنتی اور سگریٹ پیتی ہے فلاں فرد کی فلاں گرل فرینڈ ہے...... اور میں سوچتی ہوں...... کیا یہ اپنے دائرے کی گھٹن سے باہر آنا نہیں چاہتے...... ساری رنجشیں تو پونڈز کی تعداد پر ہیں کسی عہدے کی افادیت پر ہیں اپنی کم مائیگی کا افسوس اور دوسرے کی اچھی حالت کا گلہ ہے۔

ایک ادبی جلسے میں حمیدہ معین رضوی بار بار اپنے سر سے سرکتے پلو کو درست کرنے میں جتی ہوئی تھیں میں نے کہا رہنے دیجئے اب تو پاکستان میں بھی عورتیں سر پر پلو نہیں لیتیں...... سر پر پلو کا ہونا یا نہ ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا وہ کہنے لگیں آپ نہیں جانتیں یہاں پر ہمارے لوگ بڑی الٹی سیدھی باتیں بناتے ہیں اور انہوں نے پلو کو بڑی سختی سے اپنے سر کے اوپر جما لیا۔ میں اس بات سے بہت کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی پاکستانی اور ہندوستانی عورت کے چہرے پر بہت ہی کم مسکراہٹ اور طمانیت دیکھی ہے وہ تھکی ہوئی اور انتھک محنت سے نڈھال لگتی ہیں صبح سے

لے کر شام تک انہیں مختلف کام کرنے پڑتے ہیں انہیں اجازت نہیں کہ ہر ماہ اپنے بالوں پر دس پونڈ صرف کر سکیں بہترین کریمیں خرید کر چہرے کی مرجھائی جلد میں تازگی لا سکیں۔ مہنگے جوتے خرید سکیں بہترین کپڑے پہن سکیں یہاں پر زیادہ تر لوگ وہ آتے ہیں جو زندگی کرنے کی تگ و دو میں مصروف ہوتے ہیں معمولی ورکر کاریگر مستر جولا ہے موچی ہاں امیر لوگ ہر جگہ امیر ہوتے ہیں اور انہیں بے وطن ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی لندن میں چند لوگ اچھی نوکریوں پر فائز ہیں اور ان کا طرز زندگی بہت بہتر ہے وہ نچلے طبقے سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتے۔ ان کی گردنوں کی کلف بہت زیادہ اکڑاہٹ پیدا کرتی ہے وہ اپنے آپ کو لارڈز کے برابر جانتے اور اہمیت دیتے ہیں۔

اور یہ کام کرتے فرد اور عورتیں جو انڈر گراؤنڈ ریلویز میں سفر کرتے دور دور کے علاقوں میں رہتے ہیں سچی خوشی سے عاری ہیں بس ان کا بینک بیلنس ہی ان کی مکمل حیات ہے۔

یہاں ہندو اور سکھ کاروباری طبقہ خوب کماتا اور کھاتا ہے......وہ نوازے گئے لوگ ہیں

۔

زندگی یونہی چلتی جائے گی بادل آئیں گے بارش برسے گی سورج کی روشنی ظاہر ہوگی خزاں پتوں کے چہروں سے نامعلوم طور پر زندگی کی ساری تروتازگی چھین لے گی......لیکن......اور یہ لیکن کتنا طاقتور ہے امید کا روشن مینارہ زندگی کا دائرہ کبھی ٹوٹنے نہیں پاتا تیز چلو اور تیز......منزلیں تمہاری منتظر ہیں حیات گاتا گاتی گزر رہی ہے کیمبرج سے پٹیں برگ کو جاتی سفید دھاریوں والی سیاہ سڑک کے دونوں طرف بڑی پر مسرت فراغت سے بازو پھیلائے زمینوں کی ہریاول پر لیٹی ہوئی گنگنا رہی ہے تا حد نظر حل چلائی ہوئی ہموار زمینیں ہیں بڑے بڑے ٹریکٹر چل رہے ہیں زمین کے بالکل کناروں پر جھکا ہوا آسمان اور اس میں اکتوبر کا روشن

چمکیلا سورج دور درختوں سے جھانکتی نوکیلی چھتیں۔ پیٹسبرگ بس اوور ہیڈ برج کے نیچے سے گزر گئی۔ مجھے اسلام آباد یاد آ رہا ہے۔ پاکستان کا خوبصورت ترین شہر ویسا ہی انداز لگتا ہے پنجاب کی وسیع زرعی زمین کو لا کر پٹیس برگ کے اطراف میں بچھا دیا گیا ہے درختوں کے جھنڈ جنگلوں کا سماں پیدا کر رہے ہیں...... سڑک کے دونوں طرف زمین قدرے بلند ہے اور بس اب ایک قصبے کی کیمبرج سٹریٹ سے گزر رہی ہے جس کی ایک دکان پر بورڈ پر سیاہ بھینسا دم اٹھائے کھڑا ہے۔ قصبہ ہمیشہ کی طرح خاموش اور پرسکون بس ایک بس سٹاپ پر رکی ہے سامنے دیوار پر لگی گھڑی میں ساڑھے تین بجے ہیں میں نے اپنی کلائی کی گھڑی کو دیکھا ہے یہی وقت ہوا ہے بس میں بیٹھے آدھ گھنٹہ ہو چکا ہے گاہی ہوئی زمینیں سبز چراگاہیں اور قصبے ایک کے بعد ایک گذرتے جا رہے ہیں لندن سے لے کر کیمبرج تک کا علاقہ بھیڑیں پالنے اور ڈیری فارم کی صنعت کو فروخ دینے کے لیے ہیں لیکن اب پھر وہی زمینیں وہی انداز بھیڑیں پالنے اور ڈیری فارم کی صنعت کو فروغ دینے کے لیے ہیں لیکن اب پھر وہی زمینیں وہی انداز بھیڑیں اور گائیوں کی ریوڑ۔ لیکن ویلز جیسی ترتیب ہر طرف نظر نہیں آتی ایک قصبہ سے گذرتے ہوئے میں نے پہلی بار گھروں کے ساتھ بنے موٹر گیراج دیکھے ہیں حالانکہ لندن اور اس کے مضافات میں موٹریں سڑکوں پر پارک کی جاتی ہیں اور پیٹس برگ کا چھوٹا سا شہر آ گیا۔ بس سٹاپ شیشے کی چھت اور کھڑکیوں پر مشتمل ہے ہمیں صرف آدھ گھنٹہ یہاں رک کر اسی بس پر واپس جانا ہے۔ صرف آدھ گھنٹہ ہم تو کچھ بھی نہیں دیکھ پائیں گے۔ بس سٹاپ سے اوپر جاتی ایک ایکسکلیٹر پر کھڑے میں اوپر جا رہی ہوں۔

اوہ کتنا بڑا اور کتنا خوبصورت شاپنگ سنٹر ہے بالکل کلبرن کے سنٹر کی طرح وہی مشہور سٹور سجاوٹ کا وہی پرکشش طریقہ چکنے فرش قالین والے ویٹنگ انکلوژر ریور گرین پودے اپنی

تازگی اور رنگوں سے نقلی لگتے ہیں سیاہ ٹائلوں والا تالاب جس میں فوارے سفید جھاگ اڑاتا پانی
اگل رہے ہیں دو منزلہ کئی اطراف میں پھیلی ہوء ید کانوں میں صرف جھانکتے جھانکتے ہی وقت
گذر جائے گا اگر اپنی پسند کی کسی چیز کی تلاش کی تو بس چلی جائے گی اور ہمیں یہاں ایک رات
کے لیے کہیں رکنا پڑے گا...... وہ جگہ کرایہ دینا پڑے گا...... ہم تیز تیز سب طرف سے گذرتے
ہوئے دکانوں کو دیکھ رہے ہیں میں بار بار گھڑی کی چلتی سوئیوں کو دیکھ رہی ہوں صرف پانچ
منٹ باقی ہیں...... سیڑھیاں اتر کر نیچے آئے تو ڈرائیور ہمارا منتظر تھا کیونکہ ہم نے ریٹرن ٹکٹ لی
ہوئی تھی وہ مسکرا کر ہمیں خوش آمدید کہتا ہے...... واپسی کا راستہ بس کے پہیوں تلے پیچھے کھسکتا جا
رہا ہے نہر اس کے اندر کھڑی موٹر بوٹ رسٹوران اکا دکا لوگ...... خدا یہاں کی زمینوں اور لوگوں
پر بے حد مہربان لگتا ہے۔ میرے اندر پھر اپنے وطن کے پیچھے رہ جانے کا احساس پیدا ہو رہا ہے
اس نیان لوگوں کو دنیا و جنت جیتے جی دے دیئے اور ہمیں صرف وعدہ حور پر ٹرخا دیا۔ اور یہی خدا
پاکستانیوں کو اتنا مسحور کرتا ہے کہ وہ اپنی ذات اور اپنے وطن کی ذات سے بالکل ہی مکر ہو جاتے
ہیں وہ پاکستانی عورت کی بیکار اور پر آسائش زندگی کا نقشہ بڑے ہی غلط طریقے سے بیان کرتے
ہیں وہ کہتے ہیں "پاکستانی عورت تجی بنی بیکار زندگی زذار دیتی ہے وہاں کوئی کلچر نہیں وہاں مرد بر
خود غلط اور عونت کے مارے ہوئے ہیں۔" اور انہیں وہ اسی فیصد دیہاتی عورت نظر نہیں آتی جو
کھیتوں میں کام کرتی کارخانوں کی نوکریاں کرتی سکولوں کالجوں میں پڑھاتی اور دفتروں میں
اپنے باس کی زیادتیوں کو خاموشی سے سہار کر زندگی کی ذمہ داریوں کو نبھاتی جا رہیں یہ قصہ پرانا
ہے اس لیے بیان کرنا ضروری نہیں...... لیکن ایسی باتس ی وہی لوگ کرتے ہیں جو دولت کی کنجی
سے اپنی ہر ضرورت کے بغیر کسی تردد کے پورا کر لیتے ہیں۔

ان کے پاس اپنے آپ کو باشعور ثابت کرنے کے لیے اور کوئی ذریعہ نہیں۔ اور پھر

جب آپ ان کی انگریزی سنیں گے تو واہ...... واہ کر اٹھیں گے اور یہی ان کا مطمع نظر ہے کردار کا ارتقا حاصل کرنے کے لیے صدیاں چاہیں چند کتابیں یا چند درجن پڑھی ہوئی کتابیں آپ کی انگریزی تو درست کرسکتی ہیں لیکن آپ کا قبلہ درست نہیں کرسکتیں۔ یہ ایمان صرف آپ کی روایات میں اور آپ کو دی ہوئی تعلیم میں ہوسکتا ہے اور یہ دونوں باتیں اب فرسودہ ہیں یہاں کسی پاکستانی کی اس کو اتنی ضرورت نہیں کہ ایمان ایمان کرتا پھرے لیکن اب بڑے لوگ عمر کے بڑے اپنے اور اپنی اولاد کے لیی مذہب اور اس کی تعلیمات کی ضرورت اور افادیت کو محسوس کرنے لگے ہیں وہ مسلمانوں کے بھولے ہوئے اور پیچھے چھوڑے ہوئے خدا کو اپنے آپ سے اور اپنے بچوں سے ملوانا چاہتے ہیں۔ وہ محرم کی مجالس منعقد کرواتے اور میلا دالنبیؐ میں سچے دل اور لگن سے نعتیں پڑھتے ہیں وہ اس بات کو پہچان گئے ہیں کہ اگر انہوں نے بچوں کو اسلامی خدا سے نہ ملوایا اور مذہب کی تعلیم نہ دی تو آنے والی نسلیں غیر مسلم ہوں گی وہ یہاں کی اخلاقی حدود و قیود کی آزادی سے بھی نالاں ہیں یہ تقریبات مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کا سبب بھی بنتی ہیں ان کے اپنے تشخص کا شعور پیدا ہو رہا ہے وطن سے دوری کا دکھ صرف ایک دوسرے کو سچائی سے مل کر دور کیا جاسکتا ہے۔

بس واپس آ کر کیمبرج کے بس سٹاپ پر رک گئی نخ ہوا کے تند جھونکے ہمارا استقبال کر رہے ہیں میرے بالوں کو اڑا رہے ہیں سوتی کپڑوں میں بھی میرا جسم سن ہوتا لگ رہا ہے حالانکہ میں نے سوئیٹر اور کوٹ بھی پہن رکھا ہے میں نے کوٹ کے کالر کو کانوں تک چڑھالیا ہے...... چھ بجنے والے ہیں میں نے کافی کی تلاش میں ہر کافی بار کے اندر جھانکا ہے کوئی بھی کافی بار نہیں کھلا۔ ہر ایک پر دکان بند ہے کا بورڈ آویزاں ہے۔ یہ قوم بھی عجیب اصولوں کی پابند قوم ہے......

ٹھنڈی ہوا تیزی سے زرد پتوں ویران برآمدوں خاموش فٹ پاتھوں اور بند شاپنگ سنٹرز کے اندر آوارہ پھر رہی ہے اکا دکا سٹوڈنٹ تیزی سے سائیکل پر سوار ہوا سے بچنے کے لیے سر کو جھکائے چلا جا رہا ہے اور...... ویسی کھلا ہے زندگی اب قابل برداشت لگ رہی ہے سرد ہوا میں کھڑے میرے اندر جو غریب الوطنی کا احساس جاگ اٹھا تھا گرم ریسٹوران میں میز پر بیٹھے طمانیت کا لبادہ اوڑھ کر چھپ گیا ہے میں پھر سیاح بن گئی وہس جو نامانوس زمینوں پر سفر کرنے کے لیے تیار ہو گیا ہے...... گھر واپس جانا چاہیے...... وہاں یہ کمرہ گھر ہی تو ہے جو رات کے شر سے مجھے اپنی پناہ میں لے لیتا ہے...... آفتوں سے محفوظ کر دیتا ہے۔

بس سٹاپ پر یخ ہوا سے بچنے کے لیے میں نے شاپنگ سنٹر کے سون کے پیچھے پناہ لینی چاہی لیکن یہ ہوا تو ہر طرف سے مجھے گھیر رہی ہے اف خدایا...... اکتوبر کا مہینہ اپنے تیوروں سے بڑا تیکھا لگ رہا ہے...... بس کا انتظار بیکار ہے کام کے اوقات تو کب کے ختم ہو چکے وہ چند مسافروں کے لیے تو بار بار بسیں نہیں چلا سکتے...... ایک آدھ بس آتی جاتی رہے گی...... ہم گھر کی سمت چل پڑے ہیں۔ دکانوں کے اندر رکھی چیزوں کی قیمتیں جانچتے ہوئے اف...... یہ جوگر تو پاکستان میں اس سے آدھی قیمت میں ملتے ہیں اور یہ کاٹن کی دھاری دار قمیض جانچتے جس پر پچپن پونڈ لکھا ہوا ہے ایک سو پاکستانی روپیہ میں آسانی سے آجاتی ہے...... لیکن ہر نظارہ اپنی طرف کھینچتا ہے...... کامیاب تجارت کے گر مجھے دیکھو مجھے خریدو...... میں خوبصورت ہوں۔ تم خوبصورت نظر آنا چاہتے ہو تو رقم کو مت دیکھو...... بڑھو...... آؤ...... آج نہیں تو کل...... ضرور آنا ہے" ...... جہنم میں جاؤ تم سب' میں ہوا کے مخالف تیز چلنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ اور ہارڈی کے کردار میرے ذہن میں گھومنے لگے ہیں جو ہوا کے مخالف رخ...... اپنے دکھوں کا بوجھ اٹھائے چلتے ہیں۔...... میں بھی زندگی کی کہانی کا ایک کردار ہوں' مجھے کائنات کے خالق نے یہاں اس

گھاس کے وسیع لان میں اس لمحہ زمین کے سٹیج پر آنے کا حکم دیا ہے۔ زرد پتے گھوم رہے ہیں ۔ ہوا اور تیز اور ٹھنڈی ہو گئی ہے۔ لان کے سامنے بہت بلند شیشے کی دیواروں والا سوئمنگ پول ہے جہاں جوان لڑکے گرم پانی میں چھلانگیں لگاتے تیر رہے ہیں۔ مائیں اپنے چھوٹے بچوں کو تیرنا سکھانے کے لیے ان کو دیکھتی ہوئی بنچوں پر بیٹھی ہیں۔

زندگی کی ہر خواہش ان کی دسترس میں ہے۔ انہوں نے زندگی کو اپنے قبضے میں کیا ہوا ہے۔

اور یہ رہا وہ گھر جس کے باہر سینیٹیس ایلن سلیج کا بورڈ لگا ہوا ہے۔ جس کی سیڑھیوں کے سامنے کا کمرہ میرا ہے۔ میں اس تک پہنچ گئی ہوں خدا تو عظیم ہے۔ جوتے اتار کر بستر کی گرمی میں گھس کر میں موسم کی ہر سختی سے محفوظ ہو گئی ہوں۔ میں مہربان خدا کی امان میں آ گئی ہوں۔

ہمارا بھی تو ایک تہذیبی اور تعلیمی ورثہ تھا۔ ایسا ورثہ جسے یورپ نے سنبھالا اور اپنے رنگ بھر کر اس سے فائدہ اٹھایا۔ اور آج ہم ہی خوار و زبوں ہیں۔ ہم نے صرف انگلش میوزک سننا سیکھا۔ لیکن ان کی محنت کرنے کی عادت کر نظر انداز کر دیا۔ ہم نے لباس کی نقل کی۔ لیکن لباس پہنے جسموں کے اندر وطن کی محبت اور محنت کی لگن کر قابلِ اعتنا نہ سمجھا۔ ہم ان کی خوبیوں کے ڈھنڈورچی بنے لیکن اپنی وراثت کے اہل بننا گوارا نہ کیا۔ کوئی نقال کبھی بڑا نامور فنکار نہیں کہلاتا۔

میں بھی شاید وہی کچھ کہہ رہی ہوں جس کا شکوہ کر رہی ہوں ...... شاید مجھے بات کہنی نہیں آئی۔ میری دلی آرزو ہے کہ پاکستانی قوم بھی ان جیسی بنے کہ میری جیسی کوئی غیر ملکی ادیبہ وہاں آئے تو اپنی کتاب کے صفحوں پر ہماری بڑائی کا ضرور اعتراف کرے۔ میں نہیں جانتی کہ پاکستانی آنے والے ٹورسٹ اپنے سفرناموں میں کبھی اس ملک کا ذکر بھی کرتے ہیں یا نہیں اور

اگر کرتے ہیں تو کن الفاظ میں کرتے ہیں ہندوستانی ادایب اکثر ہماری محبتوں اور خاطر داریوں کی زنجیروں میں بندھ جاتے ہیں لیکن ان کی آنکھوں میں بڑے سوال ہوتے ہیں...... جن کا جواب ہمارے پاس بھی نہیں ہوتا اور ہم نظریں جھکا لیتے ہیں لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ وطن کی خوبیاں ہماری وطن کی خامیاں ہماری ہم کسی بھی الزام سے خود کو بچا نہیں سکتے...... ہم اس سے وابستہ اور متعلق ہیں ہم جو پاکستانی کہلاتے ہیں...... اس کی نعمتوں کو برتتے اور اسی کی سرزمین پر بستے ہیں اس کی خوبیاں اور خامیاں ہم ہی تو ہیں...... سامان بندھا پڑا ہے وقت گزرتا رہا ہے چاند کا باریک تار جیسا چہرہ بالکل معدوم ہوتا جارہا ہے۔ سوا گھنٹے کے فاصلے پر پھر لندن ہوگا۔ لندن کی زیر زمین ریلیں ہوں گی ہماہمی ہوگی ایڑیوں کی گونج بھاگتے لوگ اور مجھے پھر اسی بھاگ دوڑ کا حصہ بننا پڑے گا میں عاشی کے پیچھے پیچھے چلتی رہوں گی اسے راستے آتے ہیں اور میں ابھی تک راستوں سے بے خبر ہوں۔

آج اردو مرکز میں میرے اور منو بھائی کے ساتھ شام کا اہتمام کیا گیا ہے میں جو اتنے برسوں سے اپنے تصورات وخیالات کو کہانیوں میں ڈھالتی آ رہی ہوں اردو خواں طبقے کے سامنے پرکھ کی کسوٹی پر کسی جاؤں گی۔

تیز ہوائیں مسلسل چل رہی ہیں سورج کی روشنی بار بار ڈوب ابھر رہی ہے۔

الوداع اے کیمبرج۔ اے کیمبرج کی خوبصورت سڑکو۔ اے کیمبرج کے خوبصورت لگن بھرے دلوں والے طالب علمو اے خوبصورت چہرے والی لڑکیو۔ الوداع اے علم کے چراغ کو روشن رکھنے والے ذہنو تم نے مجھے نہ جانا لیکن میں نے اپنی زندگی کے چاردن تمہاری دوسراتھ میں بسر کیے میں تمہیں ہمیشہ یادرکھوں گی الوداع اے کیمبرج کے ٹھہرے ٹھہرے مونگیا پانی والے درائے کم میں نے تمہارے پانیوں میں اپنا عکس دیکھا تمہارے کناروں کے ویپنگ ولوز کو چھوا

اور تمہاری ہواؤں کو اپنے بکھرے بالوں میں محسوس کیا کیمبرج تم خوبصورت ہو کیونکہ تم میں آنے اور رہنے والے لوگ خوبصورتیوں کو تخلیق کرتے ہیں۔ کیا تم میرے لیے دعا گو نہیں ہو گے کہ میں بھی ان خوبصورتیوں کے حصے میں سے کچھ پا سکوں ان کو تخلیق کر سکوں الوداع اے کیمبرج الوداع۔

نئے موسموں کی ہوا گاڑی کے شیشوں سے ٹکراتی ساتھ ساتھ دوڑ رہی ہے نظارے ویسے ہی جاذب نظر ہیں زمینوں کے بطن سے فصل کی کھیتی اگانے والے کسان سرد موسم کے سواگت کے لیے اپنے مویشیوں کے لیے چارے کے بنڈل بنا کر شیڈز میں محفوظ کر چکے ہوں گے ان کے گھروں کے سٹور روم ز اناج کی بوریاں سے اٹ چکے ہوں گے اور وہ زندگی کی سختیوں سے لڑنے کے لیے تمام ہتھیاروں سے لیس ہو کر تیار ہوں گے۔ انہوں نے زمینوں کو ہموار کر کے لمبی سردیوں کی دو سراتھ کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ سفید برف زمینوں کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر ایک طویل بوسہ اس کے لبوں پر ثبت کرے گی محبت جو روح کے اندر تک اترتی کپکپاہٹ کو اپنے شعلہ سے زندہ کر دے گی۔ انسانوں کے درمیان محبت اپنے مقاصد سے محبت محبت کے کتنے رخ ہیں حیات کی یہ ساری رونق محبت کا فروغ ہی تو ہے بارش کے آنسو شیشوں اے ڈھلک کر نہ جانے کہاں گم ہو رہے ہیں وہ جوان لڑکے مسلسل باتیں کیے جا رہے ہیں قہقہے اور مسکراہٹیں لیکن آنے والا وقت جب ان کے کندھوں پر شعور کا بوجھ بن کر اترے گا تو وہ نہ جانے تجربات کے کتنے دریا عبور کر چکے ہوں گے اور پھر کسی دوسرے ہنستے مسکراتے جوان لوگوں کو میر ی طرح خاموشی اور سنجیدگی سے دیکھیں گے۔

زندگی چل رہی ہے گاڑی چل رہی ہے یخ ہوا پلیٹ فارم کی گدلی سطح پر بے کار لفافوں کو اڑاتی چکنے فرش پر سکیٹنگ کر رہی ہے سٹیشن آ گیا...... ایک پڑاؤ...... میں سامان کو اٹھائے گاڑی

میں بیٹھی پرانے مستقر کی طرف جارہی ہوں خاموشی سے سوار ہوتے لوگ اخباریں اور کتابیں پڑھتی آنکھیں سنسان پلیٹ فارم ہجوم میں اکیلے لوگ اور لوگوں میں اکیلا ہجوم۔

ولکم۔یو آر بیک......ویری ویری فائن شاید اس کا نام رابرٹ یا ولیم یا جون ہے......اس نے ہمارا سامان کمرے میں رکھ دیا ہے۔پھر ہمیشہ کی طرح چابی تالے میں گھومتی ہے دروازہ کھلتا ہے اور سرد کمرہ بے مہری سے ہمیں جھانکتا ہے۔

آئی ایم بیک میں دل میں دہراتی ہوں بیک ٹو ویئر یہاں کوئی نہیں جو آگے بڑھ کر میرے تھکے جسم کو اپنی محبت اور چاہت کے نرم ہاتھوں سے دباتے ہوئے میری پیشانی کو میرے بڑے بیٹے ہمایوں کی طرح چومتے ہوئے کہے امی آپ تھک گئی ہوں گی لائیے میں آپ کی ٹانگیں دباؤں......میں اب ان کے دوری کو شدت سے محسوس کرنے لگی ہوں پچیس دن گذر گئے طویل راتیں میری آنکھوں میں چھبنے لگتی ہیں۔کمرہ خاموش ہے میں خاموش ہوں سفر اختتام کو پہنچنے والا ہے۔میں بستر پر بیٹھی بے دلی سے سامان کو دیکھ رہی ہوں ابھی مجھے چھ بجے کے قریب اردو مرکز جانا ہے میں جانتی ہوں لندن میں افسانے کے حوالے سے لوگ مجھے جانتے ہوں گے لیکن دوستی کے حوالے سے ایک بھی نہیں جانتا......اور پھر میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں اپنے ادیب ہونے کو ان پر بوجھ کی طرح لادتی اپنے نام کی گھنٹی گلی گلی بجاتی میں اس مقصد کے لیے آئی ہی نہیں تھی میں بس خدا کی مرضی سے یہاں تک دھکیل دی گئی ہوں میں جانتی ہوں ادیب وہی کہلاتا ہے جسے قاری مانے اور عزت دے ہوسکتا میں پوری اتر آؤں یہاں اردو رسالے اور کتابیں زیادہ تعداد میں نہیں آتیں اور پھر کتابیں مہنگی بھی تو ہیں۔یہاں پولوگ لمبے لمبے فاصلے طے کرتے کریوں پر پہنچتے ہیں۔اور جب تھکے ماندے گھروں کو آتے ہیں تو یقیناً ان کے پاس دوسروں کو جاننے کے لیے وقت نہیں ہوتا......پھر میں کوئی بڑی سرکاری افسر نہیں کہ

میرے پاس فائدہ دینے والا ایک آدھ لفظ ہی ہو۔کوئی آئین نہیں جس میں میں لوگوں کو وہ چہرہ دکھا سکوں جو وہ دیکھنا چاہتے ہیں وہ میرے ساتھ اپنے مقاصد کی کوئی ڈور نہیں باندھ سکتے ۔افتخار عارف صاحب بڑی مرت والے انسان ہیں دوسروں تک ان کا تھوڑا بہت حق پہنچانے والے۔

میں اردو مرکز کی لائبریری میں کھڑی ہوں۔لوگ آرہے ہیں۔کوئی بھی مجھے نہیں پہچانتا ۔جی یہ ہیں سائرہ ہاشمی.......جی......اسلام علیکم۔آداب عرض۔ان کی آنکھوں میں اجنبیت اور ناواقفیت کا اندھیرا چھایا ہوا ہے۔آگے بڑھنے اور باتیں کرنے کے لیے چہرے کا شناسا ہونا بہت ضروری ہے۔اور ہوسکتا ہے ہمارے سیاسی نظریات ہی الگ الگ ہو......اور آج کل پاکستان میں نئے الیکشن بھی ہونے والے ہیں...... مشترکہ موضوع کوئی بھی نہیں۔لوگ آرہے ہیں ۔خواتین اور مرد......منو بھائی امریکہ سے ہوتے ہوئے لندن رکے ہیں۔پاکستان میں وہ بہت سے حوالوں سے جاتے رہتے ہیں۔ڈرامہ نگار۔صحافی۔افسانہ نویس۔کالم نگار......

دعوتی کاغذ پر لکھا ہوا ہے۔''مشہور افسانہ نگار اور ناول نویس سائرہ ہاشمی۔''معلوم نہیں میں اس لفظ کی بھی حقدار ہوں یا نہیں......الفاظ کی تلاش میں مَیں نے اپنی حیات کے ماہ و سال دوسروں کے بارے میں سوچتے کڑی کمان کو تھامے تھامے گزار دیئے۔کیا خبر میری کمان سے نکلا تیر شہرت کی چوٹی تک پہنچتا بھی ہے یا نہیں۔میرے لیے ادب کے ہال میں حیاتِ دوام کی تالیاں ٹیلی ویژن کی سکرین کی مرہونِ منت ہیں۔لوگ زندگی کی تھکی ماندی گاڑی کو رنگین سکرین کے پاس آکر روک دیتے ہیں۔اور پھر نام کا حرف بڑھ کر پھیلتا سکڑتا رہتا ہے ۔ناظرین کی نظریں اس پر جمی رہتی ہیں اور پھر نام کی بو ملکوں ملکوں پھیل کر بین الاقوامیت حاصل کر لیتی ہے۔

میرے نام کے ساتھ اضافی روشنیاں نہیں۔ میں صرف سائرہ ہاشمی ہوں اور کتابیں طاقتوں میں دھری گرد آلود ہو جاتی ہیں۔

گرم موسموں۔ برفی اور چائے کی گرم پیالی کے بعد تقریب شروع ہو چکی ہے۔ افتخار عارف میرا اور منو بھائی کا تعارف کرواتے ہیں۔ اور پھر شعیب تمنا صاحب میرے افسانوں کی "اور وہ کالی ہو گئی" پر تنقیدی مضمون پڑھتے ہیں...... مضمون اچھا ہے لیکن جلدی میں لکھا ہونے کی وجہ سے پوری طرح احاطہ نہیں کر پایا...... اور پھر لوگ تفریح پسند زیادہ اور سنجیدگی کی طرف کم مائل ہیں...... میں خاموش بیٹھی لوگوں کے چہروں کو دیکھ رہی ہوں۔ چہرے پڑھنا بہت مشکل کام ہے ...... اور یہ مشکل کام میں کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہوں...... چہرے ہی تو کردار ہوتے ہیں ...... لیکن آج کل لوگ اپنے کرداریں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں...... میں انہیں افسانہ سنانا چاہتی ہوں...... "پناہ" جس کی ہیروئن بانو گھر کی پختہ دیواروں کی تلاش میں جستجو کے سراب میں بھٹکتی رہتی ہے۔

اور ایک کروڑ سے زیادہ پاکستانی بھی تو غریب الوطنی کی دھول کو پاؤں پر جمائے نہ جانے کون کونسی تنہائیوں کے عذاب برداشت کرتے ہیں۔ پردہ تو صرف وطن کے لوگوں سے ہے۔ یہاں سب ایک دوسرے کے حقیقت شناس ہیں۔ ایک دوسرے سے آنکھیں چرائے، ماضی کو اوٹ میں رکھے، مستقبل کے عذابوں کو چھپائے، پونڈ کو روپے میں بدل کر پاکستانی کرنسی کے بوجھ سے لدے، خود پسندی کی رنگین عینک چڑھائے وطن کے لوگوں کو مرعوب کرنے کی تگ و دو کرتے ہیں۔ آج کی تہذیب روپے کی تہذیب ہے۔ شجرۂ نسب کے الفاظ بوسیدہ ہو کر مٹ چکے ہیں۔ ایشیائی لڑکیاں انگریز شوہر کے بچے کو پرام میں لٹائے سکرٹ پہنے، بالوں کر جھلاتے، ناکدار ایڑھی کر کھٹ کھٹ کرتی بسوں اور ٹرینوں میں آ جا رہی ہوتی ہیں۔ برگر یا ہوٹ ڈرگ

کے اندر کی تہہ کا گوشت سرخ ہے یا کالا ۔ کیا رکھا ہے اس میں ۔ اور شاید خدا کو بھی اس کی زیادہ پرواہ نہ ہو ۔ یہاں کے مسجد کے مولوی بھی پونڈ کی چکا چوند سے آنکھیں خیرہ کیے فرقوں میں بٹ کر قرآن کی تاویلیں اور تشریخ اپنے ہی طریقے سے کرتے ہیں ۔ انفرادی آزادی اجتمائی سوچ کی راہ میں حائل ہو جاتی ہے ۔ اسلام کی بجائے فرقے اہم ہیں ۔

یہاں سب روپیہ تلاش کرتے ہیں ۔ روپیہ جو بہترین لباس کا ضامن ہے ۔ جو خوبصورت ترین گرل فرینڈ مہیا کرتا ہے ۔ جو ہوائی جہاز میں بہترین درجے میں بیٹھا سکتا ہے ۔ آپ اتنی بلندی پر بیٹھ جاتے ہیں کہ لوگوں کی پگڑیاں آپ کی اونچائی کو دیکھتے ہوئی گرنے لگتی ہیں ۔ تو کیا آپ کی ساری تگ و دو اور محنت کا معاوضہ وصول نہیں ہو جاتا ۔ اور پھر فر فر انگریزی ۔ واہ صاحب واہ...... آپ کی لیاقت کا جواب نہیں ۔ اور میں نے دیکھا کہ یہاں رہنے والے پاکستانی اور ہندوستانی لوگ اپنے بچوں کو انگریزی میں باتیں کرتے دیکھ کر سرتاپا احساس تفاخر میں ڈوب جاتے ہیں ۔ اور پھر اس ملک میں گُن ہی گُن ہیں ۔ ان گُنوں کی سچائی کو چیلنج کرنے والا کوئی نہیں ۔ وطن تو بہت دور ہے ۔ یہاں تک آ کر آپ کے بارے میں جاننا ناممکن ۔ شیخی مارنے کے لیے کوئی حد مقرر نہیں...... جتنی چاہے شیخی بگھاڑیئے ۔ چھوٹے سے گھر کو مینشن کہیے ۔ چھوٹی سی نوکری کو اسنگز یکٹو بتایئے ۔ آپ کی انگریزی تمام عیب ڈھانپ لے گی ۔ جس طرح سفید گورا رنگ نقوش کے عیب چھپا لیتا ہے ۔ آخر انگریز ہمارا آقا تھا...... غلامی تو ہماری گھٹی میں پڑی ہوئی ہے ۔ اور اب تو میں بھی گواہ ہوں...... اس لیے ہی تو گُن گا رہا ہوں ۔ میں اگر چند ماہ مزید رہتی تو میری گردن بھی کڑی ہوئی ہوتی اور دل میں مَیں خود کو سجدہ کر رہی ہوتی ۔

لیکن میرا تو یہاں رہنے کو جی نہیں چاہتا ۔ یہاں آ کر انسان اپنی بلندی سے اتنی تیزی سے گرتا ہے کہ جسم کے ساتھ سارے تصورات چور چور ہو جاتے ہیں ۔ یہاں آزادی کی کوئی حد

نہیں۔ باپ کا نام پوچھنا آؤٹ آف فیشن ہو چکا ہے۔ ستر سالہ بڑھیا شوہر کے مرنے کے ایک ماہ بعد ہی اپنے بوائے فرینڈ سے شادی رچالیتی ہیں اور پھر ڈاکٹروں کے چکر لگانے لگتی ہیں...... اور ہمارے ہاں' ہمارے ملک میں تو صاحب ستر سالہ عورت صرف تسبیح کے دانے گننے میں گزار دیتی ہے۔ اسے جنت کی خواہش رات کو بھی جگائے رکھتی ہے۔ اپنے گناہوں سے توبہ' اچھے اجر کی تمنا۔ آنکھوں میں آنسو دل میں دوزخ کا خوف۔ یہ بھی کوئی زندگی ہوئی ......صاحب جواز اور اعتراض خوب......لیکن اللہ نے تو یہی کیا ہے کہ اس نے انسان کو اپنی عبادت کی لیے تخلیق کیا ہے......انسان کو عبادت کرنی چاہیے۔

بے شک میرے وطن میں عیب ہی عیب ہیں اور پھر غیر جمہوری نظام نے ہمارے چہروں کو سیاہ کر دیا ہے۔ لیکن میں پرامید ہوں کی کبھی نا کبھی اچھا وقت آئے گا۔ کب آئے گا۔ کہا نہیں جاسکتا۔

منو بھائی لوگوں کی فرمائش پر اپنی پنجابی کی مشہور نظم سنا رہے ہیں۔

"اجے قیامت نئیں آئی ......" فرح احسن صاحبہ نے اپنی ذاتی محبتوں اور تعلق کے حوالے سے منو بھائی پر بڑا مضمون پڑھا ہے۔ اس تہذیب کے بجھتے دیئے کی آخری لو میں ان میاں بیوی کی زندگی روشن روشن لگ رہی ہے۔ لوگ تالیاں بجا رہے ہیں۔ پھر دوسری پنجابی نظمیں اور غزلیں۔ شاعر میلہ لوٹ رہا ہے۔ ہلکی پھلکی مزاح کی باتیں زندگی کے بوجھ کو کم کر رہی ہے ۔ ہنسنا ہنسانا مرہم ہے۔ اور ہر ہاتھ مسیحا نہیں ہوتا ...... وقت کے گھاؤ رہتے ہیں ...... ہمیں مرہم دو...... لوگوں کی ہنسی کہہ رہی ہے۔ حمیدہ معین رضوی نے محبت سے مجھے گلے لگاتے ہوئے کہا ہے۔

"میں صرف آپ سے ملنے اتنی دور سے آئی ہوں۔ فون پر آپ ملتی ہی نہیں۔ کہاں تھیں

آپ۔ سوچا اگر آج نہ مل سکیں تو افسوس رہے گا۔" اور مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ کسی نے تنہائی کی شاں شاں میں میرے کندھے پر رفاقت کا ہاتھ رکھ دیا ہے۔

لوگ خدا حافظ کہتے سنسان شاہراہوں' بڑے بڑے نیوئن کی روشنیوں میں بکھر گئے ہیں۔ فوڈ ریسٹورانوں میں لوگ بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ میں حمیدہ معین کے ساتھ ساتھ انڈر گراؤنڈ ریلوے سٹیشن کو جا رہی ہوں۔ ہمیں ان کے گھر جانا ہے۔ خلوص کی گرمی تنہا کمرے کی ٹھٹھرتی تنہائی سے ہزار درجہ بہتر ہوگی۔

ریل گاڑی طویل سرنگوں' متعدد پلیٹ فارموں کو پیچھے چھوڑتی جا رہی ہے۔ کھٹا کھٹ ۔آسمان ابر آلود ہے۔ گاڑی کا آخری سٹیشن...... سٹیشن سے مسٹر معین رضوی کی گاڑی میں بیٹھ کر ایک اور لمبا سفر۔ حمیدہ معین کہہ رہی ہے کہ یہ علاقہ نسبتاً کھلا اور خوبصورت ہے۔ مگر یہاں رات گئے سفر کرنا قدرے غیر محفوظ ہے۔ رف ریف کبھی کبھار لوٹتے۔ آبروریزی کرتے ہیں۔ قتل اور اغوا کی واردات بھی ہو ہی جاتی ہے۔ نسلی فساد کے لیے یہ علاقہ خاصا مشہور ہو چکا ہے۔ اس لیے رات کو ہم لوگ سفر نہیں کرتے۔

میرا تصوراتی حفاظت کا نظام تڑاتڑ دھم نیچے گر پڑتا ہے۔ لوگ تو کہتے ہیں یہاں اکیلی عورت بھی محفوظ ہے۔ ہاں ایسا ہوتا کم ہی ہے لیکن حفاظت ضروری ہے۔

میں ایک انگریزی انداز کے مشرقی رکھ رکھاؤ والے گھر میں آ کر بیٹھ گئی ہوں۔ ان کے بچے' میاں اور وہ خود ہماری خاطر داری میں لگ گئے ہیں۔ کھانا گرم کیا جا رہا ہے۔ نان سینکے جا رہے ہیں۔ ان کا بیٹا چائے بنا کر لایا ہے...... ہم سب نے مل کر کھانا کھایا ہے۔ اور پھر صوفہ کم بیڈ پر بیٹھ کر میں اور حمیدہ باتوں میں جٹ گئے ہیں۔ خالص ادب کی باتیں، کتابوں کی مہنگائی اور چھپائی کا قصہ۔ لندن کی زندگی۔ پاکستانیوں کے پرابلمز...... یہاں آنا آسان ہے لیکن

یہاں سے کوشش کے باوجود جانا مشکل ۔یہاں زندہ رہنا قدرے سستا لیکن مرنا بہت ہی مہنگا پڑتا ہے ۔لوگ وطن واپس لوٹ جانے کی خواہش کو دل ہی دل میں لئے زمین کی تاریک تنہائی کی طرف لوٹ جاتے ہیں ۔وطن کے دکھ کی باتیں پریشان کرتی ہیں ۔اپنوں کی فکر جان کھاتی ہے ۔سیاسی اتار چڑھاؤ غیر یقینی کی کیفیت میں ڈال دیتے ہیں ۔اور پھر باہمی رنجش چپقلشیں ۔بی بی سی ریڈیو یہاں کیلوگوں کی خواشیوں اور غمیوں کے ٹمپریچر کو کنٹرول کرتا ہے ۔اور پھر جوان ہوتے بچے'ایک نئی تہذیب کے پروردہ ذہن جو پاکستان جا کر اپنے آپ کو اجنبی محسوس کرتے ہیں ۔اور پھر مسائل ہی مسائل ۔مسائل میں الجھے ذہن ۔بیٹیاں جوان ہو رہی ہیں ۔جسم اور جسم کی تمام ضروریات کر آسانی سی یہاں پورا کیا جا سکتا ہے ۔کوئی روک ٹوک نہیں اور یہ پرانی نسل کو قابل قبول نہیں ۔

میں نے اکثر لوگوں کو پھولوں سے ڈھکے شراب خانوں میں بڑی بڑی شراب کی الٹی بوتلوں سے شراب لے کر بیٹھے پیتے دیکھا ہے ۔سفید چھتریاں' ۔رنگین چھتریاں' ۔کھڑکیوں میں گچھے' ہوا میں جھومتے درخت' شراب سے جھومتے جسم' پونڈوں کی ریزگاری سے بوجھل جیب 'ایک دوسرے میں پیوست ہونٹ' ایک دوسرے کے جسموں سے جکڑے بازو ۔آسمان بادلوں پر جھکا انہیں طویل بوسہ دے رہا ہے ۔رات آنکھیں بند کیے مسکرا رہی ہے زیر زمین گاڑیاں چلتی ہیں ۔گاڑیوں میں بیٹھے لوگ ایک دوسرے سے ہمیشہ اجنبی رہیں گے ۔عریاں تصویر والے رسالے' کھیلوں کی خبریں' طویل سڑکوں کو طے کر کے گھروں کر پہنچنے والے قدموں کی گونج' سرد تاریک کمرے......اور......اور نہ جانے کیا کیا ۔

میں اور حمیدہ باتیں کئے جا رہے ہیں ۔

رات کے گجر نے ڈیڑھ کا گھنٹہ بجایا ہے ۔باہر سڑکوں پر بارش برہن کے آنسوؤں کی

طرح گر رہی ہے۔گلیاں خاموش ہیں۔صرف کمرے جاگتے ہیں جہاں ٹیلی ویژن پر بڑوں کے لیے عریاں فلمیں دکھائی جاتی ہیں اور ان عریاں کرداروں کر دیکھ کر جسم جاگنے لگتے ہیں۔تاریکی آنکھوں میں اتر آتی ہے۔لیکن مجھے ان سب باتوں سے کوئی سروکار نہیں۔مجھے یہاں تو رہنا ہی نہیں۔میں کبھی نہیں چاہوں گی کہ میں اداس آنکھوں' سوجی ہوئی ٹانگوں کے ساتھ ساتھ چلتی ٹوکری کو ہاتھ میں پکڑے اکیلی ہی دکانوں سے زندگی کرنے کا سامان خریدتی پھروں۔میرے واپس جانے کے تین دن باقی ہیں۔چوتھے دن کی صبح ہوائی جہاز کا ایک طول سفر اور پھر لاہور کے ہوائی اڈے پر میرے بچے میرا چہرہ دیکھ کر اطمینان بھرا سانس لیں گے۔میں انہیں گلے لگاؤ ں گی اور وہ پوچھیں گے۔امی سیر کا مزہ آیا۔کیا یہ گزرے دن میرے لیے مٹھاس بن کر اترے ہیں......میں ان سے بہت سی باتیں کروں گی۔بہت کچھ بتاؤں گی۔ان لمحوں کے بارے میں جب میرا دل دکھا......ان لمحون کے بارے میں بھی جب میں نے خوبصورتیوں کو سراہا اور خدا میرے دل کے اندر گھس گیا۔لیکن میرے گھر کی عافیت بھری جنت میرے بازوؤں میں ہو گی لیکن ابھی پورے تین دن باقی ہیں۔اور بارش کی ٹپ ٹپ کھڑکیوں کی سلوں سے گرتے قطرے۔میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی ہیں۔اچھا شب بخیر حمیدہ معین رضوی...... مجھے یہ گھر اپنا اپنا سا لگا ہے...... مجھے بہت اپنائیت کا احساس ہو رہا ہے۔

ناشتہ کے بعد رات کو پھر پلٹ آنے کا وعدہ کر کے میں حمیدہ معین رضوی سے رکست ہو رہی ہوں۔لندن باقی ہے۔میرے دو دن باقی ہیں۔میری ٹانگوں میں دم باقی ہے۔برہن برکھا کے آنسو ابھی تک ٹپک رہے ہیں۔سنسان ریلوے سٹیشن پر سرد جھونکوں کی زد میں کھڑے ہو کر میں دوستی کی مہربان گرمی کو اپنے دل کے اندر دوڑتے محسوس کر رہی ہوں۔

چند مسافر اور جمع ہو گئے ہیں۔انتظار اور بھی لوگ چپ چاپ کھڑے ہیں۔غیر دوستانہ

انداز سے۔ الگ اور دور...... بے خبر اور لا پرواہ...... دوستی کے بھی کتنے رنگ ہیں۔ کوئی چند گھنٹوں میں فاصلہ طے کر لیتا ہے اور کوئی عمروں میں بھی ایک قدم آگے نہیں بڑھ پاتا۔ کوئی مہربانیوں کی بارش برساتا اور کوئی احسان فراموشی کے خون سے دامن کو رنگین بنا دیتا ہے۔ اپنے اندر محبت کی جگمگتی جوت کو کوئی شعلہ بنا کر زمین و آسمان روشن کر ڈالتا ہے اور کوئی پھونک مار کر دل کے پر خلوص اور سچے دیئے کو بجھا دیتا ہے۔ میں نے محبت اور مروت کرنے کا کڑوا پھل بھی چکھا اور دوستی کے مہربان سایوں میں آرام بھی کیا...... انسان کے اندر دوسروں کر سمجھنے اور خلوص دینے کی صلاحیت ہو تو زندگی بری روشن اور اجلی لگتی ہے۔ دوستی کا کھاتا کھولنا پڑتا ہے۔ نفع نقصان سے بالا ہو کر رشتوں کر سنبھالنے والا کبھی گھاٹے میں نہیں رہتا۔

یہاں لندن میں بھی لوگ محبت اور مروت کی جوت جگائے رکھتے ہیں۔ دمڑی کر دانتوں سے نہیں پکڑتے۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آپ کا اپنا کوئی بہن بھائی دمڑی کو دانتوں تلے دبا کر لفظوں کی دوساتھ سے بھی محروم کر دیتا ہے۔ محبت کے پیچھے بھاگتے اور سچائیوں سے منکر ہو جاتے ہیں۔ دوسرون کر کردور کی سیاہی کے پیچھے اوجھل کرنے کے لئے اپنے کردار کی سیاہی کو انجانے میں اپنے چہرے پر مل لیتے ہیں...... جوت جگائے رکھنے والے ہاتھوں کو پیچھے دھکیل دیتے ہیں اور تاریکی دیکھ کر اس لیے خوش ہوتے ہیں کہ کوئی نہ کوئی ضرور ان تاریک راہوں میں مارا جائے گا۔ اس کی چیخ ان کی طمانیت کا سبب بنے گی۔ اور پھر ان کی چیخ بھی کوئی نہیں سنتا ۔وائے افسوس

گاڑی کا ہوٹر ہوک رہا ہے۔ میں نے پہلی بار اتنے دنوں میں گاڑی کی زندگی بھری چیخ سنی ہے۔ ہوا کے جھونکے گاڑی کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ گھر قطار در قطار۔ چھوٹے چھوٹے کچن، گارڈن، خودرو جڑی بوٹیاں۔ گھر کے مالکوں کی فرصت نہیں کہ ان کو اکھاڑ پھینکیں۔ کوڑے

کے بند لفافوں کے ڈھیر۔ بیک یارڈ کی ویرانی۔ اور انسان کے کردار کا بیک یارڈ۔ جنس زدہ سوچیں۔ جسمانی بدبودار لذتیں۔ ہم جنسی کے کلب۔ سیاہ دھواں۔ تاریک روشنیاں۔ پھٹے کپڑے۔ عریاں جسم میں چیلسی کے علاقے میں ہوموز کی ایک بار کے سامنے سے گزری تھی ہچیلسی فنکاروں وادیبوں کی وجہ سے مشہور ہے۔ مشہور مصور وہاں رہتے ہیں۔ اور یہ رہی ہم جنس پرستوں کی بار...... جھاگ اڑاتی بیئر...... تھوک اڑاتے ہونٹ۔ ترقی یافتہ انسانی ذہن کا بیک یارڈ۔ تاریک اور کوڑا کرکٹ سے بھرا ہوا کوئی کسی کو نہیں پوچھتا۔ اپنے میں مگن۔ ویران چہروں پر خون کی گردش رکی ہوئی ہے خوابوں کے تاریک جزیروں میں انسان بھٹک رہے ہیں ۔سیاہ کپڑوں میں ملبوس بالوں کو نئے رنگوں میں رنگوائے' سرمہ سے آنکھیں بنائے] عریانی کرواضح کرتا تنگ باریک ریشمی لباس پہنے لڑکیاں۔ کڑے بج رہے ہیں۔ گردنوں میں پڑی مالائیں جھنجنا رہی ہیں۔ سٹین لیس سٹیل کی بازو بھر چوڑیاں چھنک رہی ہیں۔ اور گاڑھے دھوئیں کی سگریٹیں پیتے نہ جانے وہ کدھر سے جا رہے ہیں۔ جسم کے جہنم زاد سے نشے کے جہنم زاد کی طرف...... انسانی فانی ہے۔ آؤ موج اڑائیں...... ان کو دیکھ کر میں ہر بار ایک طرف ہٹ جاتی ہوں...... ان کی آنکھوں میں کچھ ہے جو آپ کر ڈراتا ہے۔ دوسرے سنجیدہ مزاج لوگ ان سے پیچھے رہ جاتے ہیں...... بظاہر خوشبو میں لپٹے تعفن زدہ لوگ......

اب میں ایک میوزک شاپ میں گھس گئی ہوں۔ دو منزلہ میوزک کی دکان۔ حفاظتی عکس والے آئینے۔ میں چھتری کو ہاتھ میں لیے گھوم رہی ہوں...... لوگوں کو دیکھ رہی ہوں...... یہ جوڑا ضرور کچھ شرارت کرنے کے لیے بار بار اس شیلف کے پاس آکر رک جاتا ہے۔ ریکارڈ اٹھاتا ہے اور پھر رکھ دیتا ہے۔ آئینوں کا عکس ضرور ان کی نگرانی کر رہا ہوگا...... چوری مشکل ہے۔ لیکن ہر برس ہزاروں پونڈز کی شاپ لفٹنگ ہوتی ہے۔ درجنوں لوگوں کو سزائیں ہوتی ہیں۔ میں نے

ایک جگہ لکھا ہوا دیکھا ہے۔

"آپ جیب کتروں سے خوشیار رہیں۔ وہ آپ کی جیب میں پڑے روپوں' ٹریولر چیک' اور کریڈٹ کارڈ کی ٹوہ میں ہیں۔"

میں اپنے کوٹ کی اندرونی جیب کو ہاتھ سے چھوتی ہوں۔ اور کندھے پر لٹکا سیاہ تھیلا جس میں ہمارے پاسپورٹ اور ریٹرن ٹکٹیں ہیں' میں اسے حفاظت سے بغل میں دبا لیتی ہوں۔ اس میں بہت سی چیزیں ہیں۔ خریدے ہوئے پوسٹ کارڈ' ٹیلی فون نمبروں والی ڈائری اور وہ سیاہ جلد والی ڈائری جس میں میں روزانہ رات کو اپنے احساسات اور واقعات کو قلمبند کرتی ہوں۔ اور بھی قیمتی چیزیں ہیں۔ مثلاً سونے کے چند جوڑی بُندے۔ وہ میرے کندھے پر لٹکا ہوا خاصا وزنی نظر آتا ہے۔ سب طرف لگے ہوئی ٹیلی ویژن سیٹس پر ایک سیاہ فام گانا گا رہا ہے۔۔

یہ شاعری جسم کا رقص نہیں یہ تو ایک جنسی چیخ ہے۔ تباہ کرتی' برباد کرتی' جہنم کی تاریکیوں کی طرف لے جاتی۔ شیطانی اعضا اپنے آپ کو جھٹک رہی ہیں۔ ڈھول پر اعصاب شکن چوٹ پڑ رہی ہے۔ اور گانے والا اپنے چاہنے والوں کے بلند کیے ہاتھوں پر چلتا ہوا گا رہا ہے۔

آج کا ہیرو۔ فلمی ہیرو' یا کھلاڑی ہیرو۔ وہ تاریخی ہیرو جو تلوار کی دھار سے دشمنوں کے جسموں پر خون سے تحریریں لکھا کرتے تھے قصۂ پارینہ بن چکے......

لوگ کہتے ہیں کیمرج بھی جنسی اور نشے کا اڈاہ بن چکا ہے۔ ہوسکتا ہے یہ کچھ حد تک درست ہو۔ لیکن وہاں پر آج بھی تعلیم کی صدیوں پرانی فطری اور جستجو آمیز خوشبو پھیلی لگتی ہے۔ میں نے پیغام رساں اداروں کے نام پڑھے ہیں جو مرد عورتوں کو یک جا کرتے ہیں۔ لیکن کدورت کی وہ مضبوط رسی نہیں ٹوٹتی جو میں نے اپنے ذہن کی سوچ کے ساتھ باندھ رکھی ہے۔ نہیں

۔اپنے تصور کو مجروح کرنے کے لیے میں کسی سے کچھ نہیں پوچھوں گی۔ مجھے ہر نظر آتی روشنی پر یقین آتا ہے کیونکہ وہ بھی تو موجود ہے۔اور موجود کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

میوزک بج رہا ہے۔اور میں بڑے بڑے شیشوں والے دروازے کو کھول کر باہر آ گئی ہوں۔ مجھے چند چیزیں خریدنی ہیں۔میں نے حساب کر کے چند پونڈز کو چاکلیٹ خریدنے کے لیے الگ کر لیا ہے۔ چار راتوں کا کمرے کا کرایہ...... چند پونڈز گر اور چائے کافی کے یے اور پھر ائر پورٹ بھی تو جانا ہے چند بڑے چھوٹے سکے یادگار کے طور پر اپنے چھوٹے بیٹے فیصل کو دوں گی......دن گزر گیا۔سڑکوں پر پھرتے بازاروں میں گھومتے مہنگے سٹورز میں گھس کر باہر آتے دن گزر گیا۔لوگوں کے قدموں سے قدم ملا کر چلتے سیڑھیاں اترتے اوپرے جاتے دن گذر گیا......میں حمیدہ معین رضوی کے گھر کو جاتی گاڑی کے انتظار میں پلیٹ فارم کے ایک بنچ پر بیٹھ گئی ہوں پلیٹ فارم گندہ اور ویران ہے گھبرانے کی بات نہیں۔اتنے دنوں کے تجربہ نے میرے اندر بھی حوصلہ اور اعتماد پیدا کر دیا ہے ابھی ساڑھے سات بجے ہیں پاکستان میں رات کے ساڑھے بارہ کے قریب بجے ہوں گے میرے گھر والی گلی میں چوکیدار کی تیز سیٹی گونج رہی ہوگی۔ میرے بچے بستروں میں سوئے خواب دیکھ رہے ہوں گے۔انکے خوابوں میں تصویروں کی طرح کا لندن ہوگا۔خوبصورت سنڈریلا ہوگی۔سلیپنگ بیوٹی ہوگی۔کتوں کے پٹے تھامے پارکوں میں سیر کرتے میم اور صاحب لوگ ہوں گے۔اور پر آسائش زندگی کا ایک تصوراتی ہیولا مکمل ہو جائے گا۔

لیکن وہ یہ نہیں کے ان لوگوں کا خواب نہیں دیکھ سکتے جو پھٹے جوتے اور گندی جینز پہنے محنت کر رہے ہیں۔وہ انڈر گراؤنڈ ریلویز میں سر جھکائے بیٹھے کسی نہ کسی سٹیشن پر خاموشی سے اتر جاتے ہیں۔

انہیں اس لڑکی لڑکے کے بارے میں کیسے معلوم ہوگا جو انڈر گراؤنڈ کے ریلوے پلیٹ فارم سے دوسری طرف جاتی راہداری کے کونے میں پھٹی رضائی میں سر کو نیچے کیے بیٹھے ہیں۔ان کے سامنے بورڈ رکھا ہوا ہے "بے گھر اور بے روزگار افراد کی مدد کیجیے"

رات سرد اور سیارہ ہے کسی زیر زمین راہداری کے کونے میں کھڑا کوئی مغنی نغمہ سنا رہا ہو گا۔یا گٹار کے مرتعش تار خون کے آنسو رو رہے ہوں گے۔اور ایک ایک پینی یا دس پینی کے سکے مل کر بمشکل چند پونڈ بن سکیں گے۔لیکن یہاں زندگی گذارنے کے لیے کئی پونڈ روزانہ چاہیں......مغنی کچھ دیر بعد جب راہداریوں میں کسی مسافر کے پاؤں کی گونج نہ ہوگی اپنا اثاثہ سمیٹ کر کہیں اور چل پڑے گا۔

بظاہر یہ بہت کچھ جو میں اتنے دنوں سے دیکھ رہی ہوں بڑا اچھا اور پر لطف لگ رہا ہے چہرے ہی چہرے اور ان پر لکھی انگنت تحریریں۔یہاں دوسروں کی نظروں میں جھانکنا منع ہے۔اسی لیے تو ہر کوئی اکیلا اور خاموش ہے۔انسانوں کو ایک دوسرے تک پہنچنے کے لیے آنکھوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔آنکھیں جو محبتوں نفرتوں کی تصویر ہوتی ہیں جو دور نزدیکی کے فاصلے طے کرتی ہیں۔یہ لوگ کاغذ کے بنے ہوئے نہیں۔لیکن یہاں اکثر لوگ اخبار یا کتابوں کی کاغذی دیوار کے پیچھے اپنے آپ کو دوسروں سے علیحدہ کر کے بیٹھ جاتے ہیں یا پھر ان کے سر رعشہ سے ہلتے انہیں پتلیوں کی مانند بنا دیتے ہیں جن کی جنبش ہمیشہ کسی دوسرے ہاتھ میں ہوتی ہے ان کی آنکھیں جھکی ہوئی ہیں ان کے پاس خریدنے یا بیچنے کے لیے کچھ نہیں ہوتا۔

حمیدہ معین رضوی کے گھر کا دروازہ کھلا تو لذیذ کھانوں کی خوشبو نے ہمارا سواگت کیا بچے کھانے کی میز پر ہمارا انتظار کر رہے تھے ان کا چھوٹا پانچ چھ سالہ بیٹا سلطان بار بار مہمانوں کے بارے میں پوچھتا رہا تھا۔گاڑی نے ہمیں خاصا لیٹ کروا دیا۔

رات گذر رہی ہے کل کی طرح ہی ہم باتیں کر رہے ہیں ان کے خوبصورت شعر سن کر میں داد دے رہی ہوں۔لیکن میں شاعری کو پسند کرنے کے باوجود شاعرہ نہیں ہوں اگر شاعرہ ہوتی تو لندن کے مشاعروں تک پہنچ جاتی ہزاروں خواہشوں پر دم نکلنے کے باوجود دم اور خواہشوں میں فاصلہ قائم رہتا ہے۔۔۔۔۔بہت راتوں کے بعد میں پھر رات کی ویرانی سے امان محسوس کر رہی ہوں۔کھڑکی سے جھانکتا اندھیرا اور سنسان گلیاں مجھے ڈرا نہیں پائیں گی۔حالانکہ بارش کے قطرے آج بھی بے آواز سفر کر رہے ہیں۔ڈر کی کوئی بات نہیں۔۔۔۔۔خدائے لم یزل آج بھی میری حفاظت کرے گا۔نیند میری آنکھوں پر اپنی ہتھیلیوں کا دباؤ ڈال رہی ہے۔بارش کے قطرے کھڑکیوں کے شیشوں پر سفر کرتے ہیں۔اور میرے گھر کے آنگن سے مٹی کی سوندھی سوندھی باس اٹھ رہی ہے اور میرے گھر کا بستر بڑا آرام دہ ہے۔۔۔۔۔اور میرے بچے بیٹھے آپس میں شور ڈال رہے ہیں۔۔۔۔۔اور۔۔۔۔۔اور۔۔۔۔۔

آج نو اکتوبر ہے میں نے کھڑکی سے جانک کر برستی بارش کو دیکھا ہے بادلوں میں گھلتا ہوا آسمان زمین پر نیچے تک جھکا ہوا لگتا ہے اتوار کا اکیلا سہا ہوا دن سڑکوں پر دبے قدموں چل رہا ہے کوئی آہٹ نہیں کوئی جنبش نہیں خاموشی کی تنی چادر تلے بستیاں ساکت ہیں سفید جالی کے پردے کھڑکیوں پر کھچے ہوئے ہیں صرف ایک دن اور باقی ہے اور پھر میں واپس چلی جاؤں گی مانوس خوشبو میں میرے نتھنوں میں گھس رہی ہے رات کی رانی گلاب کے پھول میرے چھوٹے بیٹے کی پالتو بلی کی میاؤں۔۔۔۔۔میاؤں۔۔۔۔۔دروازے کی گھنٹی کی بار بار بجنا فقیروں کی صدائیں ٹیلی فون کی ٹن ٹن۔میں پچھلے چھبیس دنوں سے جو آدھی زندگی جی رہی تھی اس آدھی زندگی سے مل کر مکمل ہو جاؤں گی۔اور خوشی کے لیے ذات کی تکمیل کتنی ضروری ہے۔

یہاں جوان لوگ ایک دوسرے میں کھو کر ذات کی تکمیل کرتے ہیں سائنس دان

فارمولے حل کرتے ذات کے صحرا کو پاٹتے ہیں۔مصور تصویر کو ذات کے اظہار کا ذریعہ بنائے ہوئے ہیں اور تاجر منڈیوں پر کنٹرول حاصل کر کے اپنے ہونے کا ثبوت دیتے ہیں۔لیکن آج بازار بند ہوں گے لوگ سارے ہفتہ کی تھکان بستروں کی گرمی کو اپنے گرد لپیٹے اتار رہے ہوں گے۔اور کل پھر نئی فکروں کے ساتھ ان کی دہلیزوں کے اندر گھس آئے گا۔

حمیدہ معین رضوی ہمارے ساتھ ہی ٹرین پر سوار مسلمانوں کی بیٹیوں اور عورتوں کو اسلامیات کا درس دینے جاتی ہیں۔انہیں ٹوٹی تہذیب سے جوڑنا خاصا وقت طلب کا ہے۔لیکن مسلمانوں کے اندر اس بات کا ادراک جاگ اٹھا ہے کہ اگر ہم اپنی جڑوں سے جڑے رہنا چاہتے ہیں تو ہمارے بچوں کو اپنے مذہب کا شعور ہونا چاہیے لڑکیاں عورت مرد کے جنسی تعلقات کے بارے میں کھلے سوال کرتی ہیں۔ان کے نزدیک یہ کیسے ممکن ہے کہ مرد اور عورت ایک دوسرے سے دور رہیں۔شادی کیسے کامیاب ہوگی ان کے نزدیک یہ کیسے ممکن ہے کہ مرد اور عورت ایک دوسرے سے دور رہیں۔شادی کیسے کامیاب ہوگی ان کے نزدیک سب سے ضروری سوال کا جواب ہونا چاہیے......اور یہ جنسی شعور تو جانور اور کیڑے مکوڑوں میں بھی ہوتا ہے کیا انہیں کسی سکول میں سبق دیا جاتا ہے۔کیا ان کے عملی مظاہرہ کیا جاتا ہے تخلیق کا عمل فطرت تک کا حصہ ہے۔اور فطرت خود اس احساس کی حفاظت کرتی ہے یہ جواب ان کی پوری طرح مطمئن نہیں کرتا۔یا شاید وہ ذاتی تجربات کی اس دنیا سے اپنے آپ کو علیحدہ نہیں کرنا چاہتیں۔وہ اس دنیا کی تلاش اپنے زور پر ہی بہتر سمجھتی ہیں......لیکن پھر بھی لوگ مجالس عزا اور میلاد منعقد کرواتے ہیں مساجد میں نمازیں پڑھی جاتی ہیں۔

روحانی تسکین کے لیے مذہب کی ضرورت ہے۔اور جسمانی آسودگی کے لیے نشہ آور ادویات نائٹ کلب پنک کلب سازوں کی چیختی چلاتی آوازیں اور جھاگ اڑاتی بیئر ہے اور

بگ بین کا گول چہرہ دریائے ٹیمز پر جھکا اپنا عکس دیکھتا ہے۔ تاریخی گرجا گھر کی نوکدار محرابوں والے گنبد آسمان کی طرف بازو اٹھائے روحانی پاکیزگی کے لیے دعا گو ہیں۔ اور اس کے زیر زمین تہہ خانوں میں مردے قیامت کے انتظار میں روزی کے دانے گھمار ہے ہیں اور وقت کی گرد ہر روز بارش کے پانی سے دھل جاتی ہے اور چکنے فرش گوتھک طرز کی بلند کھڑکیوں کے شیشے نہ جانے کب سے اور کب تک راستوں پر چلتی شبیہوں کو منعکس کرتے رہیں گے جو گنبدوں کے سایوں تلے اپنی اپنی سوچوں کی گٹھڑیاں اٹھائے وقت کے تعاقب میں ہیں۔ اور ان کے وجود بوجھ سے جھک گئے ہیں۔

میں نے پل سے جھک کر اپنا عکس دیکھنے کی کوشش کی ہے لیکن سٹیمر اور موٹر بوٹس کی تیزی نے پانی میں ہلچل مچا رکھی ہے سفید جھاگ اڑاتی لہریں جاتی کشتی کی نشان دہی کر رہی ہیں میری سوچوں کی گٹھڑی کا بوجھ میرے کندھوں پر ہے اور اجنبی راہیں میرے پاؤں تلے ہیں میں واپس مڑ رہی ہوں بگ بین کی ٹن ٹن قہقہہ بن کر فضا میں گھل گئی ہے جیسے کہہ رہی ہو تمہیں اپنے بوجھ خود ہی اٹھانے ہیں آئینہ میں دیکھنے کو تمہارے پاس بہت کم وقت باقی بچا ہے وقت گرد تمہیں بدل رہی ہے ٹن......ٹن......ٹن......واپس جاؤ......تب میں نے واپس جاتے ہوئے سوچا تھا کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں وقت کے چنگل سے نکل جاؤں ......عبث ......فضول ......ایک لامتناہی قہقہہ مجھے اپنے پیچھے سنائی دیا ہے اس روز ستمبر کی اٹھارہ تاریخ تھی اور آج اکتوبر کی نو تاریخ ہے عاشی بہن امیر زہرہ کے گھر آخری ملاقات کے لیے جا رہی ہے اور مجھے ہمیشہ کی طرح اس کا حکم ماننا ہے میں اکیلے رہ جانے سے گھبراتی ہوں میں ہمیشہ سے راستوں کی بھول بھلیوں سے خوف زدہ اور خائف ہوں اس لیے میں نے ہمیشہ اپنے کردار کے راستے بھی سیدھے رکھے تا کہ میں کہیں بھٹک نہ جاؤں اور سڑکوں پر بھی سیدھی چلی۔

بارش میری چھتری کے تاروں سے دھواں دھواں فضا سے نکل کر سب طرف گر رہی ہے۔

ایک......دو......تین ان کا وہی تراسی نمبر کا گھر......میں چھتری کو دروازے کے ساتھ لٹکا کر ڈرائینگ روم میں آ کر بیٹھ گئی ہوں مہمان بیٹھے ہیں ٹی وی پر سیول کی گیمز کے ابتدائی فنکشن کی جھلکیاں دکھائی جا رہی ہیں جذبوں سے سرشار جوان کھلاڑی بکنی پہنے پانی کی سطح پر تیرتی خوبصورت لڑکیاں گولڈ میڈل اپنے اپنے ملک کے قومی ترانے بلند ہوتے جھنڈے کامیابی کے گلال سے رنگے چہرے۔

ہم نے کیا پایا۔ ہندوستان نے کیا حاصل کیا امیر زہرہ کے دیور ہندوستان کے حوالے سے باتیں کر رہے ہیں میں بھی باتوں میں شامل ہو گئی ہوں پاکستان میرا حوالہ ہے میں اس سے علیحدہ ہو کر بات نہیں کر سکتی۔ مجھے دوسروں کی نظروں کی تحقیر منظور ہے لیکن بے حوالہ ہونا منظور نہیں کیا میں دوسرے ملکوں میں پھرتے ان کی خوبصورتیوں کی تعریف کرتے ان کو اپنا کہہ سکتی ہوں کیا یہ زمین میرا حوالہ بنے گی میں جانتی ہوں میں ہمیشہ یہاں کے لیے غیر ملکی ہی رہوں گی۔ تو پھر میں اپنا حوالہ کیوں کھوؤں میں انگریزی بولنے کے شوق میں صرف اپنے ملک کی برائی ہی کیوں کروں مجھے مائیکروسکوپ سے اپنے ملک کی چھوٹی چھوٹی خوبیوں کو دیکھ کر اپنا حوصلہ بلند رکھنا ہے۔ میں اکثر خامیوں پر شرمندہ ہو جاتی ہوں لیکن مجھے امید ہے کوئی نہ کوئی ضرور آئے گا جو میرے ملک کو بھی بلند کرے گا عزت دے گا میں ہمیشہ پر امید رہتی ہوں۔

اوہ میں بیک ورڈ پاکستانی خاتون جو یہاں کے آزاد ماحول سے قطعی متاثر نہیں ہو پائی......میری عقل پر لوگ شک کریں گے مجھے تنگ نظر کہیں گے لیکن میری زندگی کا تانا بانا وطن کی محبت سے بنا گیا ہے اور میں اپنے وطن کے سامنے ایک وفا شعار نوکر کی طرح جھکی ہوئی ہوں

میں اس سے ہمیشہ وفا کا عہد نبھاؤں گی...... مجھے وطن کی برائیاں سن کر دکھ ہوتا ہے۔

مانوس باتیں مانوس لوگ امیر زہرہ کی بہن محبت بھرا سلوک کر رہی ہیں رات کا اندھیرا بیک یارڈ کو ڈھک چکا ہے اندھیرے کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ وقت بھول جاتا ہے بس رات یاد رہتی ہے اور آج کی رات مجھے اس غیر مانوس کمرے میں گذارنی پڑے گی جس کا کرایہ ہم پچھلی دو راتوں سے ادا کر رہے ہیں لیکن یہ دو راتیں حمیدہ معین رضوی کے گھر گزاری ہیں اوہ رات کا اندھیرا......اور واپسی کا سفر...... پھر کیا ہے گاڑیاں چلتی ہیں...... میں خوش ہوں چھوٹی باتوں کی۔لمحاتی رفاقتوں کی گرمی نے بدلتے موسم کے باوجود مجھے مسرت مہیا کی ہے مجھے ان ساری خوشیوں کی جوڑ جوڑ کر ایک مالا بنائی ہے میں اس مالا کو اپنی یادوں کی گردن میں ڈال دوں گی اور کبھی کبھی مسکرایا کروں گی۔

لندن میں آئے مسافر واپس جا رہے ہیں ٹورسٹ جوڑے جوان اکیلی لڑکیاں ادھیڑ عمر عورتیں رک سیک کندھوں پر ڈالے انڈر گراؤنڈ ریلوے کا نقشہ پکڑے راہوں کے بارے میں جاننے کی کوششیں کرتے ہوئے عورتیں مرد بھول بھلیوں کو حل کرنا انسانی فطرت میں شامل ہے راستے کہیں نا کہیں تو جائیں گے ایک ٹین ایجر جوڑا بکھرے بالوں تھکے قدموں اور خاموش چہروں کے ساتھ دیوار سے ٹیک لگائے ایک دوسرے کے ساتھ جڑا خاموش بیٹھا ہے۔جیسے انہیں کہیں نہیں جانا......سفر......اور سفر......اور پھر یہ تھک کر کسی موڑ پر ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے۔نئی راہیں قدموں کی منتظر رہتی ہیں۔

گاڑی آ رہی ہے اور مجھے اس میں سوار ہونا ہے اور وہ بے رحم سرد تنہائی والا کمرہ میں اس کے چنگل سے بچنا چاہتی تھی لیکن آج کی رات۔

بلند عمارتوں کے سائے تلے چلتی سیڑھیاں اتر کر میں اس کمرے تک آن پہنچی ہوں۔کمرہ

میری طرف دوستی کا ہاتھ نہیں بڑھاتا میں بھی اس کو اپنے دل کے قریب آنے نہیں دیتی۔لیکن پھر بھی مجھے اس کے ساتھ رہنا ہے ایسا اکثر ہوتا ہے کو دوری نہ ہوتے ہوئے بھی ہم کئی لوگوں سے مل نہیں پاتے۔ہمارے درمیان کوئی مکالمہ نہیں ہوتا لیکن ایک لمحہ کو پاس بیٹھا شخص بعض اوقات اس قدر اپنا اپنا لگتا ہے کہ جی چاہتا ہے دکھوں کے سارے آنسو اس کے کندھے سے لگ کر بہادیں۔ہمیں اس کی دوستی پر مکمل یقین ہو جاتا ہے لیکن ایسے لمحے زندگی میں کبھی کبھار ہی آتے ہیں۔لیکن ضروری نہیں کہ ہم اس کو اپنی گرفت میں لے سکیں۔

بہن بھائیوں کی محبت بھی ان لازوال لمحوں میں ہی حاصل ہوتی ہے زندگی کے دن رات ایک چھت تلے گزارنے ایک دستر خوان پر بیٹھنے کے باوجود رشتوں کا بھرم رکھنا ضروری نہیں سمجھا جاتا دولت کا ترازو ہاتھ میں پکڑے دوسروں کو کوسنے والے اپنے پلڑے کو نیچا ہی رکھتے ہیں اور پھر برابری کے اور بھی پیارے ہیں۔

کتنا کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے بدلے کی آگ میں جلنے کے لیے آپ کا کاٹھ کا ہونا ضروری نہیں آگ لگانے والے تو پانی میں بھی آگ لگانے کا ہنر جانتے ہیں ہم تاریک راہوں میں مارے جاتے ہیں لیکن زندہ رہنے کی لگن روشنیوں اور بہاروں کی ضامن بنتی ہے گھاؤ مندمل ہو جائیں گے راہیں بدلی جاسکتی ہیں صرف ایک رات کا قصہ اور باقی ہے میں مسکرا رہی ہوں بکھرے سامان کو ترتیب سے رکھتے رکھتے ساعتیں آگے کی طرف کھسک رہی ہیں سٹریٹ لائٹ بیک یارڈ کی نچی کھسوٹی گھاس سے ہوتی اندر جھانک رہی ہے کتنی تنہائی اور خاموشی ہے لندن میں آنگن سونے ہی رہتے ہیں اور ٹھنڈا چاند کبھی کبھار یہاں کے باسیوں کو جھانکنے کے لیے ادھر بھی آنکلتا ہے سورج آنکھیں موندے راستوں کو طے کرتا ہے بادل پرے کے پرے تہہ در تہہ محو سفر رہتے ہیں دریائی سٹیمر چلتے ہیں ٹورسٹ کیمروں سے کلک کلک کرتے ہیں خالی ٹن پانی

کی لہروں پر جھولتے ہیں اور چہروں کو سجائے سینوریتائیں ملن کے گیت گاتی ہیں اور کھڑکیوں میں صدا بہار پھول جھومتے ہیں۔

نہ جانے کتنی دنیائیں آباد ہیں کتنے دل سرشار ہیں کتنے قہقہے گونجتے ہیں کتنے آنسو بہتے ہیں کتنے دل ڈوبتے ہیں میں دنیا کی خوشیوں کے لیے دعا گو ہوں چاہے میری یہ دعا رائیگاں ہی جائے چاہے عرش کے پائے اور بلند ہو جائیں میری اس دعا کو کبھی تو شرف قبولیت بخشا جائے گا۔

سامان بندھ چکا ہے صرف کل کا دن...... میں بند آنکھوں سے سوچوں کی وادیوں میں اتر رہی ہوں خواب میں ہنس رہی ہوں اچھے خواب جس میں انسان اپنے آپ کو ہمیشہ جوان دیکھتا ہے۔ ساری خوشیاں دسترس میں ہوتی ہیں اور سب کچھ اپنی پسند کا ہوتا ہے۔

سورج کا روشن گولا کئی دنوں کی طویل دھند آمیز بارش سے دھلا دھلا یا بیک یارڈ کے اجاڑپن کے اوپرے بلند عمارکی چمنی پر چمک رہا ہے۔

میں تیار ہو چکی ہوں آج کا دن میری طویل ترین رخصت کا آخری دن ہے میں نے اپنی خدمت کا معاوضہ ایک دم ہی خاصل وصول کر لیا۔ بیرون ملک سفر کا ریٹرن ٹکٹ اور سیر و سیاحت کا سارا خرچ......؟

میں نے اپنی راہ میں آنے والے ہر دکھ کے کڑوے پھل کو صبر کی چاشنی سے میٹھا کیا ہے ہر مایوسی مجھے امید کی روشن کرن نظر آتی ہے ہاتھ میں روشنی اور اس کی شمع لے کر چلنے والے مایوسیوں کو میاوس کر دیتے ہیں میں تھک کر بیٹھ جانے کو اپنی ہار سمجھتی ہوں چھبیس ستائیس دن کی طویل تعطیل نے مجھے مشاہدات کی نئی دنیاؤں سے روشناس کروایا ہے اور میں اپنے اندر کی تخلیقی زمینوں پر ہل چلا کر انہیں نئی سوچوں کے لیے تیار کر دی ہوں میرے مشاہدات کسی مغربی عورت

کے مشاہدات نہیں جو تجربات کی کئی خندقیں بیک وقت عبور کرسکتی ہے میں تو مشرقی عورت ہوں جو وسوسوں خوف اور بچھڑ جانے کے غم میں اپنی فطرت کا حصو بنا کر چلتی ہے جو اندھیروں کے اور اپنے درمیان حد فاصل بنا کر خود کو محفوظ کر لیتی ہے جو دور رہ کر بھی اپنوں سے بندھی ہوتی ہے۔

میرا یہ سفر نامہ کسی حسینہ کا سفر نامہ نہیں جس کی راہ میں نہ جانے کون کون دل کا نذرانہ لیے منتظر کھڑے رہتے ہیں۔ نہ ہی میں کوئی منچلا نوجوان ہوں جو کسی خوبصورت لڑکی کے جسم کے لمس سے بجلی کا جھٹکا محسوس کرتا ہے۔

میں نے یہ سفر زندگی اور شعور کے ان لمحوں میں کیا جب سوچ کا ٹھہراؤ میرے گروپے میں میٹھی اونگھ بن چکا ہے۔ میں نے اپنی زندگی کا بہت سا سفر طے کر لیا۔ حیات کی ساری تلخیاں امیدیں نامیدیاں اور سوچیں گھل مل کر ایک نئے خوش ذائقہ مشروب میں ڈھل کر مجھے مسرور کئے دے رہی ہے۔ یہ سب کچھ میری اپنی ذات کی تکمیل ہے آخری دن آخری ساعتیں آخری لمحے۔ دس تاریخ کا سورج بڑا روشن اور اجلا ہے ''سورج یہ دوائی یہاں کے ڈاکٹر کے نسخے کے علاوہ نہیں مل سکتی''۔ میں میو ہسپتال کے ایک بڑے ڈاکٹر کے نسخے کو پکڑے کیمسٹ کی دکان پر مایوس کھڑی ہوں کیا وہ ساری محنت اور علم جس کو حاصل کرنے کے لیے ہمارے ڈاکٹر دن رات محنت کرتے ہیں بے کار ہی ہیں۔ شاید ہمارے ملک میں سونا بننے کے عمل میں تھوڑی سی کسر رہ جاتی ہے۔

زندگی کو بچانے کے لیے صحت کو برقرار رکھنے کے لیے سائنس دان اپنی جھکی کمروں پر ہاتھ رکھے نالیوں اور مرتبانوں کو تحقیق کی آنکھ سے دیکھتے ہیں وہ علم کے نئے باب لکھتے اور انسانیت کو فیضیاب کرنے کے لیے اسے ساری دنیا میں پھیلا دیتے ہیں۔

اور چند ہومیو پیتھی دوائیاں بھی تو لینی ہیں میں ہومیو پیتھی دوائیوں کی مشہور

دکان ''نیلسن'' کے کاؤنٹر کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی ہوں۔ خوش اخلاق خواتین گاہکوں کو بنٹا رہی ہیں۔

''وٹ کین آئی ڈو فار یو'' وہ ہر نئے گاہک کو مخاطب کر کے یہی جملہ کہتی ہیں۔ اور پھر دوائیوں کی بند شیشیاں۔ شیشیوں میں بند میٹھی سفید گولیاں۔ گولیوں میں بند شفا۔

زندگی کے تمام دکھوں کا علاج میٹھے الفاظ بن سکتے ہیں الفاظ جو لبوں کے شہد آگیں لہجوں میں گھلے زخموں پر مرہم بن جاتے ہیں یہی الفاظ گہرے گھاؤ لگاتے اور خون کے آنسو لاتے ہیں رشتوں کو توڑنے دلوں کو رگیدتے جذبوں کو پامال کرتے اور مایوسیوں کے اندھیروں کو گہرا کرتے ہیں میٹھے الفاظ اور میٹھی گولیاں دونوں انسانی صحت کے لیے ضرور ہیں مسرتوں کے لیے ضروری ہیں۔

میں دکان سے باہر آ گئی ہوں میرے ہاتھ میں پکڑی دوائیاں ہیں میرے سامنے سے ایک بے حد خوبصورت عورت سفید بہترین لباس میں ملبوس پھولوں کا گلدستہ تھامے سفید موتیوں کی مالا پہنے سنہری بالوں کی لٹوں کو جھلاتی نہ جانے کس کو ملنے جا رہی ہے اس کا حسین ترین چہرہ حسین ترین بالوں کے ہالے میں بے حد پرکشش لگ رہا ہے میرا جی اسے مڑ کر دیکھنے کو چاہ رہا ہے لیکن وہ تیز تیز قدم اٹھاتی آگے بڑھ گئی ہے یقیناً ایسے چہرے شاعری کا محرک بنتے ہیں افسانہ نگار انہی چہروں کو مصوری الفاظ میں کرتے اور مصور ایسے ہیں چہروں کو جیتی جاگتی زندگی میں ڈھالنے کے لیے خواب دیکھتے ہیں۔

میں اسے جاتا دیکھ رہی ہوں میں پچھلے دو دنوں سے ایک ہی سوتی لباس پہنے سفید فام نسل کے لوگوں کے درمیان گھوم پھر رہی ہوں میں جو براؤن نسل کی عورت ہوں ہے اینڈ وائے کے چھوٹے قصبے کی سڑک پر پھرتے ہوئے ایک چھوٹے لڑکے نے اپنے ساتھیوں سے کہا تھا

دیکھو ''بلیکس'' اور جب ہم نزدیک پہنچے تو اس نے مایوس ہو کر کہا ......اوہ نو...... ''مسکڈ'' ''مسکڈ'' میرا درجہ اس کی نظروں میں اور بھی گر گیا تھا میں خالص نہیں بلکہ نخالص تھی۔

لندن میں میں نے اکثر نیگرو لڑکے لڑکیوں کو قدرے کم سیاہ دیکھا ہے ان کے نقوش بھی اچھے ہوتے ہیں اور جب جاذب نظر لگتے ہیں اور پھر انہوں نے صدیوں پرانی غلامی کی زنجیروں کو بھی توڑ ڈالا ہے وہ کھیلوں میں گولڈ میڈل پہنے امریکہ اور انگلینڈ کے جھنڈے تلے سر کو فخر سے بلند کیے وطن کے ترانے کو گنگناتے ہیں نیگرو فاتح بازاروں میں دھکیلتے بیوی کے ہونٹوں کو بے اختیار بوسہ دیتے پھر ساری کائنات مسکرانے لگتی ہے نسلیں اور رنگ ترقی کرتے اور مفاہمت کا بگل بجتا ہے۔

آج آخری دن ہے آج کہاں جایا جائے...... پکڈلی کے چوک کا کیوپڈ تیر چلانے کے لیے اپنی گہری سبز کمان کو سنبھالے ایک پاؤں پر بوجھ ڈالے کھڑا ہے اور جوان جوڑے سیڑھیوں پر بیٹھے ہنس رہے ہیں باتیں کر رہے ہیں کندھوں سے بیگ اتار کر اسے سرہانے بنائے مسافر لیٹے ہوئے سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے فضا میں بکھیر رہے ہیں فضا ان کے دلوں کے گیتوں سے معمور لگ رہی ہے جیسے وہ کہہ رہے ہوں۔

''ہمارے دلوں میں محبت کا تیر پیوست ہے ہمارا خون لالی بن کر رخساروں پر دمک رہا ہے ہمارے ہاتھ لمس کی لذت سے آگاہ ہیں ہمارے ہونٹ طویل بوسوں کی مٹھاس کو پی رہے ہیں کیوپڈ مسکراتا ہے ہم مسکراتے ہیں اور دنیا مسکراتی ہے اور کائنات ہمارے قدموں تلے ختم ہو گئی ہے'' شاید یہ نغمہ جو میرے کان سن رہے ہیں کبھی کسی مغنی نے گایا ہو۔اس کے ستار کے تار ہمیشہ مرتعش رہتے ہیں اور محبت کا ابدی نغمہ گونجتا ہے......

چوک کے فرش کی ٹائلیں مرمت کے لیے اکھاڑی ہوئی ہیں۔ سرمئی رنگ کے کبوتر دوستی
کی علامت کے طور پر مسافروں کے پاس کھڑے اپنی سرخ آنکھوں میں امید کے دیئے روشن
کیے ہیں۔ ہمیں کچھ کھانے کو دو...... وہ زمین پر پڑے زروں کو چگ رہے ہیں۔ امن اور شانتی
۔ بائی چارہ اور دوستی۔ کتنی تروتازگی ہے۔ اور آج میری رخصت کا آخری دن ہے...... کہاں جایا
جائے۔ میں نے ابھی ان پونڈز کو خرچ کرنا ہے جو ضروریات سے زیادہ ہیں۔ چاکلیٹ لیکن
چاکلیٹ کے وزن سے سامان زائد ہو جائے گا۔ ایمسٹرڈیم کے ائر پورٹ سے خرید لیں
گے...... چلو اچھا ہے دن کا باقی حصہ بوجھ کی طرح میری گردن میں لٹکا ہوا ہے۔

بی بی سی کے ریڈیو سٹیشن کی طرف چلتے ہوئے میں کسی خوش فہمی یا غلط فہمی میں مبتلا نہیں
ہوں۔ انہوں نے لندن میں میری آمد اور افسانہ پڑھنے کی خبر کو نشر کر دیا تھا۔ اگر یہ بھی کیا ہوتا تو
بھی کیا فرق پڑتا۔ میری دوستی یا واقفیت کا دائرہ وہاں تک نہیں پہنچتا میں انہیں یہ نہیں بتا سکتی کہ
دیکھیں مسٹر میں پاکستان سے آئی ایک ادیبہ ہوں میری چھ عدد کتابیں چھپ چکی ہیں فیروز سنز نے
میری کتابوں پر رائلٹی کی رقم میرے یہاں آنے سے پہلے ہی ادا کر دی ہے میرے وطن کے
لوگ مجھے جانتے ہیں اور میں اپنے لوگوں کے دکھ سکھ کی حصہ دار ہوں۔

یہ سب کچھ بتانا بڑا سطحی اور بودا لگے گا میں جو افسانے کی کھیتی کی سوچ کے پھوڑے سے
کھودتی رہتی ہوں اپنی جدو جہد کو مشہور عمارت کے ایک کمرے میں مائک سے نکلتے الفاظ تک
محدود کرنے کے لیے ہی تگ ودو نہیں کرتی رہی ہوں۔

گیٹ پاس لے کر لفٹ سے اوپر عابدی صاحب ہمیں اپنے کمرے میں لے گئے ہیں
اور یہ بش ہاؤس ریڈیو سٹیشن کی کینٹین شاہ صاحب کے ساتھ چائے پیتے ہوئے میں چاروں
طرف دیکھ رہی ہوں ہر ملک کے باشعور لوگ اپنی اپنی میزوں پر بیٹھے کھانے پینے کی چیزوں سے

ذہنی تھکاوٹ دور کر رہے ہیں ہندوستان کا پروگرام کرنے والے ہندوستانی سیاہ فام نیگرو جاپانی چینی اور بھی قومتیں ۔جن کو میں پہچان نہیں پائی۔

ایک ہندوستانی عورت کا شوہر جرمنی تھا اور وہ ہمیں ایک سٹیشن پر ملی تھی۔مکسڈ معاشرہ زاہدہ حنا کراچی اپنے گھر واپس چلی گئی ہے نہیں تو میں اس سے ملتی نیگرو ویٹرس اپنے بھاری بھرکم جسم کے باوجود تیزی سے میزوں سے لفٹ اوورز اٹھا رہی ہے......جگہ صاف ستھری ہے۔

ساڑھے چار بج چکے ہیں نیچے آتے ہوئے میں نے اپنے کوٹ کے کالر پر لگا ہوا بی بی سی کا بیج اتار دیا ہے بی بی سی عمارت گھمبیر سنجیدگی لیے ہوئے ہمیشہ سے یہاں کھڑی ہے......ہم سب بی بی سی کی خبروں کو بہت اہمیت دیتے ہیں سچ جاننے کے لیے اس کی آواز پر بھروسہ کرتے ہیں اپنا ایک خاص مقام بنانا آسان نہیں۔

آخری ساعتیں تیزی سے گذر رہی ہیں لوگ ہمیشہ کی طرح راہوں پر بھاگ رہے ہیں بادل نیلے آسمان کی رفاقت چھوڑ کر ادھر ادھر بھٹک رہے ہیں جیبوں میں ہاتھ ڈالے مرد تر و تازہ چہروں والی فیشن ایبل عورتیں سادہ لباس پہنے لڑکیاں......سر جھکائے تیز چلتے لڑکے میں وکٹوریہ سٹیشن کی سیڑھیاں چڑھتی اوپر آ رہی ہوں نیون سائن روشن ہیں وکٹوریہ سٹیشن کا ویٹنگ ہال لوگوں سے بھرا ہوا ہے وٹمپی کے میز پر میرا آج کے دن کا آخری کھانا رکھا ہوا ہے میں بڑی طمانیت بیٹھی ہمیشہ کی طرح لوگوں کے چہرے دیکھ اور پڑھ رہی ہوں لوگ جن کے اور میرے درمیان ایک ماہ کے باوجود تعلق کا کوئی رشتہ استوار نہیں ہو پایا یہاں رہنے والے ہزاروں پاکستانی اسی غیریت کی فضا کو اوڑھے جی رہے ہیں ہاں انہوں نے پونڈ کی رفاقت حاصل کر لی ہے اور آج کا دور مادیت کا دور ہے باقی سب جذباتی باتیں ہیں یہاں زندگی میں سرہی سر ہیں ٹیلی ویژن کے پروگرام ہیں میں واپس آتے ہوئے سیڑھیوں پر کھڑی وکٹوریہ سٹیشن کی عمارت پر

آخری نظر ڈالتی ہوں عمارت پرانی تہذیب اور کلچر کی عکاسی کرتی ہے وقت نے اس کو اور بھی محترم بنا ڈالا ہے۔

ملکہ وکٹوریہ ایک عہد ایک تہذیب اور ہم بھی تو ایک تہذیب کے امین ہیں اپنے آپ کو جڑوں سے وابستہ رکھنے سے ہی ایک عہد مرتب ہوتا ہے لیکن ہم اپنی تاریخ کو پس پشت ڈال چکے ہیں اور بوسیدہ اوراق توردی کے بھاؤ بھی نہیں بکتے آنے والی نسلیں ہمارے تاریخی کارنامے پڑھیں گی۔ لیکن آنے والا زمانہ نہ جانے کیسا ہوگا شاید اس وقت کسی کتاب کی ضرورت ہی نہ رہے۔ کیونکہ ہمارے ملک کے بچوں نے پڑھنا چھوڑ دیا ہے صرف گنتی باقی رہے گی نوٹوں کی گنتی۔

میں نیچے اتر آئی ہوں......میرے دل پر سوچوں کا بوجھ ہے میں موازنہ کر رہی ہوں......میرے آباؤ اجداد تیز گھوڑے سمندر میں تیز رفتار موجود کو چیرتے علم کے سمندروں کا ابال رعب اور دبدبہ کی زین ڈالے اقبال اور خوش بختی کی باگ ہاتھ میں تھامے علامہ اقبال نے تبھی تو کہا تھا کہ "محبت مجھے ان جوانوں سے ہے ستاروں پر جو ڈالتے ہیں کمند لیکن آج کی لغت میں ستاروں کے مطلب بدل چکے ہیں محبت کے نغمے گھر گھر گونجتے ہیں شاعر روٹی کا رونا روتا ہے ضروریات کی کمی کا مرثیہ لکھتا ہے اور اپنی لیاقت کا قصیدہ پڑھتا ہے۔

سیڑھیاں......مزید سیڑھیاں نیچے اترتی پاتال میں جاتیں۔ بھاگتی روحیں زندگی کے عذاب کو کندھوں پر اٹھائے طمانیت کا ماسک پہنے چہرے تیز ہوا کا جھونکا سیاہ سرنگیں سنسان پلیٹ فارم رہے نام اللہ کا......

رات ان گہری رہداریوں کے اوپر بلند عمارتوں اور روشن سڑکوں پر بادلوں کا لبادہ اوڑھے دبے قدموں سے محو پرواز ہے میں اور عاشی اجنبی کمرے کی دوسراتھ کے آخری گھنٹے

سوئے جاگتے گزار رہے ہیں ایسا نہ ہو ہم جاگ نہ پائیں یا ہیتھرو ائرپورٹ پر پہنچتے پہنچتے دیر ہو جائے۔

سامان کو ٹرالی پر رکھے زائد بوجھ کا کرایہ ادا کرتے ہوئے میں ہر چیز اور ہر چہرے کو الوداعی نظروں سے دیکھ رہی ہوں ہر چہرہ اپنے بچوں کے ساتھ بیٹھے ڈسپوزیبل گلاسوں میں کوک یا چائے پیتے ہوئے نہ جانے کیسے خواب دیکھ رہے ہیں بہت سے خواب جو پایۂ تکمیل تک پہنچ گئے ساڑھی کے اوپر ایپرن باندھے پاکستانی ہندوستان عورتیں ٹسٹمبن صاف کرتے ہوئے آج بھی پہلے دن کی طرح ہی مضمحل لگ رہی ہیں۔

میں نے ایک دن شیپرڈ بش کے بازار سے چند چیزیں خریدتے ہوئے سٹال پر کھڑی ہندوستانی عورت سے پوچھا تھا کہ کیا آپ صبح سے شام تک دکان پر ہی رہتی ہیں اس کے ہونٹوں پر بڑی غم زدہ مسکراہٹ تھی وہ ہولے سے مسکرا کر بولی (پیسہ کمانا آسان نہیں) اس کا چہرہ زندگی کے جبر اور ضروریات زندگی کے دباؤ سے تھکا ہوا تھا اس کی آنکھیں اکثر محنت کش ایشیائی عورتوں کی طرح اکیلی اور ویران تھیں۔

میں جانتی ہوں یہ ہندوستانی اور پاکستانی عورت کی زندگی میں اپنے مرد کی رفاقت کے نہ ہونے کی وجہ سے یہ اکیلا اور اداسی پیدا ہوتی ہے...... ایشیائی مرد ہمیشہ حاکم بنے رہنا چاہتا ہے فرائض کا بوجھ اٹھائے عورت اکیلے ہی اندھیروں اجالوں سے گزرتی رہتی ہیں اس کا شوہر جھولتے بالوں اور خوبصورت آنکھوں والی انگریز لڑکیوں سے دوستیاں کرتا ہے ان کی محبت کا دم بھرتا ہے گھر تو صرف رات کا ٹھکانہ ہے۔

زندگی کی تلخی کے گھونٹ پیتے ہوئے دونوں ہی زخمی ہوتے ہیں لیکن پھر بھی ہاتھ میں ہاتھ دیئے ایک ساتھ چل نہیں پاتے۔

ایک روز بس کا نوجوان ہندو ڈرائیور اپنی بس کو قدرے پیچھے موڑتے ہوئے اندر بیٹھی خواتین سے یوں مخاطب ہوا تھا ''مائی لو! دیکھنا کوئی گاڑی تو پیچھے نہیں۔'' ''نو......'' جواب دیتے ہوئے ساری عورتیں مسکرائی تھیں ایک جملہ اور لذت کا ایک لمحہ جس کا وہ مالک بنا تھا......اور یہ لذت اتنی قیمتی ہے کہ ساری عمر گزاری جا سکتی ہے......مائی لو......سارے خوبصورت جوان چہرے ......سادے چہرے......خشک موسم سے بے دھول زمین سے ٹیلی ویژن کے پروگراموں سے برستے بادلوں سے اور ساتھ بیٹھی سفید فام لڑکی سے بھی اور ''مائی لو'' کے لفظ سے بھی اپنی جیب میں پڑے پونڈز سے بھی اور پھر زندگی مکمل نہیں ہو پاتی۔ نسل فسادات کا ڈر نکالے جانے کا خوف بیکار ہونے کا ڈر......اور ہاتھ میں برش لیے ساڑھی پہنے ادھیڑ عمر عورت سر جھکائے فرش پونچھنے میں مصروف ہے۔ اور میں سامان کے درمیان سے راستہ بنائے اپنی ٹرالی کو گھسیٹتی جہاز کی طرف جانے والے راستے پر چل رہی ہوں۔

تو میرا سفر مکمل ہو چکا ہے سولہ نمبر کا گیٹ سامنے ہے جو کے ایل۔ ایم کے جہاز کو جانے والی راہداری میں کھلتا ہے۔

میں نے کیا پایا......کیا حاصل کیا اتنے دنوں احساسات کی ایک دنیا تھی جو میرے ساتھ ساتھ چلتی تھی۔ ہوائیں میرے لیے نئے قصبوں کی خوشبو کا پیغام لاتی تھیں شہر مجھے اپنی طرف کھینچتے تھے۔

اپنوں سے وقتی دوری بھی عذاب بن جاتی ہے جس کی سہار میرے لیے کبھی کبھار ناقابل برداشت بن جاتی تھی فون کارڈ پوسٹ کارڈ یادیں سو سوئے تفریح...... جہاز سیدھا بادلوں کو کاٹتا اوپر اٹھ گیا ہے وہی آکسیجن ماسک بیل کا استعمال ایمرجنسی گیٹ سب باتیں مجھے پہلے سے ہی معلوم ہیں زمین دور ہٹتی جا رہی ہے حالانکہ زمین اور انسان کا رشتہ بڑا گہرا ہے یہ

رشتہ منقطع نہیں ہونا چاہیے۔

ڈچ ائر ہوسٹیس ٹرالی کھینے کی خاطر داری میں جٹ گئی ہے میرے کھانے کے اوپر ''مسلم'' کا لفظ لکھا ہوا ہے ہاں میں اپنی روح تک مسلمان ہوں پاکستانی خاندان واپس وطن آ رہے ہیں۔

پاکستان کے کئی گھروں میں ان مسافروں کا انتظار ہو رہا ہو گا کتنے دلوں کی خوشیاں اور امیدیں ان سے وابستہ ہوں گی کتنی آنکھیں مسرت سے بھیگیں گی کتنے لوگ جلن کے مارے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش میں ہوں گے۔

ساعتیں سوتے جاگتے کھاتے پیتے میوزک سنتے ٹیلی ویژن کا بور پروگرام دیکھتے میرے پاس سے گذر کر غیر مرئی ہستی کی طرح آسمان کی وسعتوں میں گم ہو رہی ہیں۔

تہران کا ہوائی مستقر......آواز سنائی دیتی ہے میں ننھی سی کھڑکی سے سر نکالتی ہوں جہاز کا دراز پر اندھیرے میں ساکت کھڑا لگ رہا ہے نیچے ساحل کی روشنیاں بڑی مدہم نظر آ رہی ہیں۔

اور پھر روشنیوں کی دیپ مالا بڑی شاہراہوں کی زرد روشنیاں اور میں لرزاں سفید روشنیاں تہران کا شہر دور تک ستاروں کی چنری اوڑھے سویا ہوا ہے روشنیوں کی ترتیب بڑی دلکش ہے۔

آدھ گھنٹے کا وقفہ......لیکن ہمیں جہاز سے اترنے کی اجازت نہیں جہاز کی صفائی کیٹرنگ والا عملہ...... جہاز دو گھنٹے کی پرواز کے بعد کراچی کے ہوائی اڈے پر اترے گا......اور پھر میرا گھر......میری مسافرت ختم ہو جائے گی۔ رات اب مزید مجھے اکیلا اور تنہا نہ کر پائے گی......کراچی اور پھر لاہور......

صبح کا سورج لاہور کے گھروں اس کی سڑکوں اور باغوں پر طلوع ہو کر اپنا سفر طے کر رہا ہے......اور میرے دل میں طمانیت اور شکر گزاری کی ٹھنڈی لہر دوڑ رہی ہے...... جہاز کے پہیئے زمین کو چھو رہے ہیں......اور میں سر جھکا کر اس کا شکریہ ادا کرتی ہوں جو ساری زمینوں کا مالک ہے جس نے قبیلے اور خاندان بنائے تا کہ ہماری پہچان قائم رہے...... میرے بچے میرے منتظر کھڑے ہیں۔اور میری بیٹی سعدیہ اور مونا میرے ساتھ لگتے ہوئے کہہ رہی ہیں امی ہم آپ کے بغیر اداس ہو گئے تھے...... میرے دونوں بیٹے تمتماتے چہروں سے میرا استقبال کر رہے ہیں میں آتے ہی فیصل کو اس کی لائی ہوئی چیزوں کے بارے میں بتا دیتی ہوں تا کہ اسے انتظار کی زحمت نہ ہو...... ان کی محبت نے میری ساری تھکاوٹ دور کر دی ہے...... میرے شوہر گھر کی رکھوالی کے لیے گھر میں میرے منتظر ہیں۔وہ بھی آج دفتر نہیں گئے...... میں اپنا بیان یہاں پہنچ کر ختم کر دینا چاہتی تھی کہ اس سے آگے میری بالکل ہی ذاتی زندگی کا حصہ ہے۔لیکن ایک چھوٹا سا حادثہ اور اس کا خوشگوار انجام اور میرا کیا ہوا وعدہ......

میں نے اپنے کوٹ کی جیب میں وہ بٹوا رکھا ہوا تھا جس میں دو ہزار کے قریب پاکستانی روپیہ تھا اور میرے سونے کے بٹن اور ایک جوڑی بندے تھے...... چیزوں کو نکالتے ہوئے جب میں نے اس بٹوے کی تلاش کی تو وہ کہیں نہیں تھا...... وہ گم ہو چکا تھا کہاں گرا تھا...... کیا کہا جا سکتا تھا...... کم از کم دس بارہ ہزار کا نقصان ...... اس نقصان نے میری خوشی کو بدمزہ کر دیا تھا...... میں اپنے اس نقصان پر خاصی پژمردہ ہو گئی...... میرے شوہر نے کہا...... جانے دو جہاں اتنے روپے خرچ کر آئی ہو سمجھ لینا یہ روپے بھی خرچ ہو گئے میں خاموش رہی لیکن دل ہی دل میں اس نقصان پر افسوس زدہ تھی...... میں نے تو زندگی میں کبھی لا پرواہی نہیں کی...... پھر یہ کیوں ہوا...... میں اپنے اعمال کا جائزہ لیتی شاید کسی کا حق مارا ہو...... لیکن میرے گناہوں کی فہرست

میں یہ گناہ درج نہیں تھا...... افسوس قدرے کم ہو رہا تھا کہ چوتھے روز پی آئی اے کے دفتر کے ایک صاحب آئے اور اس بٹوے کے ملنے کی نوید سنائی وہ جہاز کی سیٹ پر جیب سے گر پڑا تھا...... اور مجھے اس کے ساتھ جا کر اسے کارگو آفس سے لانا تھا...... میں فوراً ہی ایئر پورٹ گئی۔ ائر پورٹ کے ایک افسر کو شکایت تھی کہ پی آئی اے کی بدنامی تو خوب ہوتی ہے لیکن اگر اچھا کام کیا جائےتو اس کو کوئی نہیں سراہتا۔ میں نے کہا صاحب میں اس کو ضرور سراہوں گی...... کیونکہ اس واقعہ سے میں نے خدا کو اپنے بہت ہی نزدیک پایا ہے۔ میرے اور اس کے تعلقات کی نئے سرے سے جدید وجہ ہے۔ اور مجھے انسانوں کی نیک فطرتی کا یقین ہو گیا ہے...... اور پھر خدا نیکیوں کو ضائع نہیں کرتا اصل اجر تو وہ دینے والا ہے۔

میں نے دستخط کر کے بٹوا لیا۔ اور میری کھوئی خوشی دوبارہ خدا کی شکر گزاریوں کے ہجوم میں شامل ہو گئی......

میں جانتی ہوں میں نے بہت سی باتیں اپنی ہی سوچ کے ترازو میں تولتے ہوئے کہی ہیں اس سے لوگوں کو اختلاف بھی ہو سکتا ہے ان کے تجربات مجھ سے مختلف ہو سکتے ہیں...... ان تمام احساسات میں میر مشاہدہ شامل ہے میری ذات کی کوئی کمی اس کی ذمہ دار نہیں میرا کوئی احساس کمتری یا برتری اس میں شامل نہیں میں نے وہاں کی چیزوں اور انسانوں کو تنقیدی نظر سے دیکھا اور جو تصویر بنی میں نے سچائی اور ایمانداری سے پیش کر دی...... ہاں میں نے خامیوں کے ذکر کو پھیلا دیا اور خوبیوں کے بیان کو قدرے سائے میں رکھا...... خوبیاں انگریز قوم کی اپنی ہیں جس کا کریڈٹ ہمارے کسی پاکستانی کو نہیں جاتا۔ وہاں کی دنیا محنت کی دنیا ہے انہیں اہم عہدوں کے لیے دوسری قوم کے لوگوں کی ضرورت نہیں وہ تو قوموں کے حاکم ہیں اور وہ کوئی بھی اہم یا بڑا عہدہ دوسری قوموں کے لوگوں کو نہیں دیتے ہاں انہیں مزدور چاہییں...... انتھک محنت

کرنے والے اور ہماری قوم وہاں مزدوری کرتی ہے صرف پڑھانے والے لوگ یا ذاتی تجارت کرنے والے پاکستانی زیادہ خوشحال اور اپنے مالک آپ ہیں اس خوابوں کے جزیرے میں خواب پورے نہیں ہوتے ہاں شکست خواب کی آواز کثر سنائی دیتی ہے۔

سچ کی بھرپور تصور کوئی نہیں کھینچتا۔میں نے ایک تصویر بنائی ہے ہو سکتا ہے بہت سے پڑھنے والوں کو اس میں دروغ گوئی اور مغالطہ نظر آئے۔میری سمجھ اور سوچ کا بھی قصور ہو سکتا ہے لیکن ہر انسان اپنی عقل کے بھروسے ہی تو چیزوں انسانوں نظریات اور اعتقادات کا مطالعہ کرتا ہے میں نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔

تاریخ اور جغرافیہ کا بیان میرا مقصد نہیں اور سفرنامہ کے لیے میں ان علوم کو ضروری نہیں سمجھتی میرا سفرنامہ تو صرف میرے احساسات کو منعکس کرتا ہے۔ایک سیاح کے ذاتی احساسات۔(قاری کا ان کے ساتھ متفق ہونا ضروری نہیں)۔

